جگن ناتھ آزاد

فکر و فن

جگن ناتھ آزاد
فکر و فن

محمد منظور عالم

محروم میموریل لٹریری سوسائٹی، نئی دہلی

© محروم میموریل لٹریری سوسائٹی، نئی دہلی

سنہ اشاعت : ________ ۱۹۹۹ء

قیمت : ________ ۲۰۰ر(دو سو) روپے

بہ اہتمام : ________ اختر زماں

طباعت : ________ ثمر آفسٹ پرنٹرز، نئی دہلی

ملنے کا پتا

انجمن ترقّی اُردو (ہند)، اُردو گھر، راؤز ایوینیو، نئی دہلی

اپنے مرحوم والدین کے نام ....

فہرست

پیش لفظ

جگن ناتھ آزاد اردو کے ممتاز شاعر، نقّاد، ماہرِ اقبالیات اور اچھے ادیب ہیں۔ وہ ایک نیک، ملنسار انسان ہیں۔ راقم الحروف کو کئی مرتبہ ان سے ملنے کا اتّفاق ہوا۔ طالب علمی کے زمانے ہی سے مجھے ان کا کلام پڑھنے کا شرف حاصل تھا۔ ایم۔ اے کے دوران جب اقبالیات سے دل چسپی ہوئی تو ان کی اہم تصنیف "اقبال اور مغربی مفکّرین" پڑھنے کا اتّفاق ہوا۔ اقبالیات کے ضمن میں ان کی یہ ایک اہم تصنیف ہے جس کی وجہ سے آزاد سے میری دل چسپی اور بڑھ گئی۔

میری اس دل چسپی کو دیکھتے ہوئے میری مشفق و مہربان استاد محترمہ پروفیسر سیّدہ جعفر صاحبہ نے مجھے "جگن ناتھ آزاد۔ فکروفن" پر ریسرچ کرنے کے لیے کہا، جسے میں نے بہ خوشی قبول کر لیا۔ طالب علمی کے زمانے میں جس طرح راقم الحروف نے ان سے بہت کچھ سیکھا، ریسرچ کے دوران بھی ان سے ایک ایک لفظ سیکھنے کا اتّفاق ہوا۔ اُنھی کی نگرانی میں میرا مقالہ پایۂ تکمیل کو پہنچا ہے۔ مجھے اس بات پر بے حد فخر ہے کہ راقم الحروف کو ایسی قابل، لائق اور طالب علموں کی ہمدرد و غمگسار نگراں کے تحت کام کرنے کا شرف حاصل ہوا۔ انھوں نے قدم قدم پر میری رہنمائی کی۔ جس طرح ان کے پڑھانے کا ایک خاص انداز ہے، بالکل اسی طرح وہ اپنے طالب علموں کو ایک منفرد انداز میں تربیت دیتی ہیں۔ جہاں وہ جملے کی ساخت اور زبان پر دھیان دیتی ہیں وہاں ان کی نظر طالب علم کے تلفّظ اور پڑھنے کے انداز پر بھی ہوتی ہے۔ اس طرح میں نے اس مقالے کی تکمیل

میں ان سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ محترمہ پروفیسر سیّدہ جعفر صاحبہ نے ہر لمحہ، ہر گھڑی میری مدد کی۔ آزاد کی بیشتر کتابیں میں نے اُنھی سے حاصل کیں اور استفادہ کیا۔ میں سب سے پہلے ان کا بے حد ممنون و مشکور ہوں۔

موجودہ صدر شعبۂ اردو ڈاکٹر انور الدین صاحب کا بھی میں بہت ممنون ہوں کہ طالب علمی کے زمانے میں بھی اور اب بھی میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ وہ اپنے شاگردوں کی مدد کر کے خوش ہوتے ہیں۔ پی۔ ایچ۔ ڈی کے مقالے کی تکمیل کا بار بار اصرار کرتے رہے اور کئی بار اپنے مفید مشوروں سے بھی نوازا۔ ڈاکٹر رحمت یوسف زئی نے بھی میرے مقالے کی تکمیل میں مدد کی۔ ان کی مملوکہ کئی کتابوں سے میں نے استفادہ کیا۔ ڈاکٹر میر محبوب حسین کے مدد کرنے کا انداز بھی منفرد ہے۔ ان کے بار بار کا اصرار اور وقتِ ضرورت مشوروں سے نوازنا یقیناً میرے لیے باعثِ مسرت بھی ہے اور باعثِ فخر بھی۔ میں ان کا بھی بہت ممنون ہوں۔ ڈاکٹر حبیب نثار نے بھی میرے اس مقالے کی تکمیل میں میری مدد کی۔ کئی موقعوں پر مشورے دیے، میں ان کا بھی تہِ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔

میری والدہ محترمہ (مرحومہ) مجھے اس وقت بے اختیار یاد آرہی ہیں۔ یہ اُنھی کی شفقت و تربیت کا نتیجہ ہے کہ میں نے اپنی تعلیم کے زینے کامیابی کے ساتھ طے کیے اور آج اس قابل بن سکا ہوں کہ پی۔ ایچ۔ ڈی کا مقالہ یونیورسٹی آف حیدرآباد میں ڈگری کے لیے داخل کر سکوں۔ اللہ ربُّ العزت سے دعا ہے کہ وہ میرے والدین کی مغفرت کرے۔

میری شریکِ حیات نے بھی پی۔ ایچ۔ ڈی کے تحقیقی کام کے دوران میری حوصلہ افزائی کی، میرے گھر کے ماحول کو پُرسکون بنایا اور ہمیشہ اس بات کی کوشش کی کہ میرا مقالہ جلد از جلد تکمیل کی منزل کو پہنچ جائے۔ میں اپنی شریکِ حیات کا بھی بے حد ممنون ہوں۔ میرے بہت سارے دوست احباب ہیں جن کی خواہش رہی کہ میں جلد سے جلد اپنا کام مکمل کر لوں۔ وہ میرے کام میں مدد کے لیے بھی ہمیشہ تیار رہے۔ بہر حال میں ان سب کا شکر گزار ہوں۔

پروفیسر جگن ناتھ آزاد اور ڈاکٹر خلیق انجم کا بھی ممنون ہوں کہ جب بھی راقم الحروف کو کسی مسوّدے یا کتاب کی ضرورت محسوس ہوئی تو انھوں نے میری مدد کی۔

راقم الحروف نے ریسرچ کے دوران اس بات کو شدّت کے ساتھ محسوس کیا کہ جگن ناتھ آزاد کی شخصیت اور ادبی خدمات پر کئی کتابیں منظرِ عام پر آچکی ہیں مگر ان میں تشنگی ہے۔ پہلی بات یہ ہے کہ زیادہ تر کتابیں مرتّب کردہ ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ ان کتابوں میں آزاد کی شخصیت اور فن کے مختلف گوشے اب بھی تشنہ ہیں پھر بھی میں نے ان کتابوں سے استفادہ کیا ہے جن کا اظہار جگہ جگہ کیا گیا ہے۔ میں نے آزاد کی تمام کتابوں سے استفادہ کیا ہے۔ ان کے خطوط، انٹرویوز اور غیر مطبوعہ مسوّدے وغیرہ سے بھی استفادہ کرتا رہا ہوں۔

آزاد خود نوشت سوانح لکھ رہے ہیں۔ میں نے اس سے بھی استفادہ کیا ہے یہ خود نوشت سوانح ابھی نامکمل ہے۔ آزاد کی زندگی کے مختلف پہلو بکھرے پڑے ہیں۔ میں نے ان تمام چیدہ چیدہ حالات کو یکجا کیا ہے اس کی جانچ پڑتال کے بعد اپنے مقالے میں جگہ دی ہے۔

آزاد کثرت سے لکھ رہے ہیں اس لیے ان کے تمام فکر و فن کا احاطہ بہت ہی مشکل کام ہے۔ میں نے انھیں مختلف ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ ان کے کارناموں کا تنقیدی جائزہ لیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ جگن ناتھ آزاد پر اس طرح کا تحقیقی و تنقیدی کام کہیں بھی نہیں ہوا ہے۔ آزاد کی زندگی، شخصیت اور فکر و فن پر یہ انتہائی اہم اور مفید مقالہ ثابت ہوگا۔

آخر میں ایک بار پھر اپنی نگراں، تمام اساتذہ، ارکانِ خاندان اور دوست احباب کا شکریہ ادا کرتا ہوں، جن کی دعائیں اور نیک تمنّائیں میرے ساتھ ہیں۔

محمد منظور عالم
سنٹرل یونیورسٹی، حیدرآباد

پہلا باب

(حالاتِ زندگی)

۵ر دسمبر ۱۹۱۸ء کی صبح کو جگن ناتھ آزاد شہر عیسیٰ خیل میں پیدا ہوئے[1] مغربی پنجاب میں دریائے سندھ کے اس پار میانوالی ڈسٹرکٹ کا یہ ایک چھوٹا سا قصبہ یا شہر ہے۔ آج کل یہ علاقہ پاکستان میں واقع ہے۔ اس زمانے میں یہ مقام تحصیل کا صدر تھا۔ آزاد اپنی جائے پیدائش سے بے پناہ محبت کرتے ہیں۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

"یوروپ کے اکثر ممالک اور بڑے بڑے شہر دیکھنے کے بعد مجھے اگر کسی جگہ کے دیکھنے کی حسرت اس وقت دل میں ہے تو وہ یہی چھوٹا سا شہر ہے عیسیٰ خیل۔"[2]

پانچ سال کی عمر میں آزاد کو اپنا وطن مالوف چھوڑنا پڑا تھا۔ کیوں کہ ان کے والد تلوک چند محروم کا تبادلہ کلورکوٹ ہائی اسکول کو ہو گیا تھا۔ پاکستان بننے کے بعد آزاد ہمیشہ اپنے وطنِ عزیز کو دیکھنے کی آرزو کرتے رہے بالآخر ۱۹۸۰ء میں آپ کی یہ آرزو بھی پوری ہوئی۔

---

[1] راقم الحروف نے ایک خط کے ذریعے سے آزاد کی تاریخِ پیدائش کے متعلق توثیق چاہی تو آپ نے اس کے جواب میں تحریر فرمایا "حقیقی اعتبار سے بھی اور سرٹیفکٹ کے اعتبار سے بھی میری تاریخِ پیدائش ۵ر دسمبر ۱۹۱۸ء ہی ہے والدین نے اور دوسرے بزرگوں نے یہی بتایا ہے۔" (مکتوب بنام راقم الحروف، مورخہ ۵ر مئی ۱۹۹۳ء، جموں)۔

[2] جگن ناتھ آزاد۔ بسلسلہ روز و شب غیر مطبوعہ، ص ۱۔

جگن ناتھ آزاد کے والد تلوک چند محروم اردو کے ممتاز، مقبول و معروف شاعر ہیں۔ وہ یکم جولائی ۱۸۸۷ء کو موضع نور زماں شاہ میں پیدا ہوئے۔ یہ بہت ہی چھوٹا سا گاؤں تھا۔ دریائے سندھ کے سامنے بیس، پچیس گھروں کا یہ ایک چھوٹا سا گاؤں تھا آج کل یہ گاؤں پاکستان کے علاقے میں ہے۔ سیلاب کی وجہ سے یہ گاؤں بار بار اجڑتا اور تباہ ہوتا تھا۔ پانچ سال کی عمر میں محروم عیسیٰ خیل آئے اور یہیں آباد ہو گئے۔

محروم بچپن ہی سے بہت ذہین تھے۔ عیسیٰ خیل کے ورنیکلر فائنل مڈل اسکول عیسیٰ خیل سے پرائمری سطح تک کی تعلیم حاصل کی ہر درجے میں اوّل رہے۔ پانچویں اور آٹھویں درجے کے امتحانوں میں سرکاری وظیفہ حاصل کیا۔ عیسیٰ خیل سے ساٹھ ستّر میل دور ایک مقام "بنّوں" ہے۔ بنّوں کے وکٹوریہ ڈائمنڈ جوبلی اسکول سے محروم نے ۱۹۰۰ء میں میٹریکولیشن کا امتحان درجۂ اوّل میں پاس کیا۔

تلوک چند محروم کا مزاج شاعرانہ تھا۔ اس لیے بچپن ہی سے وہ شاعری کرتے تھے۔ مگر باقاعدہ شاعری کی ابتدا انھوں نے "بنّوں" سے کی۔ طالب علمی کے زمانے میں ہی انھوں نے غالبؔ اور ذوقؔ کو پڑھا۔ وہ کسی کی شاگردی میں نہیں رہے اور نہ ہی کسی سے اصلاح لی۔

محروم علامہ اقبالؔ کے مدّاح تھے۔ علّامہ اقبالؔ نے بھی محروم کی شاعری کو پسند کیا۔ محروم بہت ہی ملنسار آدمی تھے۔ وہ ایک صاف ذہن اور سیکولر انسان تھے۔ انھوں نے ملک اور قوم کے درد بھرے گیت گائے ہیں۔

تلوک چند محروم کی پہلی بیوی (ودّیا کی والدہ) کا انتقال جوانی میں ہو گیا۔ ۱۹۱۶ء میں انھوں نے دوسری شادی کی۔ جگن ناتھ آزاد محروم کی دوسری بیوی سے پہلی اولاد ہیں۔ ودّیا پہلی بیوی کی اکلوتی اولاد تھی۔ آزاد کو اپنی بڑی بہن سے بہت محبّت تھی، جس کا ذکر انھوں نے "حیاتِ محروم" میں بڑے درد بھرے لہجے میں کیا ہے۔ ۱۹۲۹ء میں ودّیا کی شادی ہوئی۔ بائیس برس کی عمر میں چار بچوں کی ماں بن گئی۔ گھر کا ماحول اسے راس نہ آیا اور وہ خود کشی کر کے اس دنیا سے رخصت ہو گئی۔[1]

---

[1] تفصیلی ذکر سوانح عمری کے ضمن میں کیا گیا ہے۔

آزاد و دّیا کے سوا باقی تمام بہنوں میں سب سے بڑے ہیں۔ ان کی ایک چھوٹی بہن شکنتلا دو برس کی عمر میں ہی دس بارہ دن بیمار رہ کر اس دارِ فانی سے کوچ کر گئے۔ دوسری بہنوں کے نام ساوتری اور کرشنا ہے[1]

جگن ناتھ آزاد کی ابتدائی تعلیم گھر سے شروع ہوئی۔ تلوک چند محروم نے انھیں حروف شناسی سے لے کر شاعری تک مکمل رہنمائی کی۔ آزاد لکھتے ہیں:

"مجھے یاد ہے کہ انھوں نے (محروم) گتّے کے متعدد ٹکڑوں پر ا۔ ب" لکھ کر مجھے دیے اور انھیں کی مدد سے "ابجد" سے آشنا کیا"[2]

آزاد نے گورنمنٹ مڈل اسکول عیسیٰ خیل سے تیسرے درجے کا امتحان پاس کیا۔ اس کے بعد تلوک چند محروم کا تبادلہ کلورکوٹ کے ہائی اسکول میں ہو گیا۔ آزاد نے یہاں سے آٹھویں درجے کا امتحان پاس کیا۔ نویں اور دسویں کلاس کا امتحان راجہ رام موہن رائے ہندو اسکول سے پاس کیا۔ اسکول میں چوتھے درجے تک اردو میڈیم تھا۔ پانچویں درجے سے انگریزی بھی شروع کر دی گئی تھی۔ چھٹی یا ساتویں سے فارسی پڑھنا شروع کیا۔ آٹھویں درجے میں آزاد نے دو امتحانات دیے۔ لکھتے ہیں:

"جب میں نے کلورکوٹ سے آٹھویں درجے کا امتحان پاس کیا۔ اس وقت اس درجے کے لیے دو امتحان ہوتے تھے۔ طالبِ علم کے لیے صرف ایک امتحان پاس کرنا ضروری ہوتا تھا۔ لیکن میں نے دونوں امتحان دیے اور دونوں میں پاس ہوا۔"[3]

۱۹۳۳ء میں راولپنڈی ڈی۔ اے۔ وی کالج میں داخل ہوئے۔ ۱۹۳۵ء میں ایف۔ اے کا امتحان پاس کیا۔ گارڈن کالج راولپنڈی سے بی۔ اے کا امتحان دیا۔ بی۔ اے میں اردو امتیازی مضمون تھا۔ آپ کو زیادہ دل چسپی انگریزی، فارسی اور تاریخ سے رہی۔

۱۔ نسب نامہ آئندہ صفحے میں پیش کیا گیا ہے۔
۲۔ جگن ناتھ آزاد۔ میرے گزشتہ روز و شب، ص ۱۰۔
۳۔ مکتوب جگن ناتھ آزاد مورخہ ۵ مئی ۱۹۹۳ء۔ جموں۔

سنہ ۱۹۴۲ء میں پرشین میں آپ نے آنرز کی ڈگری دار العلوم السنۂ شرقیہ لاہور (پاکستان) سے حاصل کی۔ پنجاب یونیورسٹی لاہور سے آزاد نے فارسی میں سنہ ۱۹۴۴ء میں ایم۔ اے کیا۔ اسی کے ساتھ انھیں ایم۔ او۔ ایل کی ڈگری بھی حاصل ہوئی۔

جگن ناتھ آزاد کو شاعری ورثے میں ملی تھی۔ ابتدا ہی سے ان کی طبیعت شعرگوئی کی طرف مائل تھی۔ قدم قدم پہ والد کی رہنمائی۔ پھر ماحول اور فضا بھی شاعرانہ۔ گھر کا ماحول ادبی تھا۔ محروم کے دوست احباب سبھی شعروادب سے دل چسپی رکھنے والے تھے۔ آزاد نے ان سب سے استفادہ کیا۔ یہی وجہ ہے کہ پانچ سال کی عمر سے ہی مصرعے موزوں کرنے لگے تھے۔ اپنی ابتدائی شاعری کے بارے میں لکھتے ہیں :

> "پانچ برس کا تھا کہ والد کا تبادلہ عیسیٰ خیل سے کلور کوٹ کے اسکول میں ہو گیا۔ عیسیٰ خیل سے کلور کوٹ جانے کے لیے کالا باغ کے مقام پر دریائے سندھ کو عبور کرنا پڑتا تھا۔ کالا باغ ایک بڑا ہی پُر فضا مقام ہے۔ دریا کے کنارے آباد ہے۔ نمک کے پہاڑوں کا سلسلہ دور تک چلا گیا ہے۔ ان پہاڑوں پر خوب صورت مکان بنے ہوئے ہیں۔ اس وقت تک ابھی یہاں دریا پر پُل نہیں بنا تھا۔ چھوٹی بڑی کشتیاں یا اسٹیمر ہی آمد و رفت کے ذرائع تھے۔ ہمارا اسٹیمر روانہ ہوا ہی تھا کہ پہاڑوں پر بنے ہوئے مکان دیکھ کر والد نے ایک مصرعہ پڑھا تھا ؏ :
>
> پہاڑوں کے اوپر بنے ہیں مکان
>
> اور مجھ کو دوسرا مصرع لگانے کو کہا، میں نے فوراً کہا ؏
>
> "عجب ان کی صورت عجب ان کی شان"
>
> والد نے کہا "صورت" نہیں "شوکت" کہو"![1]

---

[1] جگن ناتھ آزاد۔ میرے گذشتہ روز و شب، ص ۱۱۔

تلوک چند محروم نے اپنے بیٹے کی تربیت میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ انھوں نے آزاد کو نہ صرف اردو شاعری سے روشناس کیا بلکہ شاعری کی دنیا میں خود چل کر قدم رکھنا سکھایا۔ بچپن میں ہی آزاد کو اردو اور انگریزی کی متعدّد نظمیں یاد تھیں۔ رات کو سوتے کے اوقات میں بھی محروم اپنے ہونہار بیٹے کو مصرع دیا کرتے تھے تاکہ وہ مصرع لگائیں۔ آزاد ایک جگہ لکھتے ہیں۔

" والد کبھی کبھار رات کو سونے سے قبل مجھے کوئی مصرع دے دیا کرتے تھے اور کہتے تھے کہ اس پر مصرع لگاؤ، مثلاً

"اے سنسار بنانے والے" یا " آگئی ٹھنڈی ہوا برسات کی"

اس وقت کے کہے ہوئے مصرعے تو مجھے یاد نہیں دو ایک حافظے میں رہ گئے ہیں مثلاً رات کے دس بجے کے قریب ایک ریل گاڑی کلور کوٹ سے بھکّر نامی ایک شہر کو جایا کرتی تھی۔ اس کی سیٹی کی آواز رات کے سنّاٹے میں دور دور تک گونجتی تھی۔ ایک رات کا ذکر ہے کہ ریل نے سیٹی دی تو ایک مدرّس نے کہا ؏

بھکّر کو جانے والی اس وقت جا رہی ہے

میں نے اس پر مصرع لگایا "سیٹی بجا بجا کر ہم کو بُلا رہی ہے"

والد نے یہ سنا تو اس سے مخاطب ہو کے بولے ایسے بھُس مصرعوں سے آشنا نہ کیجیے۔ مصرع آسان دیجیے لیکن مصرع ہو بھوسا نہ ہو۔ یہ تو مصرعے کو مثالی سمجھ کر مصرع لگائے گا۔ اسے ابھی اچھے یا بُرے شعر کی یا مضمونِ شعر کی پہچان کہاں ہے۔ مثلاً میں نے اسے مصرع دیا ہے ؏ "آگئی ٹھنڈی ہوا برسات کی" تو اس نے کہا "چھا گئی کالی گھٹا برسات کی"۔ اور آپ نے سپاٹ مصرع دے دیا تو ویسا ہی سپاٹ ردِ عمل اس پر ہوا۔ یہ بچّہ ہے اس کی جیسی ذہنی تربیت ہوگی یہ ویسا ہی بنے گا اسے میں شعر کہنا نہیں سکھانا چاہتا بلکہ شعر کی

فضا سے آشنا کرنا چاہتا ہوں۔ اس وقت میری عمر کوئی چھ سات برس کی تھی"۔[۱]

آزاد ابھی آٹھ[8] برس ہی کے تھے کہ انھیں بڑی بڑی نظمیں زبانی یاد ہو گئیں۔ اس عمر میں انھوں نے چودھری خوشی محمد ناظر کی نظم "جوگی" مکمل یاد کی تھی۔ نو[9] برس کی عمر سے ہی آزاد اپنے والد کے ساتھ پہلی مرتبہ "بھیرے" کے مشاعرے میں شریک ہوئے۔ راستے میں حفیظ جالندھری سے ملاقات ہوئی۔ آزاد لکھتے ہیں کہ اس مشاعرے کی نظمیں میری سمجھ میں نہ آئیں۔ جب حفیظ جالندھری سے اس بات کا ذکر کیا تو انھوں نے اپنی ایک نظم "سروپ نکھا کی لچھمن سے ملاقات" سنائی۔[۲]

آزاد کو اس نظم کے سمجھنے میں دشواری پیش نہیں آئی۔ یہ نظم "ہندوستاں ہمارا" مجموعۂ کلام میں شامل ہے۔ آزاد حفیظ جالندھری کے کلام سے بہت متأثر تھے۔ ان کا پورا مجموعۂ کلام "ہندوستاں ہمارا" زبانی یاد تھا۔ چنانچہ آٹھویں جماعت کی تاریخ کے پرچے کا ہر سوال کا جواب انھوں نے "ہندوستاں ہمارا" کی نظموں سے دیا۔

بارہ برس کی عمر ہی سے آزاد نے باقاعدہ شاعری شروع کی۔ ان کی پہلی نظم "گلدستہ" ماہنامہ "گلدستہ" کے لیے لکھی گئی تھی اور وہ اسی ماہنامے میں شائع ہوئی۔ نظم کے چند اشعار یہاں نقل کیے جاتے ہیں:

کیا پیارا گلدستہ ہے   چھوٹا سا ہے عمدہ سا ہے
اس کی نظمیں اور لطیفے   بچوں کے ہیں دل بہلائے
اس کی لکھائی اور چھپائی   آنکھ کو بھائی، دل میں سمائی

اس کے بعد آزاد کی ایک اور نظم "بچوں کی دنیا" میں شائع ہوئی جس کا عنوان تھا "بندر کی خودکشی"۔ ان کی سب سے پہلی غزل ماہنامہ "ادبی دنیا" میں شائع ہوئی۔ اپنی پہلی غزل کی اشاعت کے متعلق لکھتے ہیں:

۱۔ جگن ناتھ آزاد ـــ بہ سلسلہ روز و شب غیر مطبوعہ، ص ۴۔
۲۔ جگن ناتھ آزاد ـــ میرے گذشتہ روز و شب، ص ۱۶۔

"اس سے قبل میرا کلام کبھی کسی ادبی رسالے میں شائع نہیں ہوا تھا۔ اس خیال سے کہ معلوم نہیں کہ میری غزلیں ان ماہناموں میں شائع ہوتی بھی ہیں یا نہیں۔ میں نے اپنے اس "جرأت آمیز" اقدام کا ذکر کسی دوست سے نہیں کیا۔ دوسرے ماہ مجھے لاہور آنے کا اتفاق ہوا۔ انارکلی کے چوک سے ایک آدھ دن بعد گزرا تو ایک بک اسٹال پر "ادبی دنیا" کا نیا شمارہ نظر آیا، میں نے اس خیال سے کہ ممکن ہے میری غزل کو اس میں جگہ مل گئی ہو، اس کی ورق گردانی شروع کی۔ دیکھتا ہوں کہ میری غزل اس میں بڑے نمایاں طور پر شائع ہوئی ہے۔" [1]

راولپنڈی (ڈی۔ اے۔ وی کالج) ہی سے آزاد کی شاعری کا باقاعدہ آغاز ہوا۔ یہیں سے آزاد کو اپنی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کا موقع ملا۔ یہیں راولپنڈی میں ان کی عبدالحمید عدم سے ملاقات ہوئی۔ عدم کے مرحوم سے خاصے دوستانہ تعلقات تھے۔ آزاد کو کالج میں کالج میگزین کا اڈیٹر مقرر کیا گیا تھا۔ آزاد نے عدم سے نہ صرف شعر و سخن کی اصلاح لی بلکہ میگزین کے لیے بھی ان سے ان کی حمایت حاصل کی۔ عدم نے میگزین کی ادارت کے لیے آزاد کے راستے کو ہموار کر دیا جس سے ان کی صلاحیت، ہمت و حوصلہ میں استحکام پیدا ہوا۔

آزاد نے بچپن سے ہی اردو ادب کا ماحول پایا بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ ان کا اوڑھنا، بچھونا شعر و ادب ہی تھا تو بے جا نہ ہوگا۔ آزاد کی شخصیت کی تعمیر میں ان کے والد تلوک چند محروم، حفیظ جالندھری اور عبدالحمید عدم کے علاوہ اور بہت سی عظیم شخصیتیں ہیں جن سے وہ نہ صرف متاثر ہوئے بلکہ ان سے بہت کچھ سیکھا اور قدم قدم پر رہنمائی حاصل کی۔ ان سب کا ذکر آگے چل کر کریں گے۔

---

[1] جگن ناتھ آزاد۔ آنکھیں ترستیاں ہیں، ص ۲۶۔

اقبال شناسی سے متعلق آزاد کہتے ہیں :

"میں ابھی بچّہ ہی تھا یا لڑکا سمجھ لیں تیسرے چوتھے درجے میں پڑھتا تھا۔ میرے والدِ محترم ایک شعر اکثر گنگنایا کرتے تھے اور وہ شعر تھا :

اڑالی قمریوں نے، طوطیوں نے، عندلیبوں نے

چمن والوں نے مل کر لوٹ لی طرزِ فغاں میری

اگرچہ اس وقت تک میں قمری، طوطی، عندلیب اور طرزِ فغاں کے معانی تک سے نا واقف تھا لیکن یہ شعر مجھے HAUNT کرتا تھا اور اب بھی HAUNT کرتا ہے۔ یہ اقبال سے میرا پہلا تعارف تھا۔ مجھے اس وقت یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ یہ شعر کس کا ہے اور اقبال نام کا کوئی شاعر ہے بھی یا نہیں۔

دو تین برس کے بعد جب درسی کتب کے علاوہ دوسری کتب پڑھنے کا شوق ہوا تو والد محترم کی کتابوں والی الماری میں سے ہی کوئی نہ کوئی کتاب لے لیا کرتا تھا۔ افسانوں کی کتابیں تو وہاں تھیں نہیں اس الماری میں زیادہ تر کتابیں شعر و شاعری کی تھیں۔ اگر کتابیں نکالیں دو، ایک صفحے پڑھے۔ جی نہ لگا کتاب واپس رکھ دی آخر ایک خانے میں پتلی پتلی چند کتابیں یا کتابچے نظر آئے ان کا نام تو خاصے مشکل تھے لیکن میں نے ان کی ورق گردانی شروع کی نظمیں بھی خاصی مشکل تھیں شاعر کے نام سے اس زمانے میں مجھے دلچسپی نہیں ہوتی تھی اس لیے یہ کتابچے پڑھتے وقت مصنف کے نام پر بھی نظر نہیں ڈالی۔ ایک ایک کتابچے میں ایک ایک نظم تھی۔ جب پڑھنا شروع کیا تو مطلب سمجھے بغیر ہی دل ایک انجانی لذت سے آشنا ہونے لگا۔ ان کتابوں کے نام تھے شکوہ جوابِ شکوہ، تصویر درد، بلال، نالۂ یتیم، اکبری اقبال، فریادِ امت وغیرہ۔ ان نظموں کو

پڑھ کے اسی لذت کا احساس ہوا جو والد صاحب کی زبانی "اڑ الی قمریوں نے، طوطیوں نے، عندلیبوں نے" والا شعر سن کے ہوتی تھی۔ یہ نظمیں میں نے اتنی بار پڑھیں کہ بڑی حد تک زبانی یاد ہو گئیں، تلفظ کی غلطی جہاں میں کرتا تھا اس کی اصلاح والدِ محترم کر دیتے تھے۔" [1]

آزادؔ نے اقبالؔ کے کلام کو اس طرح پڑھا کہ سارا کلام زبانی یاد ہو گیا۔ اور وہ "حافظ اقبال" کے نام سے مشہور ہو گئے۔ اسی انٹرویو میں آگے چل کر کہتے ہیں:

"مختصر یہ کہ ایم۔ اے فارسی کا امتحان دینے تک ایک "جاوید نامہ" کو چھوڑ کر اقبالؔ کا سارا کلام اس طرح زبانی یاد ہو گیا کہ لاہور میں لوگ مجھے "حافظ کلامِ اقبالؔ" کہنے لگے۔ یہ لقب مجھے میرے استاد محترم شمس العلماء مولانا تاجور نجیب آبادی نے دیا تھا۔ آج بھی پاکستان میں میرے عمر کے بعض لوگ مجھے اسی نام سے یاد کرتے ہیں۔ چلتے چلتے یہ بھی بتا دوں کہ ۱۹۸۰ء میں جب اسلام آباد میں صدر پاکستان جنرل ضیاء الحق مرحوم سے قصرِ صدر میں میری ملاقات ہوئی تو انھوں نے "تشریف لائیے حافظ اقبالؔ" کہہ کر اس خاکسار کا استقبال کیا تھا۔" [2]

آبا و اجداد

جگن ناتھ آزادؔ کے جدِ امجد مہاراجہ رنجیت سنگھ کے ملازم تھے۔ جب مہاراجہ رنجیت سنگھ نے پشاور تک کا علاقہ فتح کر کے اپنے قلم رو میں شامل کر لیا۔ آزادؔ کے جدِ امجد پچاس ہزار کے مالک ہونے کی وجہ سے "اَدھ لکھا" کہلائے۔ ویسے ہندوؤں کی ذات میں

---

[1] پروفیسر جگن ناتھ آزاد سے انٹرویو (مرتب) ایم۔ حبیب خاں۔ کتاب نما کا خصوصی شمارہ اپریل ۱۹۹۴ء ص ۲۹
[2] " " " " " ص ۳۰۔

اروڑہ ایک خاندان یا قبیلہ کہلاتا ہے، آزاد اسی برادری سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے پردادا کا نام ٹیک چند تھا۔ جن کا زمانہ تقریباً ۱۸۳۱ء۔۱۸۸۱ء کا ہے۔ ان کے دو بیٹے دیال داس اور رام دیال تھے۔ رام دیال آزاد کے دادا کا نام ہے۔ ان کا ایک بیٹا اور ایک بیٹی تھی۔ بیٹے کا نام تلوک چند تھا۔ تلوک چند محروم نے دو شادیاں کیں۔ پہلی بیوی کا انتقال ہو گیا۔ اس سے ایک لڑکی وِدّیا (جس کا پورا نام وِدّیاوتی) تھی۔ دوسری بیوی سے جگن ناتھ آزاد، ساوتری، کرشنا (کرشن کماری) اور شکنتلا ہیں۔ شکنتلا بچپن میں ہی اس دارِ فانی سے کوچ کر گئی جس کی موت پر محروم نے مرثیہ لکھا۔ اس وقت ان کی ۲ دو بہنیں موجود ہیں۔

جگن ناتھ آزاد کی پہلی شادی ۱۹۴۰ء میں شکنتلا سے ہوئی۔ ۱۹۴۶ء میں ہی پہلی بیوی کا انتقال ہو گیا۔ پہلی بیوی کی اولاد اس طرح ہے۔ پرملا، اپنے شوہر کے ساتھ لندن میں رہتی ہیں ان کا ذکر "کولمبس کے دیس" نامی سفر نامے میں موجود ہے۔ دوسری بیٹی مکتا ہے جو نئی دہلی میں مقیم ہیں۔ ایک بیٹا بھی تھا جس کا بچپن میں انتقال ہو گیا۔

۱۹۴۸ء میں آزاد نے دوسری شادی کی۔ دوسری بیوی کا نام وِملا ہے۔ ان سے تین بچے ہیں آدرش کمار، اس وقت ڈپٹی ڈائرکٹر ٹیلی ویژن نئی دہلی ہیں دوسرے بیٹے کا نام چندر کانت ہے ان کی پلاسٹک کی فیکٹری ہے، ایک بیٹی پونم ہے۔ آزاد کے تمام بیٹے بیٹیاں شادی شدہ اور خوشحال ہیں۔ آزاد اپنی گھریلو ذمہ داریوں سے بری ہیں۔ ان کی بیوی بے حد شریف اور گھریلو خاتون ہیں۔ آزاد کی دیکھ ریکھ میں کسی قسم کی کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتیں۔ آزاد اپنی بیوی بچوں میں خوش ہیں۔ کسی قسم کی کوئی ذہنی الجھن اور تناؤ نہیں۔ وہ بے فکری سے اردو کی خدمت کر رہے ہیں۔ آئندہ صفحے میں آزاد کا "شجرۂ نسب" پیش کیا جا رہا ہے۔

جگن ناتھ آزاد کی یہ خوش قسمتی رہی کہ انھیں عظیم ہستیوں سے ہمیشہ کا ساتھ رہا۔ مولانا تاجور نجیب آبادی اور عبد المجید سالک جیسی مشہور ہستیوں سے درس حاصل کیا۔ اس زمانے میں شعراء و ادبا کا جمگھٹا ہوا کرتا تھا، آزاد ان میں گھرے ہوئے رہتے تھے۔

شجرۂ نسب

جدِ امجد: نام پروفیسر جگن ناتھ آزاد کو بھی یاد نہیں ہے۔ مذکورہ جدِ امجد میانوالی کے قریب مہاراجہ رنجیت سنگھ کی ملازمت میں تھے۔ پچاس ہزار روپے کے مالک ہونے کی وجہ سے یہ "ادھ لکھا" کہلائے جو آج تک ان کی ذات چلی آ رہی ہے۔ تقسیم ہند سے پہلے ضلع میانوالی میں "اد لکھا" ذات کے متعدد خاندان آباد تھے۔ مذکورہ جدِ امجد کو دربار کی طرف سے جو زمینیں عطا ہوئیں وہ دریائے سندھ کے دائیں کنارے پر تھیں جو ڈھلوان کی طرف ہے۔ مرورِ ایام سے یہ تمام زمینیں دریا برد ہو گئیں اور لالہ رام دیال کے وقت تک یہ خاندان قریب قریب مفلس ہو چکا تھا جس کا مفصل ذکر جگن ناتھ آزاد نے اپنی کتاب "حیاتِ محروم" میں کیا ہے۔

وکرم: رشتے میں جگن ناتھ آزاد کے چچا تھے جو ۱۹۴۷ء کے ہنگاموں میں اپنے خاندان سے جدا ہو گئے۔ ان کے بارے میں آج تک پتا نہیں چل سکا۔ بعض لوگوں نے بتایا کہ وہ اپنے افرادِ خاندان سمیت تقسیم ملک کے ہنگاموں میں قتل کر دیے گئے۔

جدِ امجد
- ٹیک چند (۱۸۳۱ء — ۱۸۸۱ء)
  - دیال داس
    - وکرم (بیٹا)
    - بیٹی
  - رام دیال سنہ ۱۸۵۹ء — سنہ ۱۹۱۴ء
    - تلوک چند محروم سنہ ۱۸۸۷ء — سنہ ۱۹۱۶ء
      - پہلی بیوی سے
        - ودیا وتی (بیٹی) جس کا ذکر "حیاتِ محروم" میں موجود ہے
      - دوسری بیوی سے
        - (۱) جگن ناتھ آزاد
          - پہلی بیوی سے
            - (۱) پرملا (بیٹی)
            - (۲) مکتا (بیٹی)
            - (۳) (بیٹا بچپن میں انتقال ہو گیا)
          - دوسری بیوی سے
            - (۱) آدرش کمار (ڈپٹی ڈائرکٹر ٹی وی، نئی دہلی)
            - (۲) چندر کانت (بیٹا)
            - (۳) پونم (بیٹی)
        - (۲) ساوتری
        - (۳) کرشنا
        - (۴) شکنتلا (جس کا بچپن میں انتقال ہو گیا)
    - بیٹی

بیشتر مشاعروں میں شرکت کرتے تھے۔ اپنے والد تلوک چند محروم کے ساتھ بھی مشاعروں میں شریک ہوتے تھے۔ آزاد کے مصاحبین میں بعض ہم عمر شعراء تھے تو بعض ان کی عمر سے زیادہ کے تھے۔ مگر ان کی ہر جگہ حوصلہ افزائی ہوتی تھی۔ وہ ہمیشہ قدر کی نگاہوں سے دیکھے گئے۔ علّامہ نیاز فتحپوری، حفیظ جالندھری، عبدالحمید عدمؔ وغیرہ برگزیدہ شخصیتوں سے انھوں نے بہت کچھ سیکھا، جس کا ذکر انھوں نے کئی موقعوں پر کیا ہے۔ ان عظیم ہستیوں میں عبدالعزیز فطرتؔ اظہر امرتسری، آغا صدیق حسن ضیا، جوشؔ ملیح آبادی، جگر مراد آبادی، فضل الرحمٰن اشکؔ، کرپال سنگھ بیدارؔ، گوپال متلؔ، وقار انبالوی، قتیل شفائی، ناصر کاظمی، مجروحؔ سلطانپوری، پنڈت ہری چند اخترؔ، فیضؔ احمد فیضؔ، صابر دہلوی، عرشؔ ملسیانی، ڈاکٹر تاثیر، نصر اللہ عزیز، حرماں خیر آبادی، مجید لاہوری، پُرشوتم لال ضیا، ریاض قریشی، حسن میر کاشمیری، اسد ملتانی، اثر صہبائی، تخشب جارچوی، شعری بھوپالی، احسان دانشؔ اور یوسف ظفر وغیرہ قابلِ ذکر اور اہم نام ہیں جن سے آزاد کی وابستگی رہی۔ ان کے ساتھ مشاعروں میں شرکت کی۔ اسی طرح چراغ حسن حسرتؔ، عبدالمجید بھٹی، اخترؔ شیرانی، شورشؔ کاشمیری، حمید نسیم، ہری چند رندؔ، میراجی، قیوم نظرؔ، الطاف گوہرؔ، ضیا جالندھری، سعادت حسن منٹو، ممتاز مفتی، مجازؔ، ساحر لدھیانوی، کرشن چندر وغیرہ شعراء و ادباء سے بھی آزاد کو رفاقت حاصل تھی۔

۱۹۴۷ء کے موقع پر ہندوستان میں قتل و غارت گری کا بازار گرم ہوا۔ آزاد لاہور سے دہلی آئے۔ لاہور سے آزاد کو بے حد محبّت تھی۔ وین (VAN) کے ذریعے سے لاہور پہنچے جب معلوم ہوا کہ یہاں بھی قتل و غارت گری کا بازار گرم ہے۔ کسی طرح جان بچا کر دہلی آئے اور یہیں کے ہو کر رہ گئے۔

لاہور میں آزاد کو شرنارتھیوں کے ساتھ رفیوجی کیمپ میں دن گزارنے پڑے۔ انھوں نے اپنی آنکھوں سے اپنا گھر لُٹتے، اُجڑتے اور اُس پر قبضہ ہوتے دیکھا۔ ان تمام باتوں کا ذکر آزاد نے اپنی خودنوشت سوانح، خاکے کے علاوہ شاعری میں بھی کیا ہے۔ خودنوشت سوانح میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

"شرنارتھیوں کا ایک بے پایاں ہجوم دفتر سے لے کر سڑک تک موجود تھا اور درخواست دینے کا طریقِ کار بھی اتنا طویل تھا کہ خدا کی پناہ ....." [1]

آزاد کا اپنا گھر لٹ جانے کے بعد انھیں سب سے زیادہ فکر کتابوں کی تھی۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

"جب کئی دن کے سوچ بچار کے بعد نازش صاحب اور شیخ عبدالشکور اس نتیجے پر پہنچے کہ مجھے واپس دہلی چلا جانا چاہیے تو خیال آیا کہ پہلے تو میں لاہور سے بالکل خالی ہاتھ چلا تھا اب کے دوبارہ آ گیا ہوں تو اپنے گھر جا کر جو مقفّل پڑا تھا کچھ کتابیں نکال لی جائیں۔ دو ایک ان میں فارسی شعراء کے قلمی نسخے بھی تھے۔" [2]

آزاد دہلی آکر بس گئے۔ راولپنڈی سے والدین اور بچوں کو بلایا۔ دہلی میں رنبیر جی سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے "ملاپ" میں نوکری کا پیش کش کیا جسے آزاد نے بہ خوشی قبول کر لیا۔ "ملاپ" کے دفتر میں دن میں کام کرتے اور رات میں وہیں سو جاتے۔ آزاد نے اپنے حالات کا جس درد بھرے انداز میں ذکر کیا ہے انھیں پڑھ کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ کس طرح ہندو مسلمان کے خون کا پیاسا تھا اور مسلمان ہندو کے خون کا پیاسا۔ ان حالات میں لاہور جانا، اپنے گھر میں کتابیں ڈھونڈنا اور پھر واپسی بہت ہی مشکل اور دردناک حالات تھے۔ اس جان کنی کے دور میں بھی عبدالمجید کپتان جیسے لوگ تھے جس نے آزاد کے والدین اور گھر والوں کو نہ صرف بہ حفاظت دہلی تک پہنچایا بلکہ ان کی دیکھ بھال بھی کی۔ آزاد لکھتے ہیں:

"میں سوچتا ہوں کہ یہی اخلاق ہر پاکستانی اور ہندوستانی فوجی کا ہوتا یا پچاس فیصد مسلمان اور ہندو وہی حسنِ اخلاق کی اس دولت

---

[1] جگن ناتھ آزاد — خود نوشت سوانح سلسلۂ روز و شب غیر مطبوعہ، ص ۹۵۔
[2] " " " " ص ۹۵۔

سے بہرہ مند ہوتے تو اس برِصغیر پر یہ قیامتِ صغریٰ نہ ٹوٹتی"۔[1]

"ملاپ" میں رنبیر جی کے ساتھ نوکری کرنے سے پہلے آزاد روزنامہ "ٹریبون" لاہور میں اسٹرنگر کے طور پر کام کر چکے تھے۔ رنبیر جی نے "رباعیاتِ عمر خیّام" پڑھنے کی خواہش کی اور اس کے لیے دس روپے ماہانہ عطا کیے۔ اس طرح کل ملاکر انھیں چالیس روپے ماہانہ ملتے رہے۔

سنہ ۱۹۴۱ء میں آزاد نے مولانا صلاح الدّین کی غیر موجودگی میں جب کہ وہ بمبئی گئے ہوئے تھے، ماہانہ "ادبی دنیا" لاہور کی ادارت کے فرائض انجام دیے۔ یہ عرصہ اگرچہ بہت کم تھا یعنی صرف چھ ماہ، مگر آزاد کی زندگی کے لیے یہ موقع بہت اہم ثابت ہوا۔ اس کارکردگی سے مولانا بے حد متأثر ہوئے اور انھیں ایک سرٹیفکٹ بھی عطا کیا۔

جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا ہے آزاد نے "ادبی دنیا" لاہور کی ادارت کی۔ اسسٹنٹ اڈیٹر کی حیثیت سے آزاد نے اردو روزنامہ "جے ہند" میں بھی چند ماہ کام کیا۔ سنہ ۱۹۴۷ء تا سنہ ۱۹۴۸ء اسسٹنٹ اڈیٹر اردو روزنامہ "ملاپ" نئی دہلی رہے۔ سنہ ۱۹۴۸ء میں پانچ ماہ تک ایمپلائمنٹ نیوز کی ترتیب میں مصروف رہے۔ سنہ ۱۹۴۸ء میں ہی منسٹری آف انفارمیشن اینڈ براڈکاسٹنگ گورنمنٹ آف انڈیا میں بہ حیثیت اسسٹنٹ اڈیٹر اردو پبلی کیشنز ڈویژن کا کام شروع کیا۔ یہ سلسلہ ۱۹۵۵ء تک جاری رہا۔ سنہ ۱۹۳۷ء تا سنہ ۱۹۴۷ء کے دوران کوئی دو برس آزاد نے "تحریک رفاقت" میں بہ حیثیت سکریٹری کام کیا۔ روزنامہ "جے ہند" کی ادارت کے بعد آزاد ڈی۔ اے۔ وی کالج لاہور میں بہ حیثیت اردو لکچرر چند ماہ رہے۔ ماہنامہ "آج کل" کے دفتر میں جوش کی رفاقت سے آزاد کو بہت فائدہ پہنچا۔ بقول ظ۔ انصاری "دو سال کے اندر "آج کل" کے دفتر میں جوش نے اسے اپنے پیروؤں میں سمیٹ لیا اور اتنی سینک دی کہ وہ دوستوں کے شر اور دشمنوں کے ضرر سے محفوظ ہو گئے۔ سنہ ۱۹۵۵ء تا سنہ ۱۹۶۲ء یعنی سات برس بہ حیثیت انفارمیشن آفیسر (اردو) پریس انفارمیشن بیورو میں کام کرتے رہے۔ دو سال یعنی سنہ ۱۹۶۲ء تا سنہ ۱۹۶۴ء

---

[1] جگن ناتھ آزاد۔ خود نوشت سوانح بہ سلسلہ روز و شب، ص ۱۰۰، غیر مطبوعہ۔

سنٹرل ویر ہاؤسنگ کارپوریشن، یونین منسٹری آف فوڈ میں انفارمیشن آفیسر رہے۔ اس دوران انگریزی ماہنامہ "ویر ہاؤسنگ نیوز لیٹر" کو ترتیب دیتے رہے۔ پانچ ماہ (جنوری تا مئی ۱۹۶۷ء) کے لیے منسٹری آف ٹورزم شپنگ اینڈ ٹرانسپورٹ سے منسلک رہے۔

۱۹۶۷ء میں پی۔ آر۔ او (منسٹر آف ہوم آفیسرز گورنمنٹ آف انڈیا) مقرر ہوئے۔ جنوری ۱۹۶۸ء میں پریس انفارمیشن بیورو گورنمنٹ آف انڈیا میں ڈپٹی پرنسپل انفارمیشن آفیسر کا عہدہ حاصل ہوا۔

۱۹۷۳ء میں ڈائرکٹر پبلک ریلیشنز پریس انفارمیشن بیورو کا عہدہ حاصل کیا۔ ۱۹۷۷ء تک اس عہدے پر فائز رہے اور یہیں سے ریٹائرڈ ہوئے۔ ریٹائرڈ ہونے کے فوراً بعد ۱۹۷۷ء میں ہی جموں یونیورسٹی میں بہ حیثیت پروفیسر صدر شعبۂ اردو آپ کو خدمت کرنے کا موقع ملا[1]۔ ۱۹۸۰ء میں صدر شعبۂ اردو کے علاوہ ڈین فیکلٹی آف اورینٹل لرننگ جموں یونیورسٹی جموں مقرر ہوئے۔ ۱۹۸۴ء میں دو برس کے لیے ایمی ری ٹس فیلو شپ حاصل ہوا۔ یونیورسٹی نے اس اعزاز کو تاحیات اعزاز میں تبدیل کر دیا۔ ۱۹۸۹ء میں کشمیر یونیورسٹی نے ان کے علمی و ادبی خدمات کے اعتراف میں ڈاکٹر آف لٹریچر کی ڈگری سے بھی نوازا اور اس کے پانچ برس بعد جموں یونیورسٹی نے انھیں مذکورہ بالا اعزازات کے علاوہ ڈاکٹر آف لیٹرز کی اعزازی ڈگری بھی پیش کی۔ تاحال وہ انعامات و اعزازات حاصل کر رہے ہیں۔

---

[1] ملازمتوں کی فہرست "ارمغانِ آزاد" مرتبہ ڈاکٹر ظہور الدین، "کتاب نما" کا خصوصی شمارہ اپریل ۱۹۹۴ء مرتبہ ایم۔ حبیب خاں وغیرہ کی کتابوں میں دیکھی جا سکتی ہے۔

دوسرا باب

(شخصیت)

پروفیسر جگن ناتھ آزاد سے مل کر یہ اندازہ لگانا مشکل ہو جاتا ہے کہ یہ وہی آزاد ہیں جن کا نہ صرف برِ صغیر ہندو پاک میں بلکہ پوری دنیا کے ادبی حلقوں میں چرچا ہے۔ شاعری ہو کہ نثر نگاری، تنقید ہو کہ اقبالیات، ہر میدان میں وہ ایک خاص مقام رکھتے ہیں۔ بہ حیثیت ماہرِ اقبالیات وہ پوری دنیا میں جانے جاتے ہیں۔ پروفیسر آزاد ہندوستان کے پہلے اسکالر ہیں جن سے تھرڈ ورلڈ ٹیلی ویژن نیٹ ورک نیو یارک نے انٹرویو لیا تھا۔ وہ کئی بار بی بی سی ٹیلی ویژن لندن اور برمنگھم، ٹورنٹو ٹیلی ویژن، کنیڈا ٹیلی ویژن، ریگا روس اور پاکستان کے ٹیلی ویژن پر آچکے ہیں بقول ڈاکٹر ظہور الدین،

> "آپ برِ صغیر ہندو پاک کی ان چند شخصیتوں میں ہیں جنھیں اگر اردو کے سفیر" کے نام سے منسوب کیا جائے تو بے جا نہ ہوگا"۔ [1]

حال ہی میں ابو ظہبی اور دوبئی میں "جشنِ آزاد" منایا گیا اور "مجلّہ آزاد" کے نام سے ایک سوونیر بھی شائع کیا گیا۔ یہ ایک ایسا اعزاز ہے جو اب تک صرف ہندوستان کے پانچ شعرا ہی کو ملا ہے، ان میں ایک جگن ناتھ آزاد بھی ہیں۔

جگن ناتھ آزاد کی کوئی تقریباً ساٹھ تصانیف منظرِ عام پر آچکی ہیں ان میں موضوعات کا تنوع موجود ہے۔ شاعری، سفر نامہ، خاکے اور دوسری اصناف سے متعلق تصانیف

---

[1] ڈاکٹر ظہور الدین۔ تقریب اشاعت (مشمولہ) ارمغانِ آزاد مرتب ڈاکٹر ظہور الدین، ص ۱۱، ۱۲۔

موجود ہیں۔ جگن ناتھ آزاد کے نعتیہ کلام کا فرانسیسی زبان میں ترجمہ ہوا ہے۔ فرانس کے مشہور ناشر نے اس کتاب کو شائع کیا ہے۔ اس طرح آزاد کی مقبولیت میں روز بروز اضافہ ہی ہوتا جارہا ہے۔ ملک اور بیرونِ ملک کی ساٹھ سے زیادہ یونیورسٹیوں میں ایک سو سے زیادہ توسیعی لیکچرس دینے کے علاوہ تقریباً دو سو سیمناروں میں آپ شرکت کر چکے ہیں۔ حال ہی میں انھیں ڈاکٹر آف لیٹرز کی اعزازی ڈگری بھی حاصل ہوئی ہے۔ ان سب کے باوجود آزاد کے لباس میں سادگی اور لہجے میں متانت اور نرمی ہے۔ غرور و تکبّر کا دور دور تک شائبہ نہیں۔ آزاد کی جوانی کی تصویروں کو دیکھ کر یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ وہ نہ صرف خوش شکل تھے بلکہ خوش لباس بھی تھے مگر اب ستہتّر سال کی عمر میں لباس میں خاصی سادگی آگئی ہے۔ ان کی شخصیت بے حد جاذبِ نظر ہے۔

آزاد کی پچہتّرویں سالگرہ کے موقع پر اردو گھر مغلپورہ حیدرآباد میں جناب راج بہادر گوڑ نے تہنیت پیش کرتے ہوئے کہا تھا کہ "آزاد صاحب ٹرین میں ہی پچہتّر سال کے مکمل ہوگئے، اگر ہم ان کی عمر میں سے آٹھ دس سال چرالیں تو یہ کوئی مشکل کام نہ ہوگا۔" وہ اپنی عمر سے آٹھ دس سال کم ہی دکھائی دیتے ہیں۔

متناسب اور گٹھا ہوا قد، چہرے پہ چشمۂ زود آمیز، باتوں میں گلوں کی خوشبو، چہرے پر تفکّر کی چھاپ اور شخصیت میں اپنائیت، یہ پروفیسر جگن ناتھ آزاد کی پہچان ہے۔ ناز انصاری کے خیال میں آزاد کی شخصیت کچھ اس طرح ہے:

> "گول کتابی شگفتہ چہرہ، لمبا قد، لمبی اونچی ناک، بڑی بڑی سرمہ آلود سیاہ آنکھیں جن سے عینک کے باوجود خمار اور محبت کی شراب چھلکتی ہے۔ آڑی مانگ، کشادہ پیشانی جس پر اردو شاعری کا ایک تابناک مستقبل نمایاں ہے۔ چہرے کی شگفتگی مطلع اردو پر تاریک گھٹاؤں کو چیرتی ہوئی اس طرح چمکتی ہے جیسے برسات کی کالی راتوں میں بادلوں سے چندرماں جھانک رہے ہوں۔ الفاظ میں نرمی، گفتگو میں گھلاوٹ، ملاقات میں خلوص، بات چیت میں

بے تکلفی اور صاف دلی، بہت جلد گھر پیدا کرنے والی شخصیت۔

یہ ہے آزاد کا حلیہ۔[1]

آزاد کے سینے کی آٹھ پسلیاں ایک زمانے میں گاڑی کے حادثے کی وجہ سے ٹوٹ گئی تھیں[2] آج بھی وہ کبھی کبھی اس درد کا ذکر کرتے ہیں۔ راقم الحروف کو آزاد صاحب سے کئی بار ملنے کا اتفاق ہوا۔ وہ بڑے چھوٹے ہر ایک سے یکساں ملتے ہیں۔ بے تکلف باتیں کرتے ہیں۔ ان کا لہجہ پنجابی ہے۔ انگریزی کے الفاظ بات چیت میں کثرت سے استعمال کرتے ہیں۔ ان کو غصّہ بہت کم آتا ہے۔ مگر بیچ میں بات کاٹنے والوں کو ناپسند کرتے ہیں۔ دوسروں کو بولنے کا موقع بہت کم ہی دیتے ہیں۔ شمیم جہاں لکھتی ہیں:

> "آزاد ہر ایک سے کھلے دل سے ملتے ہیں خواہ وہ مرتبے یا عمر میں ان کے برابر ہو، بڑا ہو یا چھوٹا۔ انھیں مرتبے کے خول میں رہنا پسند نہیں یہی وجہ ہے کہ ان سے مل کر عمر یا مرتبے کا فرق کا احساس تک نہیں ہوتا۔ بلکہ یوں محسوس ہوتا ہے کہ ہم اپنے قریبی غمخوار یا ایسے انسان سے ملے ہیں جس کے ساتھ اپنے دکھ درد، اپنی خوشیاں بانٹ سکتے ہیں۔"[3]

آزاد بنیادی طور پر اعتدال پسند آدمی ہیں۔ وہ ہر معاملے میں اعتدال برتتے ہیں۔ زندگی ضابطے اور اصول کے تحت گزارتے ہیں یہی وجہ ہے کہ صحت بھی اچھی ہے۔ صحت کا خاص خیال رکھتے ہیں۔ چنانچہ شراب نوشی میں بھی اعتدال برتتے ہیں۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

---

[1] ناز انصاری (دہلی) جگن ناتھ آزاد۔ قلمی چہرہ (مشمولہ) جگن ناتھ آزاد۔ حیات اور ادبی خدمات مرتبہ ڈاکٹر خلیق انجم، ص ۲۱۔

[2] اس بات کا ذکر "آنکھیں ترستیاں ہیں" میں موجود ہے۔ دیکھیے ص ۱۰۴۔

[3] شمیم جہاں۔ انسانی قدروں کا امین (مشمولہ) پروفیسر جگن ناتھ آزاد۔ شخصیت اور ادبی خدمات مرتبہ ایم۔ حبیب خاں "کتاب نما" کا خصوصی شمارہ، اپریل ۱۹۹۳ء، ص ۶۰۔

"اریب ہی کی بدولت خورشید احمد جامی سے میری پہلی اور آخری ملاقات ہوئی۔ اس سفر میں میں نے محسوس کیا کہ اریب ام الخبائث کی جانب کچھ زیادہ ہی مائل ہیں۔ میں ۱۹۴۸ء تک جوش کی رفاقت میں آنے سے قبل اس شے سے ناآشنا تھا لیکن اس رفاقت کے بعد بھی ام الخبائث کے دام میں بہت زیادہ گرفتار ہونے کی نوبت نہ آئی۔" [۱]

آزاد مطالعے کے بے حد شوقین ہیں۔ سفر کے دوران بھی مطالعہ کا شغل جاری رہتا ہے۔ اکثر سفر کے دوران خطوط کے فائل ساتھ رکھتے ہیں۔ دوست احباب کو پابندی سے خط لکھتے ہیں ان کے پاس ہر ایک کام کے لیے ایک خاص ترتیب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے دوست احباب کا حلقہ بھی خاصی وسیع ہے انھوں نے عمر بھی اچھی پائی ہے۔ ادبی ماحول پایا ہے۔ ہمدرد اور پیار کرنے والے اساتذہ پائے ہیں۔ غم گسار، قابل اور تربیت دینے والے والد کا سایہ ملا۔ ان سب نے مل کر آزاد کی شخصیت کو چار چاند لگا دیے ہیں۔ ڈاکٹر قمر رئیس لکھتے ہیں :

"آزاد کی شخصیت اس لحاظ سے بڑی بیدار، حساس اور آگاہ شخصیت ہے، ان کی محبت، ہمدردی اور نفرت، بغاوت اور بیزاری، جغرافیائی اور مکانی قیود کی پابند نہیں۔ ان کی شخصیت خود اپنی ذات، قومی حیات اور کائنات کے تخلیقی شعور سے عبارت ہے۔ ان کی بظاہر سادہ و نرم آواز میں تینوں کا احساس ایسا گداز لوچ اور لے پیدا کرتا ہے جو دلوں کو گرماتا ہے، دھڑکاتا ہے۔" [۲]

جگن ناتھ آزاد بہت ہی خلیق اور ملنسار آدمی ہیں۔ نرم میٹھی گفتگو سے لوگوں کا دل جیت لیتے ہیں۔ کثرت سے علمی و ادبی لطائف یاد ہیں۔ اپنی گفتگو سے محفل کو

---

[۱] جگن ناتھ آزاد — آنکھیں ترستیاں ہیں، ص ۱۱۷۔

[۲] ڈاکٹر قمر رئیس — نقش ناتمام (مشمولہ) جگن ناتھ آزاد — ایک مطالعہ، مرتبہ ایوب واقف، ص ۱۸۱۔

قہقہہ زار بنا دیتے ہیں۔ ان کی گفتگو میں شگفتگی ہے۔ تمام دوست احباب نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ وہ ایک زندہ دل انسان ہیں۔ ظریفانہ مزاج پایا ہے۔ بے حد مصروف ہونے کے باوجود دوست احباب کے لیے وقت نکالتے ہیں۔ جناب غلام رضوی گردش آزاد کی ظرافت اور بذلہ سنجی کے متعلق لکھتے ہیں:

"ایک مرتبہ آزاد لنچ کر رہے تھے ان کے ساتھ ان کے دوست تھے پٹّو ان کا چھوٹا بیٹا بھی ساتھ میں تھا۔ کھانے کے میز پر سیب رکھے ہوئے تھے۔ سب کھانے لگے۔ پٹّو جھجک رہے تھے آزاد نے کہا ارے بھئی کھاؤ۔

"نہیں ٹھیک ہے"۔ پٹّو نے جھجکتے ہوئے کہا۔

"اما کھاؤ ـــ اپنا ہی گھر سمجھو"۔ آزاد کے کہنے پر سب بے اختیار ہنس پڑے اور پٹّو بے چارہ جھینپ کر رہ گیا"۔[۱]

بذلہ سنجی اور لطیفہ گوئی آزاد کی فطرتِ ثانیہ ہے۔ موقع محل کے لحاظ سے جملہ کسنا، محفل کو خوشگوار بنا دینا ان کی عین خوش مزاجی کی دلیل ہے۔ راج کمار چندن لکھتے ہیں:

"متحدہ عرب امارات سے واپس آئے تو میں ان سے ملنے گیا۔ ایک خاتون بھی تھوڑی دیر بعد شریکِ گفتگو ہو گئیں۔ میں نے شاید پوچھا متحدہ عرب امارات میں عورتیں کیا پہنتی ہیں۔ ان کی شکل وصورت کیسی ہے؟ وغیرہ۔ ان کے جواب سے میں حیران ہوا کہ "وہاں تو میں نے عورتیں دیکھی ہی نہیں۔ وہ ایر کنڈیشنڈ کوٹھیوں سے نکلتی ہیں اور ایر کنڈیشنڈ کاروں میں بیٹھ جاتی ہیں۔ عموماً کاروں کے شیشے بھی رنگین ہوتے ہیں۔ اتنے میں وہ خاتون بولیں۔ وہاں ویسے

---

[۱] غلام رضوی گردش ـــ "جگن ناتھ آزاد کشمیر میں" (ہندی سے ترجمہ: تارا چرن رستوگی) مشمولہ "ارمغانِ آزاد" مرتبہ ڈاکٹر ظہور الدین، ص ۱۵۲۔

بھی عورتوں کو دیکھنے پر سزا ہوتی ہوگی۔ آزاد صاحب بولے۔ سزا تو ہم بھگت لیتے پر ہمیں کوئی عورت نظر تو آتی۔ گفتگو کو رنگین بنانا ماحول کو گھٹا گھٹا رکھنے کی بجائے ہلکی پھلکی گفتگو سے معطر کرنا آزاد صاحب کی عادت میں شامل ہے۔"[1]

آزاد بہت محنتی آدمی ہیں۔ وہ کام کرتے ہوئے تھکتے نہیں ہیں۔ اس عمر میں بھی وہ خاصی محنت کرتے ہیں۔ اپنے فرائض سے کبھی غافل نہیں ہوتے۔ جوش و لگن سے کام کرنے کا ہی نتیجہ ہے کہ آج وہ ایسے اعلیٰ مرتبے پر فائز ہیں۔ ان کی شخصیت کے ہزار ہا رنگ ہیں۔ بہ حیثیت استاد وہ سب طلبہ کو ایک نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ امتیاز برتنے کو وہ روا نہیں رکھتے۔ اتنی مصروفیات ہونے کے باوجود اپنے پیریڈ (PERIOD) کا پورا وقت طلبہ پر صرف کرتے ہیں۔ استاد و شاگرد کے درمیان تامل و جھجھک کی دیوار حائل نہیں ہونے دیتے۔ ہر طالبِ علم کو ایک ساتھی کی حیثیت سے رائے دیتے ہیں۔ آزاد کے پڑھانے کا انداز بھی دل کش ہے۔ وہ اشعار کے معنی کی تہہ اور گہرائی تک رسائی رکھتے ہیں۔ وہ اپنی غلطی پر اصرار نہیں کرتے۔ غلطی کو غلطی تسلیم کرنے میں تامل نہیں کرتے۔ ڈاکٹر سکھ چین سکھ اپنے طالبِ علمی کے زمانے کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں؛

"ایک دفعہ انھوں نے ایک شعر کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ یہ شعر بیدلؔ کا ہے۔ چند دن بعد خود ہی آکر بتایا کہ میرا خیال غلط تھا، اب دوبارہ میں نے دیکھا ہے۔ مذکورہ شعر عرفیؔ کا ہے۔ یہی خصوصیت وہ ہم طالبِ علموں میں بھی پیدا کرنے کے خواہش مند ہیں۔"[2]

---

[1] راج کمار چندن۔ "جگن ناتھ آزاد" (مشمولہ) "لمحے لمحے" سہ ماہی بدایوں سنہ ۱۹۸۸ء مدیر حبیب سوز، ص ۵۱۔

[2] ڈاکٹر سکھ چین سنگھ۔ پروفیسر آزاد (بہ حیثیت استاد) مشمولہ "ارمغانِ آزاد" مرتب ڈاکٹر ظہور الدین، ص ۲۲۰۔

مذہب : آزاد بیک وقت کئی زبانیں بول سکتے ہیں۔ انگریزی، فارسی، اردو، ہندی اور پنجابی زبانوں پر انھیں عبور حاصل ہے۔ ان کی قابلیت مسلّمہ ہے۔ فارسی کے اشعار اردو سے زیادہ روانی کے ساتھ پڑھتے ہیں۔ عربی بول نہیں سکتے لیکن اُن کی تحریروں میں آیات اور احادیث کے حوالے ملتے ہیں۔ تقاریر کے دوران آیتوں اور احادیث کو تلفّظ کے ساتھ ادا کرتے ہیں۔ وہ حضرت محمدؐ کہنے کے بعد پورا صلّی اللہ علیہ وسلّم پڑھتے ہیں۔ کلمۂ طیّبہ کے مفہوم کو اصل دین سمجھتے ہیں چنانچہ اپنے مذہب کے بارے میں ایک انٹرویو دیتے ہوئے کہتے ہیں :

> "اگرچہ عملی طور پر میں مذہب سے لاتعلّق ہوں لیکن فکری اعتبار سے اور THEORATICALLY میرا تعلّق ہندوؤں کی اس جماعت سے ہے جو بُت پرستی کے خلاف ہے۔ ویدک دھرم یا آریہ دھرم لاالٰہ الّا اللہ ہی کی تعلیم دیتا ہے۔ سوامی ورجانند اور سوامی دیانند سرسوتی نے ویدک دھرم کی یہی تاویل ہمارے سامنے رکھی ہے اور میں اسی کا قائل ہوں"۔[۱]

جگن ناتھ آزاد اسلامی تعلیم سے خاصی واقف ہیں۔ وہ اسلامی تعلیم سے بے حد متاثر ہیں۔ "یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتح عالم" پر وہ گامزن ہیں۔ ایک خدا کے قائل ہیں۔ ہندو دھرم کے بارے میں بھی انھیں خاصی معلومات حاصل ہیں۔ اپنا سفرنامہ "پشکن کے دیس میں" میں آزاد لکھتے ہیں :

> "سِگما نے پوچھا آپ ہندو ہیں یا مسلمان ؟" میں نے کہا یہ تم نے بہت مشکل سوال کیا ہے۔ ہمارے یہاں ہندوستان میں ہندو یا مسلمان ہونے کے معنی یہ ہیں کہ انسان ہندو دھرم یا اسلام کے

---

[۱] ایم۔ حبیب خاں۔ پروفیسر جگن ناتھ آزاد سے ایک انٹرویو (مشمولہ)، "کتاب نما" کا خصوصی شمارہ اپریل ۱۹۹۳ء، مرتبہ ایم۔ حبیب خاں، ص ۳۶۔

اصولوں پر عمل کرتا ہو۔ محض ہندو گھرانے میں پیدا ہونے سے یا
مسلمان گھرانے میں پیدا ہونے سے نہ ہندو ہونے کا دعویٰ کیا جاسکتا
ہے نہ مسلمان ہونے کا۔ ویسے جو ہندوؤں کے گھر میں پیدا ہوتا ہے
وہ ہندو کہلاتا ہے اور جو مسلمان کے گھر میں پیدا ہوتا ہے وہ
مسلمان کہلاتا ہے۔ عمل کے اعتبار سے تمھیں ہندوستان میں بہت
کم ہندو اور بہت کم مسلمان ملیں گے۔ اپنے اپنے مذہب کی تعلیم پر
عمل کرنے کے علاوہ مذہب سے نزدیک ہونے کی ایک اور بھی
صورت ہے اور وہ یہ ہے کہ کسی مذہب سے متعلّق اپنے کتابی علم میں
اضافہ کیا جائے اور اس معیار کو سامنے رکھا جائے تو ہندو دھرم کے
مقابلے میں میرا مطالعہ اسلام کے متعلق کہیں زیادہ ہے۔"[1]

ان اقتباسات سے یہ ظاہر کرنا نہیں ہے کہ آزاد مسلمان ہیں، وہ خالص ہندو گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں اور جہاں تک معلومات کا تعلّق ہے وہ اپنے مذہب کے بارے میں بھی خاصی معلومات رکھتے ہیں۔ وہ اپنے مذہب پر اٹل ہیں۔ اپنے مذہب کے اصول و نظریات پر ہی اپنی زندگی گزار رہے ہیں۔

آزاد سب سے زیادہ اپنے والد سے متاثر ہیں کیوں کہ انھوں نے ہی ان کی تعلیم و تربیت کی۔ مولانا تاجور نجیب آبادی، جن سے وہ بے حد عقیدت رکھتے ہیں ان سے بہت کچھ سیکھا۔ اسی طرح شیخ محمد اقبال ہیں جو اُس وقت وائس چانسلر تھے (علامہ اقبال نہیں)۔ ان سے بھی آزاد نے تعلیم حاصل کی۔ سیّد عابد علی عابد، صوفی غلام مصطفی تبسم، پروفیسر علم الدین سالک، ڈاکٹر سیّد عبداللہ، عبدالمجید سالک کا ذکر پہلے گزر چکا ہے۔ پروفیسر چوتھ رام رنجن سمیت یہ سب آزاد کے اساتذہ ہیں۔ جنھوں نے آزاد کو تعلیم سے آراستہ کیا۔ یہ تمام اساتذہ شعر و سخن کی روایات کے پاسدار تھے۔ آقا بیدار بخت سے آزاد نے

---

[1] جگن ناتھ آزاد۔ پشکن کے دیس میں، ص ۵۵

فارسی اور عربی کی تعلیم حاصل کی۔ ان سے بھی آزاد متاثر ہوئے۔ آزاد کی زندگی میں جوش کا سب سے اہم رول رہا ہے۔ اسی طرح عبدالحمید عدم نے بھی آزاد کے علمی اور شعری صلاحیتوں کو نہ صرف اجاگر کیا بلکہ انھیں نئی روشنی عطا کی۔

اردو نثر میں محمد حسین آزاد اور پریم چند سے متاثر ہیں۔ شاعری میں اقبال، غالب، میر تقی میر اور میر انیس نے انھیں بے حد متاثر کیا ہے۔ آزاد نے پریم چند کے علاوہ ٹالسٹائی کے ناولوں اور افسانوں کو پڑھا۔ سجاد حیدر یلدرم اور کرشن چندر کے افسانے بھی پڑھے۔ ان سے متاثر ہوئے۔ آزاد نے کوئی ناول یا افسانہ نہیں لکھا۔ البتہ ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے لیے ڈرامے اور فیچر لکھے ہیں۔ ایک انٹرویو کے جواب میں آزاد کہتے ہیں:

"یونیورسٹی اور کالج ان کے علاوہ اور کئی برگزیدہ ہستیوں کے نام میں لے سکتا ہوں جن سے میں ملتا رہا ہوں اور متاثر ہوتا رہا ہوں ان میں سے بعض کا اثر شعوری طور پر اور بعض کا تحت الشعوری پر میری تربیت کرتا چلا گیا۔ مثلاً حسرت موہانی، جوش ملیح آبادی، یگانہ لکھنوی، فراق گورکھپوری، جگر مرادآبادی، سید عطاء اللہ شاہ بخاری، پنڈت جواہر لعل نہرو، مولانا ابوالکلام آزاد، مولوی عبدالحق اور ان کے علاوہ متعدد حضرات مثلاً شیخ سر عبدالقادر، سید احمد شاہ پطرس بخاری، صلاح الدین احمد، میاں بشیر احمد، میاں محمد شفیع، چراغ حسن حسرت، حفیظ جالندھری، کرشن چندر۔" [۱]

آزاد انگریزی اور فارسی کے شعراء سے بھی متاثر ہوئے۔ وقتاً فوقتاً ان باتوں کا اظہار کرتے رہتے ہیں۔ ڈاکٹر ضیاء الدین کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہتے ہیں:

---

[۱] محمد اسد اللہ دوانی۔ پروفیسر جگن ناتھ آزاد سے بات چیت (مشمولہ) جگن ناتھ آزاد۔ حیات اور ادبی خدمات مرتبہ ڈاکٹر خلیق انجم، ص ۳۰۵۔

"میں حفیظ کی شاعری سے متأثر ہوا۔ اقبالؔ کی شاعری سے متأثر ہوا۔ آگے چل کے جتنا مطالعہ بڑھتا گیا متأثر تو ہوتا ہی چلا گیا یعنی اگر میں یہ کہوں کہ میں جوشؔ کے کلام سے متأثر نہیں ہوں یا فراقؔ کے کلام سے متأثر نہیں ہوں یا جگرؔ کے کلام سے متأثر نہیں ہوں تو یہ غلط بات ہوگی۔ جب ان کا کلام پڑھا پسند آیا تو متأثر بھی ہوا اور ان سب کے انداز میں شعر کہنے کی کوشش بھی کی..... انگریزی شعرا میں ملٹن سے بھی بہت متأثر ہوں۔ فارسی میں مجھے حافظ کی غزل بہت پسند ہے فردوسی کے شاہنامے کے اکثر حصّے مجھے زبانی یاد ہیں مولانا روم کی مثنوی مجھے بہت پسند ہے متأثر تو انسان ہوتا ہی ہے بلکہ متأثر کرنے لیے تو ساری کائنات ہے۔" [1]

آزادؔ کی سب سے بڑی کمزوری اقبالؔ ہیں۔ ہر بات میں اقبالؔ کے کلام کا حوالہ دینا ان کی فطرتِ ثانیہ ہے۔ جوشؔ کی شاعری پر آزادؔ نے کئی موقعوں پر تنقید کی ہے مگر جہاں تک زبان کا تعلق ہے، آزادؔ جوشؔ کی زبان اور قادر الکلامی سے بہت متأثر ہیں۔ دس برس تک ساتھ رہے، اس عرصے میں ایک ساتھ شاعری کی مشاعرے میں شریک ہوئے۔ اگرچہ جوشؔ عمر میں آزادؔ سے بڑے تھے۔ مگر ان دونوں کی دوستی بڑی گہری تھی۔ جوشؔ جب پاکستان چلے گئے، آزادؔ نے اپنی نظم کے ذریعے سے تأسف کا اظہار کیا اور اپنی بے بسی ظاہر کی۔ جس کے جواب میں جوشؔ نے نظم "درسِ فراموشی" لکھی، جس میں وہ اپنے ساتھی کو تلقین کرتے ہیں کہ وہ بھول جائیں۔

---

[1] ڈاکٹر ضیاء الدین۔ پروفیسر آزادؔ سے تین ملاقاتیں (مشمولہ) "ارمغانِ آزادؔ" مرتّبہ ظہور الدین، ص ۲۷۵۔

آزادؔ نے متعدّد انعامات و اعزازات حاصل کیے ہیں۔ مختلف رسالوں اور کتابوں میں اعزازات و انعامات کی فہرست شائع ہو چکی ہے[1] یہ فہرست خاصی طویل ہے۔ یہی حال علمی و ادبی انجمنوں کی رکنیت اور صدارت کا ہے۔ وہ بہت سارے ادبی انجمنوں کے صدور، معتمد، ایڈوائزر اور رکن ہیں۔ حال ہی میں اردو یونیورسٹی کے لیے جو کمیٹی حکومت کی طرف سے تشکیل دی گئی ہے اس کے بھی آپ ممبر رہیں۔ اس سے ایک طرف ان کی شخصیت اور مرتبے کا پتا چلتا ہے تو دوسری طرف ان کے اثر و رسوخ کا اندازہ بھی ہوتا ہے۔ وہ ہمیشہ کانگریس کی سیاسی جماعت سے منسلک رہے ہے۔ اس سیاست کی جھلک ان کی تقریروں، تحریروں کے علاوہ گفتگو میں بسا اوقات ملتی ہے، چاہے اس بات کو وہ تسلیم کریں یا نہ کریں۔ جہاں تک رکنیت وصدارت کا معاملہ ہے، اس وقت وہ انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی کے صدر ہیں۔ انجمن ترقی پسند مصنّفین کے بھی وہ صدر رہے۔ اسی طرح کل ہند اردو ہندی سنگم جموّں و کشمیر کے بھی چیئرمین ہیں۔ جموّں پروگریسیو رائٹرس ایسوسی ایشن کے صدر ہیں۔ جموّں وکشمیر کونسل کے نائب صدر اور تقریباً ستّر اداروں وانجمنوں کے رکن وسکریٹری وغیرہ ہیں۔

انعامات واعزازات کی تعداد بھی تقریباً سَو سے زیادہ ہے جس میں ایمری ٹس فیلو شپ کا اعزاز بھی ہے۔ جگن ناتھ آزادؔ بعض اعزازات وانعامات پر فخر محسوس کرتے ہیں۔ ان میں ان کے نعتیہ کلام کا فرانسیسی میں ترجمہ ہے۔ وہ بڑے فخریہ انداز میں اس کارنامے کا ذکر کرتے ہیں۔ جگن ناتھ آزادؔ نے ۱۹۷۷ء میں اقبال انٹرنیشنل کانگریس سیالکوٹ پاکستان کے مندوبین کے جلوس کی قیادت کی۔ یہ جلوس سیالکوٹ قلعہ سے علاّمہ اقبالؔ کے مکان تک تھی۔ آزاد اپنی گفتگو میں اس کارنامے کا ذکر کرتے ہیں اور خوش ہوتے ہیں۔ نظم "اجنتا" کا انگریزی میں ترجمہ بھی آزادؔ کے لیے بڑا ہی قیمتی اعزاز ہے۔ ان کی نظموں کا

---

[1] انعامات واعزازات کی فہرست کے لیے دیکھیے "ارمغانِ آزادؔ" مرتبہ ڈاکٹر ظہور الدین، ص ۶۰-۶۱۔ "کتاب نما" کا خصوصی شمارہ اپریل ۱۹۹۴ء۔ مرتبہ ایم۔ حبیب خاں، ص ۸۴ وغیرہ۔

دیگر زبانوں میں ترجمہ آزاد کی شخصیت کو پُر وقار کرتا ہے۔ بی۔بی۔سی و پیرس وغیرہ کے انٹرویوز پر بھی آزاد ناز کرتے ہیں۔ ان تمام اعزازات و انعامات کے علاوہ ان کی کتابوں پر بے شمار انعامات و اعزازات ملے ہیں۔ میر ایوارڈ، غالب ایوارڈ اور اقبال پر بیشتر ایوارڈ آزاد حاصل کر چکے ہیں۔ یہ سلسلہ اب بھی جاری ہے۔

جگن ناتھ آزاد کی شخصیت اور کلام کے سراہنے والوں میں جس طرح عظیم ادیب و نقاد پیش پیش ہیں بالکل اسی طرح شعراء حضرات بھی کچھ پیچھے نہیں۔ خود جگن ناتھ آزاد کے والد تلوک چند محروم جگن ناتھ آزاد کو ان لفظوں میں دعا دیتے ہیں ؎

دنیا میں سعادت ہو میسّر تجھ کو — رکھے محفوظ ذاتِ برتر تجھ کو
اے نورِ نظر یہی دعا ہے میری — حاصل ہو فروغ ماہ و اختر تجھ کو

تلوک چند محروم کی دعا قبول ہوئی۔ "نیرنگِ معانی" میں بھی ایک لمبی دعا آزاد کے لیے موجود ہے۔ محروم کے علاوہ جوش ملیح آبادی، منوّر لکھنوی، راغب مرادآبادی، گورچرن سنگھ گوہر، منصور احمد سالم، صابر آفاقی، بانو طاہرہ سعید، ڈاکٹر ظ۔ انصاری، حمید جالندھری، باوا کرشن گوپال مغموم، حیدر علی، عبدالرحمن خاں ضمیر، مظفر عدیم وغیرہ جیسے شعراء نے بھی جگن ناتھ آزاد کے کلام اور شخصیت کو سراہا ہے۔ بانو طاہرہ سعید کہتی ہیں ؎

بہت زمانے کے بعد آیا پھر دکن کی طرف — مگر محقق و عالم تھا فلسفی تھا اب
کسی عقاب کی مانند تھا بلندی پر — وہ ماہتاب تھا یا آفتاب تھا کیا تھا؟[1]

نظم "خوش آمدی آزاد" میں کہتی ہیں ؎

آزاد وہ ہے جس پہ خود اردو کو ناز ہے — اقبال کا سفیر ہے "دانائے راز" ہے[2]

راغب مرادآبادی کہتے ہیں ؎

---

[1] بانو طاہرہ سعید حیدرآباد — "کہاں ہے؟" (مشمولہ) "جگن ناتھ آزاد۔ حیات اور ادبی خدمات"، ص ۲۰۷، مرتبہ ڈاکٹر خلیق انجم۔

[2] بانو طاہرہ سعید۔ خوش آمدی آزاد" (مشمولہ) "لمحے لمحے" سہ ماہی بدایوں ۱۹۸۸ء، مدیر حبیب سیفی، ص ۵۷۔

سرمایۂ زندگی ہے احباب کی یاد بر آئی بفضلہ مرے دل کی مراد
ہیں خلد نگاہ شوق انبالہ میں شیدائیِ اقبال، جگن ناتھ آزاد

بسملؔ سعیدی کا شعر بھی ملاحظہ کیجیے ؎

یہاں کون شاعر ہے دلّی میں بسملؔ جگن ناتھ آزاد ہے اور میں ہوں[1]

عبدالخالق بھٹی (لندن) کا شعر ہے ؎

حضرت محروم کا سایہ رہا تجھ پہ مدام جس کے صدقے میں ہوا حاصل تجھے عالی مقام

ظفر عدیم کی نظم "رتبہ آزاد" کا ایک شعر ہے ؎

جب تک اردو ہے جہاں تاب، ادب میں آزاد
ترا رتبہ، تری عظمت، ترا اعزاز رہے[2]

---

[1] بسمل سعیدی ٹونکی۔ ایک شعر (مشمولہ) "لمحے لمحے" سہ ماہی بدایوں ۱۹۸۸ء، مدیر حبیب سوز، ص ۵۵۱۔
[2] ظفر عدیم۔ "رتبۂ آزاد" (مشمولہ) "جگن ناتھ آزاد۔ حیات اور ادبی خدمات" مرتبہ ڈاکٹر خلیق انجم، ص ۲۱۸۔

تیسرا باب
(شاعری)

جگن ناتھ آزاد نے شاعری وراثت میں پائی ہے۔ بچپن ہی سے شعروشاعری سے دل چسپی تھی۔ تلوک چند محروم جیسے باپ کی شفقت اور تربیت حاصل رہی۔ بچپن ہی میں کلامِ اقبال کو حفظ کر لیا تھا۔ حفیظ جالندھری کے کلام کا مجموعہ بھی انھیں ازبر تھا۔ وہ بچپن ہی سے ذہین تھے۔ شعروشاعری کا ذوق حاصل رہا۔ پھر کچھ اس طرح کا ماحول ملا کہ اس نے سونے پہ سہاگے کا کام کیا۔

آزاد کے سامنے ان کا گھر لوٹ لیا گیا۔ وطن سے بے وطن ہوئے۔ ہندوستان کی تقسیم عمل میں آئی۔ ہزاروں افراد بے قصور قتل کر دیے گئے۔ بھائی بہن سے جدا ہو گیا۔ شوہر بیوی کا دامن تھام نہ سکا۔ ہر طرف افراتفری کا ماحول، قیامت برپا ماحول، خون انگیز واقعات یہ سب ایسے خارجی اور داخلی واقعات ہیں جن کی وجہ سے آزاد کے کلام میں سوز وگداز پیدا ہوا۔

جگن ناتھ آزاد بے حد نیک اور شریف النفس انسان ہیں۔ وہ دوسروں کے درد سے تڑپ اٹھتے ہیں۔ بہت ہی حسّاس طبیعت کے مالک ہیں۔ انسانیت کے رشتے کے علمبردار ہیں۔ دنیا میں سب سے بڑا رشتہ اگر کوئی ہو سکتا ہے تو وہ انسانیت کا رشتہ ہی ہے۔ اسی رشتے کو آزاد نے اپنایا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں انسانیت کا درس ہے۔ جہاں انسانیت کے خون بہائے گئے انھوں نے درد بھرے آنسو بہائے۔ وہ ایک زندہ دل انسان ہیں۔ تعصّب سے پاک ہیں۔ انھوں نے مسلمان بچّوں کے ساتھ ابتدائی تعلیم

حاصل کی۔ انھیں کے ساتھ پلے بڑھے۔ انھوں نے اپنے دل کی بات دوسروں تک پہنچانے کے لیے نثر و نظم دونوں کا سہارا لیا۔ ان کی شاعری میں درد و الم کی داستانیں موجود ہیں ؎

نہ پوچھو جب بہار آئی تو دیوانوں پہ کیا گزری

آزاد کی شاعری نے ہر طبیعت کو جھنجھوڑ ڈالا اور سب کو رونے رُلانے پر مجبور کر دیا۔ آزاد کی شاعری میں انتقام کا جذبہ نہیں ہے اور نہ سر پکڑ کر بیٹھ جانے کی ترغیب۔ انھوں نے اپنی شاعری کے ذریعے سے ساری انسانیت کو بیدار کیا ہے۔ ہر صنفِ سخن میں انسانیت کی بیداری کے پیغام کو فراموش نہیں کیا۔

آزاد کی شاعری کے ۲ دو خصوصی دور ہیں۔ ایک آزادی سے پہلے اور دوسرا آزادی کے بعد، پہلا دور لاہور میں قیام کا دور ہے، دوسرا دور وطن سے جدائی کے بعد کا ہے۔ ان کا پہلا مجموعۂ کلام "بیکراں" ہے، اس کتاب کے اب تک متعدد اڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ پانچواں ہندی رسم الخط میں بنارس سے شائع ہوا ہے اور چھٹا اڈیشن پاکستان سے چھپا ہے۔ پاکستانی اڈیشن مکتبہ کارواں لاہور سے شائع ہوا۔ ان کا دوسرا مجموعۂ کلام "ستاروں سے ذرّوں تک" ہے۔ یہ کلام سنہ ۱۹۴۹ء سے لے کر سنہ ۱۹۵۰ء پر محیط ہے۔ اس کے بھی کئی اڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔

"وطن میں اجنبی"، طویل تمثیلی نظم ہے جو چار برس یعنی سنہ ۱۹۴۶ء سے سنہ ۱۹۵۰ء تک کی مدّت میں کہی گئی ہے۔ "نوائے پریشاں" سنہ ۱۹۵۰ء تا سنہ ۱۹۵۱ء کا کلام ہے۔ "جستجو" سنہ ۱۹۵۱ء سے سنہ ۱۹۵۹ء تک کا کلام زیرِ طبع ہے۔ اسی طرح "بوئے رمیدہ" سنہ ۱۹۵۹ء تا سنہ ۱۹۶۶ء کے کلام پر محیط ہے۔ پاکستان میں جب "بوئے رمیدہ" شائع ہوئی تو اس کا نام ناشر نے غلطی سے "بوئے رسیدہ"، رکھ دیا، جس سے آزاد کو دلی تکلیف ہوئی۔ جنوں کے سیلاب میں آزاد کی بہت سی کتابیں اور غیر مطبوعہ مسودے ضائع ہو گئے۔ آزاد کثرت سے شاعری کرتے ہیں۔ ان کی شاعری میں خونِ دل اور خونِ جگر کی آمیزش ہے۔ فراق گورکھپوری ان کی شاعری کے متعلق لکھتے ہیں:

"آزاد کی غزلیات، رباعیات، قطعات اور نظمیات کو خواہ سرسری

طور پر کوئی پڑھے خواہ غائر طور پر، یہ امر واضح ہو جاتا ہے کہ آزاد کی
بیک وقت نرم، متوازن اور مردانہ وار ہے لہجہ بیک وقت سنجیدہ
وحساس ہے۔ خیالات جذبات قلب و نظر اس تربیت و تہذیب
کا پتہ دیتے ہیں جس کی جتنی بھی قدر کی جائے کم ہے۔ الفاظ و بیان میں
قابلِ رشک شستگی ہے، ان کے ہر شعر کے آئینے میں ان کا کردار جھلک رہا
ہے۔ سو بات کی ایک بات یہ ہے کہ ان کا کلام برابر ترقی کرتا ہوا نظر
آتا ہے۔ سطحیت تو ان کے کلام میں کہیں ہے ہی نہیں۔ ایک بڑھتی ہوئی
گہرائی جس میں برابر تہیں پڑتی جا رہی ہیں۔" [1]

آزاد کی شاعری میں گیرائی بھی ہے اور گہرائی بھی۔ ان کی شاعری میں سطحیت اور
سستا پن نہیں ہے بلکہ ایک خاموش اور پوشیدہ طوفان ہے۔ آزاد کا غم بھی اپنا غم نہیں
بلکہ سارے جہاں کا غم ہے۔ فسادات سے متأثر ہونے والوں کا غم ہے۔ گھر سے بے گھر ہونے
والوں کا غم ہے۔ وطن سے بے وطن ہونے والوں کا غم ہے۔ آزاد کا ایک مخصوص راستہ ہے
اور ایک خاص منزل جس پر وہ آہستگی سے گامزن ہیں۔ ارشد کاکوی لکھتے ہیں:

"آزاد کی راہ شاعری کی ایک مخصوص منزل ہے لیکن یہ منزل کوئی
سیاسی یا ہنگامی منزل نہیں۔ نہ انقلاب لانے کی تبلیغ ہے۔ نہ
ثواب کمانے کی تحریک۔ یہ منزل انسانیت پرستی ہے اور بلاشبہ
اپنی شاعری سے آزاد ایک ایسا نظامِ حیات ہمارے ذہن میں فضا
تعمیر کر رہے ہیں جو بہت ہی صحت مندانہ اور جاندار ہے اور
وہ کسی ازم (ISM) سے متأثر نہیں۔" [2]

---

[1] فراق گورکھپوری۔ ابتدائیہ (مشمولہ) "جگن ناتھ آزاد اور اس کی شاعری" مرتبہ حمیدہ سلطان احمد، ص ۳۵۔
[2] ارشد کاکوی۔ جگن ناتھ آزاد (مشمولہ) "جگن ناتھ آزاد اور اس کی شاعری" مرتبہ
حمیدہ سلطان احمد، ص ۱۵۸۔

جگن ناتھ آزاد نے شاعری کو زندگی کے ساتھ ہم آہنگ کیا ہے۔ ان کی شاعری مقصدی ہے، ان کے کلام میں حرکت و عمل کا پیغام ہے۔ صبر و تحمّل، وسیع النظری اور اتّحاد کا سبق ہر جگہ موجود ہے۔ چاہے وہ نظم ہو کہ غزل انھوں نے شاعری برائے فن کبھی نہیں کی۔ فن برائے زندگی کے وہ قائل ہیں۔

تقسیم کے بعد آزاد کی شاعری میں خاصی تبدیلی آئی۔ ان کی شاعری جذبۂ فراق، وطن کی آہوں اور سسکیوں کا سرمایہ بھی بنی۔ انھوں نے جو کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا، سنا اسی کی شاعری کی۔ کائنات اور اس کے مسائل کو اپنا موضوعِ سخن بنایا۔ ہر طرح کے موضوع پر طبع آزمائی کی اور حقیقت کو پیش کیا۔ ڈاکٹر سیّد اعجاز حسین آزاد کی شاعری کے متعلّق لکھتے ہیں:

"جگن ناتھ آزاد آزادی سے پہلے بھی اچھی خاصی شہرت کے مالک تھے مگر دراصل آزادیِ ہند نے آزاد کو آزاد بنایا۔ آزادی اور تقسیم کے ردِّ عمل نے ان کے سامنے ایسے روح فرسا مواد اکٹّھا کر دیے کہ ان کی حقیقت پسند طبیعت کو ہمیشہ سے زیادہ متأثر ہونا پڑا۔ احساس نے بے ساختگی اور شعور نے پختگی کے ساتھ جذبات کو وہ سامان مہیّا کر دیے جن کی ضرورت ایک اچھے فن کار کو ہوتی ہے اس لیے کہنا پڑتا ہے کہ جگن آزاد، محروم ایسے معروف و مشہور شاعر کے بیٹے نہ ہوتے تب بھی اچھے شاعر ہوتے اس لیے کہ ان کی صلاحیتیں شاعرانہ پیکر میں ڈھلنے کے لیے کسی انسان یا استاد کی محتاج نہ تھیں"[1]

آزاد کا سلسلہ اقبال سے بھی جڑتا ہوا نظر آتا ہے۔ یہ سلسلہ رنگ و آہنگ کے معاملے میں بھی ہے اور اپنے زمانے کے حالات اور نبض شناسی کی وجہ سے بھی ہے۔

---

[1] ڈاکٹر سیّد اعجاز حسین۔ مختصر تاریخ ادب اردو، ص ۱۸۶۔

اقبالؔ نے تقسیم سے پہلے کا نقشہ کھینچا ہے۔ آزادؔ نے تقسیم کے بعد کے حالات کا رونا رویا ہے۔ یہ کیفیت "وطن میں اجنبی" میں خصوصاً پائی جاتی ہے۔ اقبالؔ نے اپنے کلام کے ذریعے سے سارا عالم اسلام کو جھنجھوڑا اور بیدار کرنے کی کوشش کی۔ آزادؔ نے بھی "بھارت کے مسلمان" "اردو" "جامع مسجد" اور "بابری مسجد" جیسی نظموں اور غزلوں کے ذریعے مسلمانوں کے ضمیر کو بیدار کرنے کی کوشش کی ہے۔

جگن ناتھ آزادؔ کی شاعری کو مختلف خانوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ آزادؔ بہ حیثیت غزل گو، بہ حیثیت نظم گو، رباعی گو اور بہ حیثیت شخصی مرثیہ نگار آئندہ صفحات میں ان کی غزل گوئی کا جائزہ لیا گیا ہے۔

جگن ناتھ آزاد کی غزل گوئی

غزل اردو شاعری کی جان ہے۔ غزل کا ایک شعر بعض موقعوں پر طویل نظم پر حاوی ہوتا ہے۔ غزل میں وسعت اور گہرائی ہوتی ہے۔ آج کے دور میں غزل کا میدان وسیع بھی ہے۔

جگن ناتھ آزاد اردو کے مشہور و معروف شاعر ہیں۔ انھوں نے تقریباً ہر صنف میں طبع آزمائی کی ہے۔ غزل ان کی محبوب صنف رہی ہے۔ آزاد نے گرچیکہ اپنی شاعری کی ابتدا نظموں سے کی لیکن اس زمانے میں غزلیں بھی کہی تھیں۔ البتہ ان کا پہلا کلام "ادبی دنیا" لاہور میں پہلی مرتبہ شائع ہوا۔ ان کے کلام کے مجموعوں کے نام "طبل و علم" بیکراں، ستاروں سے ذرّوں تک، وطن میں اجنبی، نوائے پریشاں، جستجو، بوئے رمیدہ وغیرہ ہے۔ ان مجموعوں میں نظموں کی بہ نسبت غزلوں کی تعداد کم ہے۔

آزاد کے تغزّل کا رنگ دل نشیں ہے، ان کی غزلوں میں انتہائی پختگی، سوز، درد اور تڑپ کی کیفیات پائی جاتی ہیں۔ چونکہ آزاد خود سچے اور مخلص انسان ہیں اس لیے ان کی غزلوں میں واردات اور احساسات سچے ہیں۔ جذبات میں گہرائی اور خلوص ہے۔ آزاد نے اپنی غزلوں میں سیاسی حالات سے پیدا ہونے والے تاثرات کو نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ بیان کیا ہے۔ "بیکراں" کی پہلی غزل میں تقسیم ہند کے بعد کے تاثرات ہیں اس غزل نے ہندوستان سے زیادہ پاکستان میں دھوم مچائی ہے

نہ پوچھ جب بہار آئی تو دیوانوں پہ کیا گزری
ذرا دیکھو کہ اس موسم میں فرزانوں پہ کیا گزری

چونکہ غزل کے اوپر عنوان ۱۵ راگست ۱۹۴۷ء درج ہے۔ پھر موضوع میں وحدانیت اور تسلسل بھی ہے اسی بنا پر بعض حضرات نے اس غزل کو نظم میں بھی شامل کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسے غزل اور نظم دونوں اصناف میں داخل کرنے میں کوئی عذر مانع نہیں ہے۔ بہرحال یہ ایک ایسی غزل ہے جس کے ہر شعر پر داد دیے بغیر نہیں رہ سکتے، خاص طور پر جن لوگوں نے ۱۹۴۷ء کا زمانہ دیکھا یا پڑھا ہے۔ آزاد کی غزلوں میں خارجی عناصر کی بہتات ہے۔ ان کی غزلوں میں ہر طرح کے مسائل ہیں۔ آزاد ایک دردمندانہ دل رکھتے ہیں۔ وہ خود فساد کی لپیٹ میں آچکے ہیں مگر ان کی نگاہ ہمیشہ انسانیت کے اِرد گرد گھومتی رہتی ہے۔ اس لیے ان میں انتقام کا جذبہ پیدا نہیں ہوتا۔ تقسیمِ ہند کے اس پُرآشوب دور میں بھی تعصب اور تنگ ذہنی کا شکار نہیں ہوئے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

جو دل کا راز بے آہ و فغاں کہنا ہی پڑتا ہے — تو پھر اپنے قفس کو آشیاں کہنا ہی پڑتا ہے

نہ پوچھو کیا گزرتی ہے دلِ خود دار پر اکثر — کسی بے مہر کو جب مہرباں کہنا ہی پڑتا ہے

بہ فیضِ مصلحت ایسا بھی ہوتا ہے زمانے میں — کہ رہزن کو امیرِ کارواں کہنا ہی پڑتا ہے[1]

یہی آنکھیں کہ ہیں دورِ خزاں کی اب تماشائی
انہی آنکھوں سے دیکھی تھی بہارِ زندگی میں نے[2]

آزاد کی غزلوں میں احساس کی شدت ہے ان کی فکر کا پہلو بھی مثبت ہے وہ دورِ خزاں میں بھی بہاروں کی امید کرتے ہیں۔ تخریبی دور میں تعمیرِ نشیمن کی فکر کرتے ہیں ؎

تہذیب کا پرچم لہرایا، ہر شہرِ چمن ویران ہوا
تعمیر کا یہ ساماں جو یہی تخریب کا ساماں کیا ہوگا

چمن میں خامشی سی ہے فضا اداس اداس ہے
چمن کو خواب سے جگا فضا کو بے قرار کر

---

[1] جگن ناتھ آزاد۔ "وطن میں اجنبی"، ص ۲۰۲-۲۰۴۔ [2] بے ستاروں سے ذرّوں تک، ص ۱۷۔

آزاد کے یہاں خیالات کی بلندی اور گہرائی ہے گو چونکہ انھوں نے مایوسی اور غم کا زمانہ دیکھا مگر ان کے حوصلے پست نہیں ہیں۔ وہ زندگی کو بامقصد دیکھنا چاہتے ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ کیجیے ؎

مقصدِ حیات بھی غم کے ساتھ ساتھ ہے — کارواں کے ساتھ ساتھ اک غبار ہے تو کیا

وہ عزم ہے جو لے آتا ہے قدموں تک کھینچ کے منزل کو — اس راز کو رہبر کو کیا سمجھے اس بھید کو منزل کیا جانے

آزاد ہے محوِ جہد وعمل انجام پہ کب ہے اس کی نظر — یہ کشتِ عمل کا دیوانہ اس کشت کا حال کیا جانے

نظر جمتی تو کیا جمتی قدم رکتے تو کیا رکتے — کہ ہم نے اپنی منزل کو بھی اپنی رہگذر جانا

جگن ناتھ آزاد دراصل نظم نگاری کے شہنشاہ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی غزلوں میں بھی نظموں کی سی کیفیت پائی جاتی ہے۔ نظم اور غزل کے تناسب کے لحاظ سے غزلوں کی تعداد بھی کم ہے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ان کی بعض غزلوں میں موضوع کی وحدانیت، تسلسل اور ربط پایا جاتا ہے جو نظم کے خصوصیات ہیں ؎

ہمّت نہ ہارو ہمّت نہ ہارو — مرے چمن کے زخمی بہارو

طوفاں کی موجیں للکارتی ہیں — قائم رہوگے کب تک کنارو

ذرّوں کے تیور بگڑے ہوئے ہیں — اے چاند تارو! اے چاند تارو![1]

ایک اور غزل کے دو اشعار ملاحظہ کیجیے ؎

اب کے برس تو یوں ہوئی فصلِ بہار خیمہ زن — موجِ نسیم کی جگہ خاک اڑی چمن چمن

دل ہے کلی کا نالہ کش چاک ہے گل کا پیرہن — کتنی عجیب ہے بہار، کتنا حسین ہے چمن[2]

آزاد کی بعض غزلیں طویل بحروں میں ہیں۔ ان کی غزلوں میں تغزّل کا رنگ نمایاں طور پر پایا جاتا ہے۔ ان کے کلام میں شوخی، حسن کا بیان، سوز و گداز غرض ہر طرح سے ان کا کلام مزیّن ہوتا ہے ؎

تری نظروں کا تبسم تری باتوں کی مٹھاس — یاد رکھ بھی نہ سکوں اور بھلا بھی نہ سکوں

---

[1] جگن ناتھ آزاد۔ ستاروں سے ذرّوں تک، ص ۱۲۹۔ [2] جگن ناتھ آزاد۔ نوائے پریشاں، ص ۲۹۔

یہ قدم قدم پہ رکاوٹیں یہ قدم قدم پہ مخالفت مری سادگی ترا شکریہ میرے دوستوں کی کمی نہیں[۱]

۱۹۴۹ء سے آج تک کے اگر آزاد کے کلام کا جائزہ لیا جائے تو یہ معلوم ہوگا کہ ان کے کلام میں نظموں اور غزلوں کا حسین امتزاج ہے۔ نظموں کی طرح ان کی غزلوں میں بھی ارتقائی تسلسل ملتا ہے۔ آزاد کی ابتدائی غزلوں میں وطن سے دوری کا احساس شدّت کے ساتھ موجود ہے۔ وطن سے اور وطن کی ہر شے سے محبّت جس طرح نظموں میں ملتی ہے اسی طرح غزلوں میں بھی پائی جاتی ہے۔ کبھی وہ اپنی جنم بھومی کو یاد کرتے ہیں تو کبھی موجودہ وطن کی یاد میں کھو جاتے ہیں ؎

جن کے طفیل باغ وبہاراں تھی زندگی وہ دوست وہ حبیب نہ جانے کہاں گئے

ملتا نہیں چمن میں کہیں ان کا اب نشاں اے بجلیو! تمہارے نشانے کہاں گئے[۲]

کس طرح کر سکوگے بہاروں کو مطمئن اہلِ چمن جو میں بھی چمن میں نہ آسکوں

تیری حسین فضا میں مرے اے نئے وطن ایسا بھی ہے کوئی جسے اپنا بنا سکوں

آزاد روایت کے پرستار بھی ہیں اور جدّت پسندی کے قائل بھی ہیں۔ ان کا اپنا ایک مخصوص انداز ہے۔ دیگر شعراء کی طرح وہ بھی طرزِ میرؔ اور لہجہ غالبؔ کا اختیار کرنا چاہتے ہیں ؎

شعر کا انداز اے آزاد اپنا ہے مرا
ہوں میں عاشق لہجہ غالبؔ کا طرز میرؔ کا

آزاد دیگر شعراء کی طرح غزل میں حسنِ بیان کو اوّلیت کا حامل تصوّر کرتے ہیں۔ مگر صرف حسنِ بیان ان کے نزدیک کافی نہیں ؎

غزل میں حسنِ بیان بڑی شے ہے شک نہیں مجھ کو اس میں لیکن
میں سوز جذبے کا دیکھتا ہوں غزل میں حسنِ بیاں سے پہلے[۳]

۱؎ جگن ناتھ آزاد۔ نوائے پریشاں، ص ۹۴۔ ۲؎ وطن میں اجنبی

۳؎ جگن ناتھ آزاد۔ بوئے رمیدہ، ص ۲۶۔

آزاد سوز اور جذبے کے قائل ہیں ان کی غزل میں درد و تڑپ، سوز و گداز ہر جگہ موجود ہے۔ ایک جگہ کہتے ہیں ؎

آنکھوں کو شغل گریہ دیا دل کو سوز و درد
اے ذوقِ شعر! تو نے مجھے اور کیا دیا[1]

آزاد کے سینے میں سارے انسان برادری کا درد پوشیدہ ہے۔ وہ انسانیت کی قدر کرتے ہیں۔ وہ ہندو اور مسلمان ہونے سے پہلے انسان بننے کی دعوت دیتے ہیں۔ جب کسی لاش کو دیکھتے ہیں تو سب سے پہلے یہ سوچتے ہیں کہ یہ انسانیت کی لاش ہے۔ اس پر آشوب دور میں بھی ان کے یہاں تنگ نظری کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ چند اشعار ملاحظہ کیجیے ؎

فاتح بحر و بر سہی آج کا آدمی مگر
آدمیت کی لاش وہ دیکھ پڑی ہے بے کفن[2]

کہو دیر و حرم والو! یہ تم نے کیا فسوں پھونکی
خدا کے گھر پہ کیا بیتی صنم خانوں پہ کیا گزری

ہندو کوئی یاں کوئی مسلماں نظر آیا
حسرت رہی جس کی نہ وہ انساں نظر آیا[3]

آزاد اپنے سے زیادہ دوسروں کی فکر کرتے ہیں۔ وہ اپنے اور بیگانے میں امتیاز نہیں برتتے۔ وہ ہر ایک کے غم میں برابر کے شریک ہوتے ہیں ؎

آج سارے چمن کی خیر منا — اک مرے آشیاں کی بات نہ کر[4]
نہ پوچھ آزاد اپنوں اور بیگانوں کا افسانہ — ہوا تھا کیا یہ ان کو اور بیگانوں پہ کیا گزری (دیگراں)

وطن سے جدائی کا احساس جس طرح نظموں میں پایا جاتا ہے، آزاد کی بیشتر غزلوں میں بھی یہ احساس موجود ہے۔ "نوائے پریشاں" تک کے کلام میں وطن سے دوری،

۱؎ جگن ناتھ آزاد ـــ بوئے رمیدہ، ص ۸۴۔ ۲؎ آزاد ـــ نوائے پریشاں، ص ۲۹۔
۳؎ آزاد ـــ بوئے رمیدہ، ص ۲۸۔ ۴؎ آزاد ـــ وطن میں اجنبی، ص ۲۰۹۔

شاعر کی بے بسی اور مجبوری نمایاں طور پر عیاں ہے۔ "نوائے پریشاں" کے یہ دو اشعار ملاحظہ کیجیے ؎

اپنے وطن کو چھوڑ کر ہو بھی چکا ترا تو میں
تو نہ مگر مرا ہوا آہ مرے نئے وطن!
درد سے روح بے نیاز اشک سے آنکھ بے خبر
دیکھ مری نئی فضا اے مرے ہمدم کہن[1]

اس پوری غزل میں وطن سے دوری کا احساس ہے تو دوسری طرف نئے وطن سے محبّت کا اظہار نمایاں ہے۔ زخم کتنا ہی گہرا کیوں نہ ہو ایک نہ ایک دن بھر ہی جاتا ہے۔ غم میں بھی خوشی تلاش کر کے زندگی بہر حال گزارنی پڑتی ہے۔ زندگی کا فلسفہ بیان کرتے ہوئے آزاد کہتے ہیں ؎

یہ فلسفہ خاک فلسفہ ہے کہ ہر خوشی میں الم نہاں ہے
نگاہ پہلو ذرا جو بدلے تو ہر الم میں خوشی ملے گی[2]

رفتہ رفتہ رجائیت کا پہلو غالب ہونے لگتا ہے۔ وہ وطن سے دور ہو کر بھی قربت محسوس کرنے لگتے ہیں ؎

اب بھی ہے عالم احساس نہ شاداں نہ حزیں
تجھ سے دوری بھی ترے قرب سے کچھ کم تو نہیں[3]

سنہ ۱۹۵۰ء کے بعد نظموں کی طرح آزاد کی غزلوں میں بھی بے حد پختگی آجاتی ہے۔ یہاں سے ان کی شاعری ایک موڑ لیتی ہے۔ وہ ہندوستان کو اپنا وطن بنا لیتے ہیں۔ یہاں کی ہر چیز سے محبّت کرنے لگتے ہیں۔ آب و ہوا سے لے کر ہر ذرّے سے آزاد محبّت کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ دوسری جانب انھیں دکن سے پیار ہو جاتا ہے "بوئے رمیدہ" کی غزلوں میں نظموں کی طرح ایک طرف دکن کی سرزمین سے محبّت کا احساس ہے تو دوسری

---

[1] آزاد۔ نوائے پریشاں، ص ۳۰۔ [2] ایضاً ص ۷۵۔ [3] ایضاً ص ۱۱۷۔

طرف وطن کی محبّت ہے۔ دکن سے محبّت کی ایک پوری داستان ہے جس کا احاطہ نظموں میں کیا گیا ہے۔ یہاں مختصر طور پر ان کی غزلوں میں جو دکن کا ذکر کیا گیا ہے اور دکن سے وابستگی کا اظہار کیا گیا ہے اس کی جانب اشارہ کیا جاتا ہے۔ حیدرآباد اور دکن کے متعلق چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

مدّت سے اب یہ مصرعِ حسرت زباں پہ ہے
"گلزار بن گئی ہے زمیں دکن تمام"

بس اتنی یاد ہی سیرِ دکن کی آج باقی ہے
جنوں مہماں تھا ہوش و خرد کی میزبانی تھی

بزمِ خرد میں چھڑ تو گئی ہے دکن کی بات
اب عشق لے کے آئے گا دار و رسن کی بات

کبھی وہ دکن کی یاد کے ساتھ وطن کی یاد کو جوڑ لیتے ہیں ؎

نہ ٹوٹا زندگی میں سلسلہ آزادؔ! یادوں کا
کبھی یادِ وطن آئی، کبھی یادِ دکن آئی[1]

"بوئے رمیدہ" کی غزلوں میں دکن اور حیدرآباد کا ذکر کثرت سے ہے بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ یہ مجموعۂ کلام دکن کی یادوں کی داستان ہے۔ کبھی وہ دکن کی میزبانی یاد کرتے ہیں تو کبھی ماحول اور فضا یاد آنے لگتا ہے۔ کبھی اپنے محبوب کی یادیں کھو جاتے ہیں ؎

یہ اتنا ذکر کیوں آخر دکن کی میزبانی کا
پذیرائی تری اے دل کہیں جب کم نہیں ہوتی

دلّی میں یوں زباں پہ آئی دکن کی بات
صحرا میں چھیڑ دے کوئی جیسے چمن کی بات

اے ارضِ دکن! میں ترے ماحول پہ قرباں
جنّت میں بھی آئے گی ترا کیف فضا یاد

دکن کی ہیر سے آزادؔ کوئی جا کے یہ کہہ دے
کہ رانجھے کے وطن سے آج اک دیوانہ آتا ہے

۱۹۵۰ء میں آزادؔ نے حیدرآباد کا سفر کیا۔ حسین ساگر اور گولکنڈہ کے مقبروں سے وہ بے حد متاثر ہوئے۔ آزادؔ نے حیدرآباد کے تاثرات کو اپنی غزلوں میں بھی پیش کیا ہے، چند اشعار پیش کیے جاتے ہیں ؎

---

[1] بوئے رمیدہ، ص ۶۴۔

حیدر آباد بہت دور سہی دہلی سے
تو تو اے دوست مگر مجھ سے بہت دور نہیں

زندگی اک سفر تھی جس میں حیدر آباد بہت یاد آیا
فاصلے کی تو خیر بات ہے اور حیدر آباد دل سے دور نہیں

آزاد نے نظمیں اور غزلیں دونوں کہی ہیں۔ نظموں کی طرح غزلوں میں بھی ان کی شخصیت کی عکاسی موجود ہے۔ کہیں وہ آفاقی پیغام سناتے ہوئے نظر آتے ہیں تو کہیں ہنگامی حالات سے نمٹتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ انھوں نے ہر حال میں خلوص اور انسان دوستی کا جذبے کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ وہ بنیادی طور پر سیکولر روایات کے حامل ہیں اور یہی زندگی ان کی نظموں اور غزلوں دونوں جگہوں پر موجود ہے ؎

الجھ کر رہ گئے پہلے قدم پہ فرزانے
گزر گئے جو دیر و حرم سے دیوانے [۱]

ظہیر احمد صدیقی لکھتے ہیں ؛

"غزل ہو یا نظم ان کے یہاں فنی تقاضوں اور مقررہ معیاروں کا پورا پورا احترام پایا جاتا ہے لیکن ان کے خیالات اور احساسات ان کے اپنے ہیں کہیں سے مستعار نہیں ہیں اسی طرح ان کے موضوعات شاعری بھی روایتی یا رسمی نہیں ہیں بلکہ وہ ان کی شخصیت کا اظہار اور ان کے قلبی احساسات کے ترجمان ہیں"۔ [۲]

آزاد کی غزلوں میں جس طرح سادگی کو عمل دخل ہے اسی طرح ان کے یہاں تازگی اور پختگی پائی جاتی ہے۔ معاملہ بندی، راز و نیاز کی باتیں، خلوص و پیار، عشق و محبت، شکایت زمانہ، سوز و گداز، آہ و فغاں سے پُر ہیں ان میں حقیقت کا پہلو اجاگر ہے۔ انھوں نے

---

[۱] آزاد۔ ستاروں سے ذرّوں تک، ص ۷۷۔ [۲] پروفیسر ظہیر احمد صدیقی "دیر و حرم کا شاعر" (مشمولہ) "کتاب نما" کا خصوصی شمارہ اپریل ۱۹۹۴ء، ص ۲۲۔ مرتبہ ایم۔ حبیب خاں۔

روایت سے انحراف بھی نہیں کیا اور جدیدیت کے نام پر اردو شاعری میں سطحی شاعری بھی نہیں کی۔ نظم کی طرح غزل میں بھی ان کے یہاں اعتدال کی صورت ہر جگہ موجود ہے۔ کہیں بھی عزم و توازن کی کمی نہیں۔ غزل کے چند اشعار ملاحظہ کیجیے ؎

خیال یہ تھا کہ دل کو تسکین نگاہ کو تازگی ملے گی
خبر نہ تھی تیرے روبرو بھی مجھے تری ہی کمی ملے گی (نوائے پریشاں)

یہ ناقدری زمانے کی جو ہم پر آج ہنستی ہے
ہمیں اس وقت روئے گی یہاں جب ہم نہیں ہوں گے

کبھی آندھیوں میں دمکا کبھی بارشوں میں چمکا
وہ فقیر ہوں کہ جس کا نہ بجھا چراغ خانہ (نوائے پریشاں)

نازش پرتاپ گڑھی آزاد کی غزل گوئی پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

"آزاد کے تغزل کا رنگ دل نشیں اور روح گیر قسم کا ہے جس میں متانت اور بصیرت کی فراوانی پائی جاتی ہے۔ اس کی غزل میں انتہائی پختگی، سوز، گھلاوٹ اور لطافت پائی جاتی ہے اور پھر یہ کہ اس کے واردات اور احساسات سچے ہیں۔ جذبات میں گہرائی اور خلوص ہے اور خیالات میں ندرت اور نفاست ہے۔"[1]

"بوئے رمیدہ" میں غزلوں کی تعداد سب سے زیادہ ہے۔ یہاں آتے آتے آزاد کے کلام میں خاصی تبدیلی آئی ہے۔ اب یہاں وطن کی فرقت کا احساس کم ہے اور وطن سے لگاؤ کا احساس زیادہ ہے۔ کہیں وہ کشمیر، بھوپال اور دکن کو یاد کرتے ہیں تو کہیں کشمیر کی وادیوں میں گم ہو جاتے ہیں۔ اپنے ملک سے دور ہو کر بھی وہ وطن کو فراموش نہیں کرتے۔ دیگر ممالک میں بھی وہ گنگا کی لہریں دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یوروپ میں بھی دکن کی

---

[1] نازش پرتاپ گڑھی۔ "آزاد کی شاعری" (مشمولہ) "جگن ناتھ آزاد اور اس کی شاعری" مرتبہ حمیدہ سلطان احمد، ص ۶۳۔

خوشبو محسوس کرتے ہیں۔ غرض شاعر کے دل و دماغ میں وطن سے محبّت کا پیمانہ لبریز نظر آتا ہے۔ یہاں انسانیت کے درس کے ساتھ فلسفیانہ بصیرت بھی محسوس ہوتی ہے۔ آزاد کے مجموعے میں تقریباً پچاسی غزلیں ہیں۔ ابتدا ہی میں غزلوں کی تعداد پچھتر ۷۵ ہے۔ یہ غزلیں سنہ ۱۹۵۹ء تا سنہ ۱۹۶۰ء کے درمیان لکھی گئی ہیں۔ چند غزلیں سنہ ۱۹۶۶ء کے آس پاس کی کہی ہیں آزاد کی ان غزلوں میں پیغام زندگی بھی ہے اور جینے کا سلیقہ بھی ہے۔ زمانے کے حالات کے ساتھ مقابلہ کرنے کا عزم و حوصلہ ہے۔ ماضی پرستی ہے اور نہ روایت سے انحراف۔ آزاد کی غزلوں میں نئے حوصلے بھی ہیں، نیا انداز بھی ہے اور نئے دور کے تقاضے بھی ہیں ؎

مرے ہم نفس گیا دور جب فقط آشیانوں کی بات تھی
کہ ہے آج برق کی راہ میں مرا بھی چمن ترا بھی چمن [1]

ہیں زمیں پہ بھلا کس طرح نظر آئے
کہ آدمی تو خلا، پار کر گیا یارو!
خود اپنے نور سے ڈھونڈیں گے راستہ اپنا
اندھیری شب کے شرارو چلو یہاں سے چلیں [2]

آزاد کی غزل گوئی پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر سیّد اعجاز حسین لکھتے ہیں:

"عہدِ حاضر کے دوسرے شعراء کی طرح آزاد کے کلام پر بھی حالات و واقعات کی پرچھائیاں نظر آتی ہیں۔ نظموں کے علاوہ غزلوں میں بھی یہ خصوصیت نمایاں ہے۔ خوبی یہ ہے کہ غزل تو غزل نظم میں بھی کہیں وہ عنصر پیدا نہیں ہوتا جس کو عرفِ عام میں نعرہ بازی سے تعبیر کیا جاتا ہے جتنا بھی وہ مواد پیش کرتے ہیں یا جو خیالات وہ قلم بند کرتے ہیں سب میں اعتدال و ضبط غالب رہتا ہے۔ جس سے ان کے شعور کی پختگی اور نگاہوں کی دور رسی کا اندازہ ہوتا ہے۔

---

[1] آزاد — "بوئے رمیدہ" ص ۶۶۔ [2] ایضاً ص ۴۴۔

آزادؔ کی غزلوں میں بڑی جان ہے۔ متانت اور رمزیت نے ان کی غزلوں کو چمکا دیا ہے۔ ان کے اپنے جذبات و احساسات نے شگفتگی و دل کشی پیدا کر دی ہے۔ نظموں کی طرح غزلوں میں بھی آزادؔ نے مایوسی و قنوطیت نہیں آنے دی۔" [1]

آزادؔ کی غزلوں میں مضامین کی ندرت، صوفیانہ شاعری کے نمونے اور شوخی و ظرافت سب ہی عناصر موجود ہیں۔ ان کے کلام میں فلسفیانہ خیالات کا عکس بھی نظر آتا ہے اور عشقیہ شاعری کی لطافت بھی۔ چند اشعار ملاحظہ کیجیے ؎

چہرے پہ تبسم کی ادا کھیل رہی ہے ۔۔۔ یا پھول پہ کرنوں کی ضیا کھیل رہی ہے (بوئے رمیدہ)

اللہ رے اس شوخ کی رفتار کا عالم ۔۔۔ ہر لحظہ سنبھلتا ہوا مے خوار ہو جیسے

پا کر انھیں مائل بہ کرم اور زیادہ ۔۔۔ ہو جائیں نہ آنکھیں مری نم اور زیادہ (بوئے رمیدہ)

آزادؔ نے غزل میں غمِ جاناں اور غمِ دوراں کے امتزاج سے غزل کے حسن کو چار چاند لگا دیے ہیں۔ انھوں نے ماضی سے اپنا ناطہ نہیں توڑا۔ وصل و ہجر کی کیفیتوں سے آزادؔ کی غزلیں پُر ہیں۔ غزل کے چند اشعار نقل کیے جاتے ہیں ؎

میں ہر غمِ جہاں سے گزرتا چلا گیا ۔۔۔ اک تیرے غم نے کتنا بڑا آسرا دیا

میں ہو چلا تھا کچھ غمِ دوراں سے بے نیاز ۔۔۔ اچھا ہوا کہ تو نے مرا دل دُکھا دیا [2]

نہ جانے کون سی منزل کے آس پاس ہے دل ۔۔۔ کہ عینِ وصل کے عالم میں بھی اداس ہے دل

دشمن کو بھی اللہ دکھائے نہ کبھی وہ [3] ۔۔۔ ہوتا ہے شبِ ہجر میں جو آزاد کا عالم

ہر آرزو ہے ختم تری آرزو کے بعد ۔۔۔ اب جستجو نہیں ہے اس کی جستجو کے بعد

میں چھیڑنے لگا ہوں پھر اپنی نئی غزل ۔۔۔ آجاؤ پھر تبسمِ پنہاں لیے ہوئے

جگن ناتھ آزادؔ کی غزل گوئی پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر وجے دیو سنگھ لکھتے ہیں :

---

[1] ڈاکٹر سید اعجاز حسین۔ مختصر تاریخ ادب اردو، ص ۱۸۷۔

[2] بوئے رمیدہ، ص ۴۸۔ [3] بوئے رمیدہ، ص ۵۳۔

"آزاد کی غزل میں بھی تمام طرح کے مسائل آتے ہیں اور شاعر ان مسائل کو غزل میں کسک اور درد کی صورت میں پیش کرتا ہے جس کی مثالیں آزاد کے شعری مجموعوں سے دی جاسکتی ہیں۔ آزاد کی غزل میں تقسیمِ ہند کے حالات کا شدید دردمندانہ اور شاعرانہ ردِ عمل نظر آتا ہے"۔ [1]

۱۵؍اگست ۱۹۴۷ء کو ہندوستان آزاد ہوا مگر تقسیمِ ملک بھی عمل میں آئی۔ جوشؔ، سردار جعفری، مجازؔ، جذبیؔ اور ندیمؔ جیسے معروف ترقی پسند شاعروں کے ساتھ سیکڑوں چھوٹے بڑے شاعروں نے آزادی کا خیر مقدم اپنی شاعری سے کیا۔ ان میں آزاد بھی پیش پیش تھے۔ مگر ہندوستان اور پاکستان کے بہت سے شعراء یہ بھی محسوس کرنے لگے کہ یہ آزادی حقیقی آزادی نہیں ہے۔ کچھ اس قسم کے احساس کا اظہار تقریباً تمام شعراء نے کیا۔ آزاد کی غزلوں میں بھی اس قسم کے اشعار ملتے ہیں ؎

ماحول کی گرد سے کچھ ایسا دھندلایا حال کا آئینہ
کچھ اس میں نظر آتا ہی نہیں مستقبل انسان کا کیا ہوگا

ڈاکٹر یوسف تقی لکھتے ہیں:

"ترقی پسند شعراء جو اب تک اشتراکی نظریے کی اشاعت کے ساتھ ساتھ آزادی کے گیت لہک لہک کر گا رہے تھے اور جن کی شعلہ بیانی میں ان کے جذبات جوالامکھی کی طرح پھٹ پڑ رہے تھے جن کے سامنے حصولِ آزادی کے ساتھ ایک ایسے نظامِ حیات اور سیاست کا خوبصورت تصور تھا جس میں معاشی آزادی اور سماجی برابری کے رنگین پیکر تھے۔ حصولِ آزادی کے فوراً بعد چکنا چور ہو گئے اور نظریے کی شکستگی کے

---

[1] ڈاکٹر وجے دیو سنگھ۔ "جگن ناتھ آزاد کی شاعری پر ایک نظر" (مشمولہ "جگن ناتھ آزاد۔ حیات اور ادبی خدمات" مرتبہ خلیق انجم، ص ۶۷۔

ساتھ یہ شعرا بھی منتشر ہو گئے، کچھ پر تو سکتہ کا عالم طاری ہو گیا اور جب
ہوش آیا تو آزادی کے کھوکھلے پن کو محسوس کیا اور اس کا بر ملا اظہار
کیا جیسے میراجی، فیض، سردار جعفری اور جگن ناتھ آزاد وغیرہ"۔[1]

آزاد کے کلام میں خصوصاً "بوئے رمیدہ" کی غزلوں میں غزل کے اوصاف کا بھرپور خیال رکھا گیا ہے۔ غزل کی زبان، محاورے اور اس کی اصطلاحات، انداز اور لب و لہجے کو نہیں بھولتے۔ ان کے یہاں جہاں اخلاقی اور سیاسی مضامین ہیں وہیں عشق و عاشقی کے چرچے بھی ہیں ؎

بڑھ جائیں گے یا دوں کے ستم اور زیادہ ۔۔۔ خط لکھ کر نہ پھر سے کرو تجدید محبت

زمانہ ہو گیا میری پشیمانی نہیں جاتی[2] ۔۔۔ ترا نام آ گیا تھا بے خودی میں ایک دن لب پر

تم بات کرو اپنی، تم نے مجھے پہچانا ۔۔۔ لوگوں سے گلا کیا ہے، ہیں لوگ تو بیگانے

کوچے میں ترے آکے ترا گھر نہ رہا یاد ۔۔۔ اللہ رے یہ بے خودیِ شوق کا عالم

آزاد کے کلام میں فلسفیانہ طرزِ زندگی کی جھلک بھی نظر آتی ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

تڑپ کہیں ہو چکی تھی پیدا ظہورِ بزمِ جہاں سے پہلے
کہ اپنے جلوؤں میں خود گھرا تھا مکیں نمودِ مکاں سے پہلے

ترا کبر و ناز ہو یا ہو مرا جذبِ نیاز ۔۔۔ اصل میں ایک ہی کیفیت کی دو تصویریں ہیں

فانی ہیں جو افکار ترے تو بھی ہے فانی ۔۔۔ افکار سے انساں کو بقا بھی ہے فنا بھی

وہ جمال جس کو سمجھا میں حقیقتِ زمانہ[3] ۔۔۔ مرے تجربے نے پایا اسے اک فسانہ آخر

---

[1] ڈاکٹر یوسف تقی۔ ترقی پسند تحریک اور اردو نظم، ص ۸۴۔
[2] بوئے رمیدہ، ص ۱۲۶۔ [3] نوائے پریشاں، ص ۱۳۱۔

غزلوں میں شوخی وظرافت بھی موجود ہے۔ کہیں کہیں طنز کا عنصر بھی پوشیدہ ہے۔ دو[2] شعر ملاحظہ کیجیے ؎

زحمت نہ ہو تو اتنا بتا دیجیے گا آپ — پابندیوں میں کیسے وفا کیجیے گا آپ
ہر وقت سامنے جو رہے گا مرا خیال — کس طرح سے نماز ادا کیجیے گا آپ

آزادؔ نے اپنی غزلوں میں عمدہ تشبیہ واستعارات استعمال کیے ہیں جس کی وجہ سے کلام میں پختگی بھی ہے اور شگفتگی بھی۔ چند اشعار پیش کیے جاتے ہیں ؎

شاداب جوانی پر بچپن سا برستا ہے — یا صبح کے ہونٹوں پر غنچے کا ہے افسانہ

(بوئے رمیدہ)

سنبل سے کچھ اس طرح صبا کھیل رہی ہے — جیسے تیری زلفوں سے ہوا کھیل رہی ہے
انجام گل کی غنچۂ نورس کو کیا خبر — انجان تھا نسیم چلی مسکرا دیا

آزادؔ کی غزلیں اردو شاعری میں ہر لحاظ سے اہم اور تاریخِ ادبِ اردو کی اہم کڑی ہیں۔ جن کے بغیر اردو شاعری کی تاریخ کا باب مکمل نہیں سمجھا جائے گا۔

آزادؔ کی شاعری کی اہمیت مسلّمہ ہے۔ ان کی شاعری پر اب تک متعدد مضامین اور کتابیں مرتّب ہوئی ہیں۔ اہم اور ادبی شخصیتوں نے اُن کی شاعری کو سراہا ہے۔ انھوں نے آزادؔ کی تعریف و توصیف کسی دباؤ کے تحت نہیں کی بلکہ کھلے دل سے انھوں نے اس بات کو تسلیم کیا اور اس کا برملا اظہار کیا۔ آزادؔ اور ان کے کلام کے چاہنے والوں کی فہرست طویل ہے۔ ان کی شاعری پر جن حضرات نے تبصرہ کیا ہے ان میں یہ چند نام اہم ہیں۔ قاضی عبدالغفار، علاّمہ سیماب اکبرآبادی، جوشؔ ملیح آبادی، خالد مصطفیٰ صدیقی، ڈاکٹر وجے دیو سنگھ، ڈاکٹر محمد اجمل نیازی، صباح الدین عبدالرحمٰن، رشید حسن خاں، خواجہ احمد عباس، فراقؔ گورکھپوری، راج بہادر گوڑ، مخمور جالندھری، وقار عظیم، آل احمد سرور، عبدالمجید سالک، تیغ الٰہ آبادی، غلام رسول نازکی، ڈاکٹر ظ۔ انصاری، پروفیسر ظہیر احمد صدیقی، ایوب واقف، حمیدہ سلطان احمد، پروفیسر سید احتشام حسین، ڈاکٹر خلیق انجم، پروفیسر مسعود حسین خاں، ایم۔ حبیب خاں، مظہر امام، خواجہ غلام السیدین، اسداللہ وانی، ناز شرما پرتاپ گڑھی، ڈاکٹر

ظہور الدین وغیرہ۔ غرض یہ فہرست اتنی طویل ہے کہ اتنے نام گنانے کے باوجود ابھی بہت ساری اہم شخصیتوں کے نام رہ گئے ہیں۔ مثلاً جناب مالک رام، علامہ نیاز فتحپوری، رشید احمد صدیقی، ملک زادہ منظور احمد، ڈاکٹر یوسف حسین خاں، ڈاکٹر عبدالستار دلوی، پروفیسر شہریار، ڈاکٹر عبدالمغنی اور سیّد مقیت الحسن وغیرہ ایسے نام ہیں جنھوں نے اپنے خطوط اور مضامین میں آزاد کے کلام اور مضامین کو سراہا ہے۔ اس فہرست پر ایک نظر ڈالنے سے ہی اندازہ ہو جاتا ہے کہ آزاد کی شخصیت اور شاعری کس قدر متاثر کن ہے۔

جگن ناتھ آزاد ابتدا ہی سے اقبالؔ سے متاثر تھے۔ اس لیے ان کے کلام میں جا بجا اقبالؔ کی چھاپ نظر آتی ہے۔ آزاد اقبالؔ کے ہم وطن اور ہم زبان بھی ہیں۔ آزاد نے غزل کی دنیا میں کئی موقعوں پر اقبالؔ کے اثر کو قبول کیا ہے اور اقبالؔ کے لہجے اور پیرائے کو اختیار کرنے کی کوشش کی ہے، جس کا اعتراف اکثر ناقدین نے کیا ہے۔ ڈاکٹر سیّد مقیت الحسن لکھتے ہیں :

"اقبالؔ سے جو عقیدت و محبّت جگن ناتھ آزاد کو ہے وہ گویا ایک فطری چیز ہے۔ آزاد نہ صرف یہ کہ اقبالؔ کے ہم وطن ہیں اور وہی پنجابی بولتے ہیں جو اقبالؔ بولتے تھے، بلکہ دونوں کا پیام بھی ایک حد تک یکساں ہے۔ وہ بھی "عروج آدم خاکی" کا متمنی اور یہ بھی "عروج آدم خاکی" کا خواہاں، وہ بھی زوال آدم خاکی پہ گریاں، یہ بھی زوال آدم خاکی پہ نالاں، وہ اگر زوال انسانیت بر انسانوں کو یہ درس دیتا ہے کہ "آدمیت احترام آدمی" تو جگن ناتھ آزاد بھی کہتے ہیں ؎

زندگی بے نیاز زمان و مکاں
زندگی بے نیاز بہار و خزاں"[1]

---

[1] سیّد مقیت الحسن ۔ "آزاد کی شاعری" (مشمولہ "کتاب نما" کا خصوصی شمارہ اپریل ۱۹۹۴ء مرتبہ: ایم۔ حبیب خاں، ص ۹۲۔

ڈاکٹر منظر اعظمی لکھتے ہیں :

"اقبالؔ کے شعروں پر آزادؔ کی تضمینات جہاں ایک طرف ان کے کمالِ فن کی غماز ہیں کہ انھوں نے اقبالؔ ایسے عظیم شاعر کے شعروں کی روح کو اپنے شعری آہنگ میں اس طرح جذب کر لیا ہے کہ آزادؔ کے شعر اقبالؔ کے شعر اور اقبالؔ کے شعر آزادؔ کے شعر معلوم ہوتے ہیں۔ ان کے شعری لب و لہجے کی لَے بھی گواہی دیتی ہے کہ وہ کس مکتبۂ فکر سے زیادہ قریب ہیں ؎

محتاج و غنی میں جو تفاوت ہے مٹا دو
انساں کو انساں کا ہمدرد بنا دو
ارباب رعونت کو رعونت کی سزا دو
اٹھو مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو
کاخ امرا کے در و دیوار ہلا دو

زیادہ مثالیں دینے کی ضرورت نہیں، ان کے پورے کلام میں اقبالؔ کی تراکیب و الفاظ اور فکر و فن کے اثرات کی جھلکیاں مل جاتی ہیں۔"[1]

آزادؔ کی غزل گوئی پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر تارا چرن رستوگی رقم طراز ہیں :

"الغرض یہ خصوصیت جس کی نشاندہی اوپر کی گئی ہے معمولی صفت نہیں ہے یہی خصوصیت غزلیاتِ اقبالؔ میں بھی پائی جاتی ہے۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو یہ صفت منظم خیالات کو تنظیم جذبات میں لانے سے حاصل ہوتی ہے۔ اقبالؔ نے مولانا جلال الدین رومیؒ کو اپنا مرشد تسلیم کیا تھا اور اقبالؔ کے شعر و فکر آزادؔ کے دل و دماغ میں اس طرح سرایت

---

[1] ڈاکٹر منظر اعظمی۔ "سخن دلنواز کا عالم شاعر جگن ناتھ آزادؔ" (مشمولہ) "ارمغانِ آزاد" مرتبہ: ڈاکٹر ظہور الدین، ص ۱۱۷، ۱۱۸۔

کر گئے ہیں کہ آزاد نے اپنا مرشدِ کامل اقبال کو سمجھ لیا ہے۔"[1]

آزاد کی غزلوں میں سادگی اور اثر آفرینی ہر جگہ موجود ہے۔ ان کے تخیل میں بلند پروازی اور بیان میں روانی ہے جس سے شعر کا ہر لفظ اعتماد سے پُر نظر آتا ہے۔ وہ ایک قادر الکلام شاعر ہیں۔ ان کی شاعری کا سلسلہ جاری و ساری ہے۔ وہ خوب سے خوب تر کی تلاش میں مصروف ہیں۔ ان کا کلام ترقی کی طرف گامزن ہے۔ آنے والا کل ان کی شاعری کی عظمت کا یقین کرے گا۔ فی الوقت آزاد کی زبان میں صرف یہ کہیں گے ؂

دنیا ترے قرطاس پہ کیا چھوڑ گئے ہم
اک حسنِ بیاں، حسنِ ادا چھوڑ گئے ہم

اے اہلِ نظر ایک نظر مری غزل بھی
ممکن ہے کہ میرا ہو کچھ اندازِ بیاں اور[2]

---

[1] تارا چرن رستوگی۔ "جگن ناتھ آزاد کی غزل" (مشمولہ) سہ ماہی "لمحے لمحے" بدایوں، مدیر حبیب سوز، ص ۱۸۲۔

[2] بوئے رمیدہ، ص ۴۲۵۔

جگن ناتھ آزاد کی نظم نگاری

جگن ناتھ آزاد بنیادی طور پر نظم کے شاعر ہیں۔ بیکراں، ستاروں سے ذروں تک، وطن میں اجنبی، نوائے پریشاں، بچوں کی نظمیں، بوئے رمیدہ اور گہوارۂ علم و ہنر ان کے کلام کے مجموعوں کے نام ہیں۔

جگن ناتھ آزاد کی شاعری کی ابتدا نظم سے ہوئی۔ ان کی سب سے پہلی نظم "گلدستہ" ماہنامہ "گلدستہ" میں شائع ہوئی تھی[1] ان کی نظموں کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ آزادی سے قبل کی نظمیں اور آزادی کے بعد کی نظمیں۔ آزاد لکھتے ہیں:

"نہ جانے ۱۹۴۷ء کے کشت و خون اور اس کے بعد پیدا ہونے والے واقعات میں کیا بات پنہاں تھی کہ ایک بجلی کی طرح میرے ذہن پر چمکے اور ہمیشہ کے لیے اپنا اثر چھوڑ گئے۔ مجھے یوں احساس ہوا کہ جذبات وخیالات کے بند چشمے تھے کہ اشارہ پاتے ہی پھوٹ پڑے"۔[2]

"بیکراں" کی پہلی نظم ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کے عنوان سے ہے ؎

نہ پوچھو جب بہار آئی تو دیوانوں پہ کیا گزری ۔۔۔ ذرا دیکھو کہ اس موسم میں خزانوں پہ کیا گزری
بہار آتے ہی ٹکرانے لگے کیوں ساغر و مینا ۔۔۔ بتا اے پیر مے خانہ یہ میخانوں پہ کیا گزری

یہ پوری نظم درد سے لبریز اور پُراثر ہے۔ بعض حضرات نے اسے غزل کہا ہے۔ مگر حقیقت

---

[1] جگن ناتھ آزاد۔ میرے گزشتہ روز و شب، ص ۱۹۔ [2] ایضاً، ص ۱۱۔

یہ ہے کہ یہ غزل نما نظم ہے جس میں واقعات کا تسلسل ہے۔ نظم درد انگیز اور پُر اثر ہے خصوصاً جب ہم ۱۹۴۷ء کے واقعات کو سامنے رکھ کر اس نظم کا مطالعہ کریں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاعر نے پوری تاریخ کے صفحات سامنے رکھ دیے ہیں۔

"بیکراں" کی نظموں میں "پس پردہ" "نئی محفل"، وطن میں آخری رات اور آزادی کے بعد آزادی کی نظمیں ہیں۔ ان نظموں میں وطن سے جدائی کا احساس شدت سے موجود ہے۔ یہ احساسات محض خیالی نہیں ہیں بلکہ حقیقی ہیں۔ کیوں کہ آزاد نے اپنی آنکھوں سے خون کی ندیاں بہتے ہوئے دیکھی ہیں۔ نظم "پس پردہ" کے اشعار ملاحظہ کیجیے ؎

خبر نہ تھی بہار جس کی آرزو چمن کو ہے
بہار جس کی جستجو چمن کے بانکپن کو ہے
بہار جس کا انتظار سنبل و سمن کو ہے
جب آئے گی تو موج زہرناک ساتھ لائے گی
خزاں کی طرح آئے گی چمن میں پھیل جائے گی [۱]

ہندوستان اور پاکستان کے فسادات و ہجرت کے بارے میں متعدد شعراء نے اشعار اور نظمیں کہی ہیں مگر آزاد کا انداز منفرد اور جداگانہ ہے۔ نظم "نئی محفل" میں یہ انداز ملاحظہ کیجیے ؎

ہم اپنی انجمن کو بھول جائیں بھی تو کیا ہوگا	نئی محفل کو ہم اپنا بنائیں بھی تو کیا ہوگا
چمن بدلا، چمن کا رنگ بدلا باغباں بدلے	یہاں اب ہم پرانے گیت گائیں بھی تو کیا ہوگا
تو گہری نیند میں ہے جاگنا آساں نہیں تیرا	ہم اے مُردے ترے شانے ہلائیں بھی تو کیا ہوگا
جنھیں ذوقِ نظر بخشا گیا تھا ہو چکے رخصت	ہم اب تارے فلک کے توڑ لائیں بھی تو کیا ہوگا

ہندوستان کی آزادی کے بعد ملک دُو حصّوں میں منقسم ہو گیا۔ عوام نے آزادی کے ساتھ جو سنہرے خواب دیکھے تھے وہ بھی پورے نہیں ہوئے۔ آزاد اپنے وطن سے نکالے گئے۔ اس لیے آزاد کی نظموں میں غریب الوطنی کا احساس شدت کے ساتھ موجود ہے ؎

---

[۱] جگن ناتھ آزاد ۔ بیکراں، ص ۲۶۔

خیال تھا کہ ظلمتوں سے ہم رہائی پائیں گے
خیال تھا کہ اپنے گھر کو اپنا گھر بنائیں گے
خیال تھا کہ مل کے جشنِ دورِ نو منائیں گے
خیال تھا کہ زندگی نجات غم سے پائے گی

مگر یہ امیدیں کبھی پوری نہیں ہوئیں۔ ایک ظلمت سے نکل کر انسان دوسری تاریکی میں ڈوب گیا۔ آزادی کے بعد ملک اور قوم پر جو بیتی اور گزری آزاد اس کے بارے میں عوام کے ترجمان نظر آتے ہیں ؎

دیدۂ شوق نے سمجھا تھا کہ طوفان گئے — زندگی ایک سکوں پائے گی ہیجان کے بعد
لیکن اے آرزوئے دید ذرا غور سے دیکھ — کتنے طوفان نمودار ہیں طوفان کے بعد

آزاد کا دوسرا مجموعۂ کلام "ستاروں سے ذرّوں تک" ہے۔ اس مجموعۂ کلام میں پہلی نظم "میرا موضوعِ سخن" ہے۔ اس طویل نظم میں ۲۹ بند ہیں۔ آزاد کی اس نظم میں جذبات کا بے پناہ بہاؤ ہے۔ نظم کے ہر شعر پر خلوص کی مہر لگی ہوئی ہے۔ آزاد نے موجودہ دور کے تہذیب و تمدن کے کھوکھلے دعویداروں کی نقاب کشائی کی ہے۔ آزاد نے اپنی اس نظم میں اپنا نقطۂ نظر واضح طور پر پیش کیا ہے۔ ایک بند ملاحظہ کیجیے ؎

تری تنقید مرے فن پہ بجا ہے، لیکن — شور برپا ہو تو انسان نہیں ہو سکتا
جب تک اے دوست یہی ہے مری دنیا کا نظام — مرا موضوع بھی تبدیل نہیں ہو سکتا
فقط اک مُردہ و بے رنگ تنوّع کے لیے — اپنے مقصد کو مرا فکر نہیں کھو سکتا
باغ میں پھول کے کھلنے کی تمنّا لے کر — اپنے ہاتھوں سے میں کانٹے تو نہیں بو سکتا[۱]

نظم شروع سے آخر تک پڑھیے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابتدا تو ہلکے سے تموّج سے ہوئی تھی لیکن رفتہ رفتہ ایک مہیب طوفان برپا ہو گیا۔ تیغ الٰہ آبادی (مصطفیٰ زیدی مرحوم) لکھتے ہیں:

---

۱ جگن ناتھ آزاد۔ ستاروں سے ذرّوں تک، ص ۲۲۔

"آزاد کے ہر شعر پر آزاد کی زندگی کے خلوص کی مہریں لگی ہیں۔ اس کی
سب سے اچھی مثال 'میرا موضوعِ سخن' ہے۔" [1]

"میرا موضوعِ سخن" آزاد کی بہترین نظم ہے جس میں آزاد نے انسانیت کے پیغام کو عام کیا ہے۔ آزاد کے جذبات میں اخلاص اور سچائی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر شعر میں کشش کا احساس شدت کے ساتھ پایا جاتا ہے۔ روشن اختر کاظمی اس نظم کے بارے میں لکھتی ہیں :

"میرا موضوعِ سخن، ایک ایسی طویل نظم ہے جس میں آزاد نے تہذیب و تمدن کے ان دعویداروں کی نقاب کشائی گئی ہے جو دراصل انسانیت کے لیے باعثِ ننگ ہیں۔ جن لوگوں نے آزادیِ وطن کو ذاتی منفعت کا ذریعہ بنا رکھا ہے، یہ نظم تازیانۂ عبرت ہے۔" [2]

"میرا موضوعِ سخن" کے علاوہ اس مجموعہ میں اے امیرِ کارواں، زندگی، جشنِ آزادی، عزائم، جب حجابات اٹھے، ایک دوست کے نام اور مرتی ہوئی سچائی، وغیرہ خوبصورت اور انتہائی معیاری نظمیں ہیں۔ ۱۹۴۷ء کی زد پر آنے والے واقعات کا پورا نقشہ نظم "جشنِ آزادی" میں ملتا ہے جو کسی "جشنِ آزادی" کی دعوت نامے کا جواب ہے۔ اسی طرح نظم "عزائم" میں بلند حوصلگی اور اولوالعزمی کی دعوت دی گئی ہے۔ اشعار ملاحظہ کیجیے ؎

اس جہاں اور اس جہاں کی تلخیوں کے روبرو — رقص کرتے جائیں گے ہم مسکراتے جائیں گے
راہ میں گر حادثے آتے ہیں آنے دو انھیں — حادثوں پر قہقہے پیہم لگاتے جائیں گے [3]

نہایت ہی سیدھے سادے الفاظ میں شاعر ایک طرف صبر کی تلقین کرتا ہے تو دوسری طرف امید کی کرنیں نئی اور خوشحال زندگی کا پیغام دیتی ہیں ؎

---

[1] تیغ الہ آبادی۔ "آزاد کا نیا مجموعۂ کلام (مشمولہ) جگن ناتھ آزاد اور اس کی شاعری" مرتبہ حمیدہ سلطان احمد ص ۲۵۳۔

[2] روشن اختر کاظمی۔ "جگن ناتھ آزاد کی طویل نظمیں" (مشمولہ) سہ ماہی "لمحے لمحے" بدایوں، ص ۱۸۹۔

[3] آزاد۔ ستاروں سے ذروں تک، ص ۱۰۶۔

اپنے اشکِ گرم و آہِ سرد کی تاثیر سے　　خرمنِ ہستی کی آتش کو بجھاتے جائیں گے
اس جہاں کو بخش کر اے دوست! جنت کا جمال　　قہقہے جنت کی دنیا پر لگاتے جائیں گے

نظم "جشنِ آزادی" میں آزاد کہتے ہیں ؎

مجھے کیا پھر نویدِ جشنِ آزادی سناتے ہو
ابھی تک میں وہ پہلا جشنِ آزادی نہیں بھولا

آزاد جشنِ آزادی کا نام سنتے ہی تمام واقعات یاد کرنے لگتے ہیں۔ قتل و غارت گری، لوٹ مار، کشت و خوں کی ندیاں جیسے مناظر سامنے آنے لگتے ہیں۔ آزاد اس پُر آشوب دور کا پورا نقشہ کھینچتے چلے جاتے ہیں ؎

نشیمن جل اٹھے شاخیں گریں اشجار سے کٹ کر　　چمن اندر چمن اک آتشیں رو چل گئی گویا
ادھر صیاد پھرتے تھے اُدھر صیاد پھرتے تھے　　کچھ اس انداز سے میرے گلستاں میں بہار آئی
اِدھر بھی آگ بھڑکی تھی اُدھر بھی آگ بھڑکی تھی　　زمینِ باغ پر یوں رحمتِ پروردگار آئی
نظامِ زندگی میں کچھ ایسا انقلاب آیا　　مکانوں کے مکیں بدلے مکینوں کے مکاں بدلے

بھڑکتی آگ دیکھی ہر جگہ، کٹتے بشر دیکھے　　نقیب تھا اشرف المخلوق کا جذبِ بہیمانہ
لہو کی ندیوں میں ہر طرف بہتی ہوئی دیکھی　　حقیقت وہ جس سے مات کھا جائے ہر افسانہ[1]

۱۴، ۱۵ راگست ۱۹۴۷ء کی درمیانی شب کو ریڈیو پاکستان سے آزاد کا ترانۂ پاکستان پڑھا گیا۔ آزاد ذہنی طور پر بالکل آمادہ نہیں تھے کہ وہ ہند و پاک کو الگ الگ ملک مانیں مگر وقت انسان کے ہر زخم کو بھر دیتا ہے۔ نظم "سیرِ پاکستان" میں ان کی وطن دوستی، خلوص اور والہانہ کیفیت کا اظہار ہوتا ہے۔ کہتے ہیں ؎

چھوڑی ہوئی انجمن میں واپس آیا　　مہجورِ وطن وطن میں واپس آیا
اے اہلِ چمن! چمن میں اعلان کرو　　شیدائے چمن، چمن میں واپس آیا

---

[1] آزاد۔ ستاروں سے ذروں تک، ص ۶۵، ۶۶، ۶۷۔

آزاد کو پاکستان کے دوست احباب نے قدر کی نگاہ سے دیکھا۔ ان سے وہ بے حد متأثر ہوئے۔ اپنے تأثرات کو انھوں نے اس طرح لفظ کا پیکر پہنایا ہے۔ نظم "واپس آتے ہوئے" میں کہتے ہیں ؎

گزرے ہوئے دن یاد دلانے والو! ہشیار کو دیوانہ بنانے والو!
آزاد کو گفتگو کا یارا ہی نہیں آزاد کو آنکھوں پہ بٹھانے والو!

نظم کے آخر میں کہتے ہیں ؎

آزاد کو رکھا نہ کہیں کا تم نے
یوں لطف و کرم سے اس کو برباد کیا [1]

آزاد ترقی پسند تحریک سے متأثر ضرور ہوئے مگر ان پر اس تحریک کا کبھی غلبہ نہ ہو سکا۔ اس زمانے میں اشتراکیت بھی کافی زور لیے ہوئے تھی۔ مگر آزاد اشتراکیت کی کمزوریوں پر نظر رکھے ہوئے تھے۔ ان کو معلوم تھا کہ جب تک انسان مالی اعتبار سے ایک دوسرے کو مساوات کا درجہ نہ دے یا دل سے ایک دوسرے کو مساویانہ درجہ نہ دے اس وقت تک صرف زبان گفتگو بے فیض ہے۔ چنانچہ اشتراکیت کی اس کشمکش کو آپ آزاد کی نظم "جب حجابات اٹھے" میں پڑھ سکتے ہیں ؎

ہم نے یہ سمجھا کہ اغیار کا اب دور گیا
آتشی آئی ہے پیکار کا اب دور گیا

مگر جب حجابات کے پردے اٹھے تو وہاں کچھ اور ہی ظاہر ہوا ؎

ہر طرف ایک تظلم سے تھا کہرام بپا
اضطرابات کی اک گونج تھی بے طور بلند
بھوک کا شور تھا پہلے سے بھی کچھ اور بلند
یہ مساوات کا نقشہ بھی عجب نقشہ تھا

---

[1] جگن ناتھ آزاد ۔ ستاروں سے ذروں تک، ص ۷۵۔

سرمایہ داروں نے ہمیشہ ہی مزدوروں کا خون چوسا، مساوات کے صرف نعرے لگائے۔ عملی جامہ پہنانے کے لیے کسی نے بھی قدم نہیں اٹھایا۔ یہی وجہ ہے کہ آزاد نے اس لفظی مساوات کے خلاف نعرہ بلند کیا ؎

ایک ہی لحظے میں نعروں کا بھرم ٹوٹ گیا

یہ مساوات کے نعرے تھے فقط جھوٹ ہی جھوٹ
نظر آتی تھی ہر اک سمت بس اک لوٹ ہی لوٹ [۱]

آزاد کی نظموں کے بارے میں ڈاکٹر روشن اختر کاظمی لکھتی ہیں :

"آزاد کی نظموں میں کسی مخصوص سیاسی نظریہ کی بازگشت نہیں ملتی ہے انھیں زندگی کی اعلیٰ و ارفع قدروں سے پیار ہے خواہ وہ قدیم ہوں یا جدید۔ آزاد سے غریبوں اور مفلسوں یا پسماندہ طبقوں کی عکاسی نہیں کی ہے لیکن اس کے باوجود انھیں ہر انسان سے محبت ہے اور ان کا ذہن ہر قسم کے تعصبات سے پاک ہے وہ ماضی کی عظمتوں کا احساس رکھتے ہیں لیکن حال کی طرف سے بھی انھوں نے کبھی غفلت نہیں برتی۔ یہی سبب ہے کہ ان کی شاعری عصری آگہی کا بہترین نمونہ ہے۔" [۲]

آزادی کے بعد اکثر شعراء نے اس بات کا شدت سے احساس کیا کہ یہ وہ آزادی نہیں ہے جس کا انھوں نے خواب دیکھا تھا۔ آزاد نے بھی اس بات کا شدت سے احساس کیا۔ ان کی نظموں میں بھی اس طرح کے احساسات پائے جاتے ہیں۔ ابو محمد سحر لکھتے ہیں :

"اردو کے بعض شعراء کچھ تو ملکی حالات سے دل گرفتہ ہو گئے اور کچھ انھوں نے سیاسی مصلحت اندیشی میں بڑے غلو سے کام لیا چنانچہ

---

[۱] جگن ناتھ آزاد۔ ستاروں سے ذروں تک، ص ۸۲ ـ ۸۴۔

[۲] ڈاکٹر روشن اختر کاظمی۔ اردو میں طویل نظم نگاری کی روایت اور ارتقا، ص ۱۲۴۔

آزادی ان کے نزدیک تاریکی اور فریب قرار پائی۔ لیکن بعض دوسرے شاعروں نے محسوس کیا کہ اس میں آزادی کا قصور نہیں۔ انھوں نے جہاں انسانیت سوز مظالم اور افسوسناک حالات کے خلاف آواز اٹھائی وہاں آزادی کا خیر مقدم بھی کیا۔ پہلے نقطۂ نظر کی نمائندگی اس موضوع پر فیض، سردار جعفری، اختر الایمان، ساحر، جاں نثار اختر، تاباں اور جگن ناتھ آزاد کی نظموں سے ہوتی ہے۔"[1]

آزاد شاعری کو محض تفریحِ طبع کی چیز نہیں سمجھتے۔ "میرا موضوعِ سخن" اور "ایک دوست کے نام" جیسی نظموں میں وہ واضح الفاظ میں شعرا و ادبا کو مشورہ دیتے ہیں ؎

مائل خواب نہ ہو جاگ اٹھے بزم جہاں | اپنے نغمات سے پیدا نئی جھنکار کریں
آدم آدم کا نئے دور میں غمخوار نہیں | آکہ انساں کو انساں کا غمخوار کریں
اپنا پیغام زمانے کو سنانے کے عوض | تاج اور تخت بھی ملتے ہوں تو انکار کریں[2]

آزاد کی متعدد نظمیں اس بات کی نشاندہی کرتی ہیں کہ وہ اردو زبان کو ہندو اور مسلمان کی ملی جلی تہذیب سمجھتے ہیں۔ ان کی مادری زبان پنجابی ہے مگر اوڑھنا بچھونا اردو ہے اور وہ اس زبان سے پیار کرتے ہیں۔ چنانچہ اپنے خیالات کا اظہار انھوں نے کئی موقعوں پر کیا ہے۔ اردو کے متعلق اشعار ملاحظہ کیجیے ؎

اے اہلِ وطن! یہ داستاں اپنی ہے | اپنی ہے یہ روداد، فغاں اپنی ہے
کیوں اس کو مٹا رہے ہو اے دیوانو! | غیروں کی نہیں ہے یہ زباں اپنی ہے
اردو ہے فقط زبان کہسار نہیں | اک موج شمیم ہے یہ تلوار نہیں

آزاد کی ایک طویل نظم کا نام "اردو" ہے۔ اب تک اس کے کئی اڈیشن کتابچے کی شکل میں شائع ہو چکے ہیں۔ ۱۹ ستمبر ۱۹۵۰ء کو اردو مجلس دہلی کی پہلی سالگرہ کی تقریب میں (جب کہ تقسیم ہند کے بعد پہلی بار دہلی میں انجمن ترقی اردو (ہند) کی شاخ قائم ہوئی تھی) آزاد نے اس نظم کو ڈیکوز ہال میں پڑھی۔

---

[1] ابو محمد سحر۔ "تنقید و تجزیہ" ص ۱۲۴۔ [2] آزاد ستاروں سے ذروں تک، ص ۸۷، ۸۸، ۹۰۔

نظم کے شروع میں اردو کی بتدریج ارتقا کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس کے بعد لسانی اختلافات کی وجہ سے دلوں میں جو نفرت و عداوت پیدا ہوئی اس کا ذکر ہے۔ کہتے ہیں ؎

غلط ہے جو سمجھتا ہے اسے اغیار کی بولی
یہ ہے اخلاص کی طرزِ تکلم پیار کی بولی

آزاد کی نظر میں "اردو" ہندو اور مسلمان کی مشترکہ تہذیب کی نشانی ہے۔ جس طرح اردو کے پروان چڑھانے میں مسلمان شعراء و ادبا کا ہاتھ ہے اسی طرح بے شمار ہندو شاعر و ادیب نے اردو کی ترقی و بقا کے لیے کام کیا ہے۔ جن کی مادری زبان اردو ہے یا پھر جنھوں نے اردو زبان کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیا ہے۔ آزاد اپنے معترض کو یہ کہتے ہوئے بزم اردو میں لے جاتے ہیں ؎

ذرا اے معترض! اک لمحہ کی زحمت گوارا کر
مرے ہمراہ آ اور بزمِ اردو کا نظارا کر

اس کے بعد سارے ہندو شعراء و ادبا کے ناموں کی فہرست سامنے رکھ دیتے ہیں۔ ان میں سے چند نام یہ ہیں، مہاراج بہادر برقؔ، برج نرائن چکبستؔ، پنڈت رتن ناتھ سرشارؔ، دیا شنکر نسیمؔ، رگھوپتی سہائے فراقؔ، تلوک چند محرومؔ، عرشؔ ملسیانی، پریم چند، کرشن چندر، مہاراجہ کشن پرشاد، امر ناتھ ساحرؔ، بلونت سنگھ، علامہ پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفیؔ، اور خود جگن ناتھ آزاد وغیرہ۔

"وطن میں اجنبی" جگن ناتھ آزاد کا تیسرا مجموعۂ کلام ہے۔ یہ ایک طویل تمثیلی نظم ہے جو چار سال یعنی ۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۰ء تک کا احاطہ کرتی ہے۔ اس مجموعے کی تمام نظمیں ایک خاص قسم کا جذبہ رکھتی ہیں۔ ۱۹۴۷ء کے بعد ہندوستان میں فساد، آپس کی لوٹ مار اور قتل و غارت گری کی داستان اس مجموعہ میں ملتی ہے۔ ہندوستان اور پاکستان کی تقسیم کے بعد جگن ناتھ آزاد کو اپنا آبائی وطن چھوڑنا پڑا۔ اس بات کا احساس اس مجموعے کی بیشتر نظموں میں پایا جاتا ہے۔ یہ مجموعۂ کلام کیا ہے۔ ایک تاریخ ہے، ایک ایسی تاریخ جس کا مؤرخ انتہائی شریف النفس اور غیر متعصب شاعر بھی ہے اور ادیب بھی۔

وہ اپنے خیالات کو بہ حسن و خوبی شعری پیکر میں ڈھالتے ہوئے آگے بڑھتا ہے۔ شاعر کا دل زخمی ہے۔ دل میں گہرا صدمہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آواز میں سوز و گداز ہے۔ پنجاب کے خونی واقعات کو یاد کرتے ہوئے آزاد کہتے ہیں ؂

ہندو نے لیا وید کی عظمت کا سہارا قرآں کے تقدس کو مسلماں نے پکارا
سکھ دھرم سے ہو دور کہاں اس کو گوارا یوں سب کے زمانے میں مذہب کا اجارا
فردوس میں ان سب نے جہنم کو بسایا پنجاب میں سامانِ قیامت نظر آیا

مٹی ہوئی تقسیم، محبت ہوئی رخصت اخلاص گیا مہر و مروت ہوئی رخصت
چہروں سے ہنسی دل سے صداقت ہوئی رخصت پنجاب کی دیرینہ شرافت ہوئی رخصت

انسان انسان کے خون کا پیاسا تھا۔ ہر طرف درندگی اور وحشت کا عالم تھا سڑکوں پر لاشوں کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ آزاد نے فسادات کا مکمل نقشہ کھینچ دیا ہے جس سے کہ رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں ؂

مردے تھے پڑے سڑکوں پہ انبار در انبار معصوموں کی لاشوں سے بھرے کوچہ و بازار

ریلیں ہیں کہیں سیلِ حوادث کا ٹھکانہ بستے ہوئے ہنستے ہیں گھر بم کا نشانہ[1]

بوڑھے تھے کہ بچے تھے نہ تھا ان میں کوئی فرق انسانیت اک خون کے سیلاب میں تھی غرق
تھا اک جہنم کا نمونہ چمن شرق یوں برق و گل و بار پہ تھی شعلہ فشاں برق

آزاد انسانیت کے علم بردار ہیں۔ ایسے پُر آشوب دور میں بھی ان کی انسان دوستی پامال نہیں ہوئی۔ وہ ہندو، مسلمان، سکھ اور عیسائی ہر مذہب کے لوگوں سے یکساں محبت کرتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ ہندوستان کی خوبصورتی اسی میں ہے کہ اس میں ہر مذہب کے لوگ رہیں۔ چنانچہ تباہی کے المناک واقعات سنانے کے بعد کہتے ہیں ؂

---

[1] آزاد — وطن میں اجنبی، ص ۳۲، ۳۴۔

آزاد! کہاں تک یہ الم ریز ترانہ — اپنا ہی چمن زار تھا، اپنا ہی نشانہ

روداد یہی کچھ ہے اب اے اہلِ زمانہ — پنجاب ہے اک دورِ گزشتہ کا فسانہ

اس خاک میں پہلی سی تب و تاب نہیں ہے — دو آب ہے، سہ آب ہے، پنجاب نہیں ہے

آزاد کی نظر میں پنجاب دراصل پنج آب کی وجہ سے خوب صورت تھا۔ اب اس میں وہ تب و تابی نہیں ہے ؎

اب روحِ وطن محفلِ پنجاب کہاں ہے
پیکر تو ہے لیکن دلِ پنجاب کہاں ہے

آزاد کی دلی کیفیات کا اظہار عبدالمجید سالک اس طرح کرتے ہیں:

"جگن ناتھ آزاد ایک ایسا نہال تھا جو میانوالی کے سنگلاخ اور پنجاب ہی کے میدانوں میں پوری نشو ونما پا سکتا تھا۔ لیکن حالات کے باغباں نے اس کو یہاں سے اکھاڑ کر دہلی میں لگا دیا۔ بعض پودے ناموافق آب و ہوا میں پروان تو چڑھ جاتے ہیں لیکن دورانِ نشو ونما کبھی وہ مرجھا جاتے ہیں، کبھی وہ کمھلائے ہوئے نظر آتے ہیں۔"[1]

وطن کی جدائی کا احساس شاعر کو کبھی مایوس کر دیتا ہے اور کبھی اسے امید کی کرن نظر آنے لگتی ہے۔ شاعر کی نظر سے وہ خونی سماں دور نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ خوف کھایا ہوا نظر آتا ہے ؎

کب فصلِ بہار آئی تھی یہاں، کب برق گری، کچھ یاد نہیں
لیکن اب تک ان شعلوں سے ماحولِ گلستاں روشن ہے
اپنی نظر کا کیا علاج اپنی نظر کو کیا کروں؟
اپنے چمن کو چھوڑ کر جم نہ سکی کہیں نظر[2] (افکارِ پریشاں)

شاعر سوچنے لگتا ہے کہ پھر وہ اپنے وطن کو دیکھ پائے گا کہ نہیں؟ دوست احباب سے

---

[1] عبدالمجید سالک۔ تعارف (مشمولہ) وطن میں اجنبی، ص ۱۲۔ [2] آزاد۔ وطن میں اجنبی، ص ۴۵، ۴۷۔

کبھی ملاقات ہوگی کہ نہیں ؟ اچانک سرحد پار سے اسے پیغام پہنچتا ہے اور امید کی ایک کرن دکھائی دینے لگتی ہے۔ اپنی امید و بیم کی کشمکش میں آزادؔ اپنے دل کو تسلّی دیتے ہیں۔ کہتے ہیں ؎

میں ہوں وہ پھول کہ اب جس کی تمنّا یہ ہے
نو بہاروں کے زمانے نہ کریں یاد مجھے
عیش زنداں سے تو انکار نہیں ہے لیکن
چین لینے جو نہ دے فطرت آزادؔ مجھے[1]

شاعروں و ادیبوں کی دعوت پر آزادؔ نے متعدّد بار پاکستان کا سفر کیا ہے۔ ایک سفر کے وقت وہ یہ کہتے ہوئے پاکستان کی طرف بڑھ جاتے ہیں ؎

اے مری ارض وطن اے ارض پاک — قلب عالم کی ضمیر تابناک
اے وطن ! اے فخر اقطاع جہاں — خاک تری سجدہ گاہِ قدسیاں

جس طرح ماں اپنے بچّے کو الگ الگ ناموں سے پکار کر اپنی محبّت کا اظہار کرتی ہے۔ شاعر بھی اسی طرح اپنی محبّت کا اظہار کرتا ہے۔ اس کے دل میں محبّت کا سمندر موجزن ہو جاتا ہے اور وہ اس وطن کو کبھی "ارض پاک" کہتا ہے اور کبھی "فخر اقطاع جہاں"، "ہیر رانجھا کی زمین" یا پھر سوہنی مہیوال کی بزم حسیں کہہ کر پکارتا ہے۔ اس کے بعد وہ وطن کے تمام بزرگوں کو یاد کرتا ہے پھر وہ خود کے بارے میں کہنے لگتا ہے کہ وہ بھی اسی مقدس سرزمین کا ہی ایک گُل ہے ؎

میں کہ ترا ہی گل صد پارہ ہوں — نکہتِ گُل کی طرح آوارہ ہوں
دشت غربت میں وطن سے دور ہوں — پھول ہوں اپنے چمن سے دور ہوں
(بازگشت[2])

وطن میں پہنچ کر شاعر کے دل میں طرح طرح کے خیالات آنے لگتے ہیں۔ وہ جہاں جا رہا ہے اس کی قدر ہوگی بھی یا نہیں۔ وہاں لوگ پہچانیں گے یا نہیں۔ اسی تذبذب میں وہ کہتا ہے ؎

---

[1] آزادؔ — وطن میں اجنبی، ص ۴۹۔ [2] ایضاً ص ۵۹۔

وطن میں ایک غریب الدیار آتا ہے — خدا کرے کہ اسے یاں کوئی نہ پہچانے
دیارِ غیر میں اپنوں کی جستجو کیسی؟ — عزیز و خویش و اقارب تمام بیگانے
(واہگہ کی سرحد پر)[1]

مگر جیسے ہی وہ سرحد پار کر کے دوست احباب سے ملتا ہے اس کی یہ غلط فہمی دور ہو جاتی ہے۔ شاعروں اور ادیبوں نے اسے سر پر بٹھایا۔ کہتے ہیں ؎

میں سمجھتا تھا وطن ہے میرے غم سے بے خبر
ارضِ پاکستان تڑپ اٹھی مری فریاد پر (غلط فہمی)[2]

نظم "شکوۂ پاکستان" میں "ارض پاک کی روح" آزاد سے شکایت کرتی ہے کہ وہ اپنے آبائی وطن کو بھول گیا۔ وہ اپنے آبائی وطن کو واپس آجائے ؎

ان اپنی انجمن آرائیوں کی تجھ کو قسم
پھر اپنی اجڑی ہوئی انجمن کو واپس آ

آزاد اس روح پاک کو جواب دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ میری نظر نے بارہا دھوکا کھایا۔ اس طرح پہلے بھی ایک بار وطن پہ بہار آئی تھی اور اس کے بعد وطن کا اجڑنا میری نظر میں موجود ہے ؎

سرابِ دشت دھوکے دیے ہیں بارہا پھر بھی
نظر میں ہے ابھی رنگِ طلسمات چمن اپنا

نظم کے آخر میں کہتے ہیں ؎

ترے ماحول میں پھر ان دنوں رقصِ بہاراں ہے
یہی تیور تھے موسم کے جب اجڑا تھا چمن اپنا (جوابِ آزاد)[3]

آزاد جب لاہور جاتے ہیں تو "لاہور" کی تعریف میں ایک نظم کہتے ہیں۔ اس کے بعد لاہور میں کہے ہوئے اشعار ہیں۔ لاہور میں ایک لمحہ، پھر اقبال کے مزار پر جاتے ہیں،

۱؎ آزاد۔ وطن میں اجنبی، ص ۶۰، ۶۱۔ ۲؎ ایضاً ص ۶۱۔ ۳؎ ایضاً ص ۶۴۔

وہاں سے "لائل پور کے مشاعرے" میں شریک ہوتے ہیں پھر "جشنِ آزادی" کی دعوت کا جواب دیتے ہیں۔ اس کے بعد راولپنڈی میں قیام کرتے ہیں۔ یہاں ایک منزل ختم ہوکر دوسری منزل شروع ہوتی ہے۔ وہ ایک دعوت پر کلکتہ سے ڈھاکہ کے لیے روانہ ہوتے ہیں۔ پھر ڈھاکہ سے چٹاگانگ، ہر مقام آزاد کو متاثر کرتا ہے اور وہ نظم کہتے ہوئے آگے بڑھتے ہیں۔ پھر حفیظ جالندھری سے مخاطب ہوتے ہیں۔ یہاں حفیظ کی غزل اور حفیظ کی غزل پر محروم کی تضمین اس مجموعۂ کلام میں شامل کی گئی ہیں۔ وہاں سے پھر واپس راولپنڈی۔ تیسری منزل کی شروعات ہوتی ہے۔ لاہور میں قتیل شفائی اور سر عبدالقادر سے روحانی ملاقات کرتے ہیں اور پھر عقیدت سے مزارِ اقبال پر حاضری دیتے ہیں۔ مزارِ تاجور پر روحِ تاجور سے ہم کلامی کرتے ہیں۔ اس کے بعد عالم خیال میں ملاقاتوں کا سلسلہ سجّاد ظہیر سے شروع ہوکر ظہیر کاشمیری پر ختم ہوتا ہے۔ آزاد پھر "کراچی کے مشاعرے" میں۔ سمندر کے کنارے ہوتے ہوئے آخر میں "سخنے بہ پاکستان" پر طویل نظم "وطن میں اجنبی" کے اس حصّے کا اختتام کرتے ہیں۔ اس مجموعۂ کلام کے متعلق عبدالمجید سالک لکھتے ہیں:

> "اس کتاب میں بظاہر آزاد کی متعدد نظمیں جمع کی گئی ہیں لیکن جو روح مسلسل ان میں جاری و ساری ہے اس کے اعتبار سے یہ متعدد نظمیں نہیں ہیں بلکہ ایک طویل نظم ہے جس کے مختلف حصّے مختلف بحروں اور مختلف زمینوں میں موزوں ہو گئے ہیں۔ ہر بحر اور ہر زمین شاکے ہنگامی جذبہ و احساس کا پتہ دیتی ہے"۔ [۱]

آزاد کی ان نظموں میں ایک خاص قسم کا جذبہ شروع سے آخر تک موجود ہے۔ کہیں وطن سے دوری کا احساس ہے تو کہیں دوست احباب سے بچھڑنے کا غم، تو کہیں بزرگوں سے عقیدت و احترام۔ خواجہ غلام السیّدین ان نظموں کے متعلق لکھتے ہیں:

"اس مجموعے کی تمام نظموں میں ایک خاص کیفیت اور جذبہ جاری و

---

[۱] عبدالمجید سالک۔ تعارف (مشمولہ) "وطن میں اجنبی" آزاد، ص ۱۲ طبع اوّل۔

ساری ہے خواہ وہ سرزمینِ پنجاب کو الوداع ہو۔ یا پُرانے دوستوں سے خطاب یا اقبال کی بارگاہ میں نذرِ عقیدت یا پاکستان کو پیام، ایک حسّاس شاعر جس کے قدم تقسیمِ ہند کے المیوں کے باوجود محبّت اور شرافت کے راستے سے نہیں بھٹکے، کئی سال کے بعد اپنے قدیم وطن پاکستان میں ایک اجنبی کی حیثیت سے آتا ہے اور دل میں جذبات کا ایک طوفان لے کر آتا ہے جو شعر میں خلوص اور محبّت کے موتی بن کر چمکتے ہیں اور اس کی آنکھ میں آنسوؤں کی شبنم میں ڈھل جاتے ہیں۔" [۱]

قتل و غارت گری کے اس پُر آشوب دور میں آزاد انسانیت کا پیغام سناتے پھرتے ہیں۔ ان کے اشعار میں سچّی تصویر اور پُر اثر عکس ہے۔ پورا مجموعۂ کلام خلوص و محبّت سے لبریز ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سننے والا متأثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

"نوائے پریشاں" جگن ناتھ آزاد کا چوتھا مجموعۂ کلام ہے۔ ۱۹۵۰ء سے ۱۹۵۱ء تک کا کلام ہے۔ ہندوستان اور پاکستان دونوں جگہوں میں اس کے بھی کئی اڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ ہندوستان میں ادارۂ انیس اردو الٰہ آباد نے ۱۹۶۱ء میں پہلی بار شائع کیا۔ دوسرا اور تیسرا اڈیشن پاکستان میں مکتبۂ علم و دانش، مزنگ لاہور نے ۱۹۷۳ء اور ۱۹۹۲ء میں شائع کیا۔ سیّد احتشام حسین نے مقدمہ میں لکھا ہے۔ جنرل سکریٹری ادارۂ انیس اردو الٰہ آباد مفتی فخر الاسلام ایڈوکیٹ نے جگن ناتھ آزاد اور ان کی شاعری پر اظہارِ خیال کیا ہے۔ پاکستانی اڈیشن کی طباعت نہایت عمدہ ہے۔ آزاد نے اپنے مجموعۂ کلام کا نام علامہ اقبال کے اس شعر پر رکھا ہے ؎

مری نوائے پریشاں کو شاعری نہ سمجھ
کہ میں ہوں محرمِ رازِ درونِ مے خانہ

---

[۱] خواجہ غلام السیدین۔ پیش لفظ (مشمولہ) "وطن میں اجنبی" آزاد۔ ص ۱۹، طبع دوم۔

اس مجموعۂ کلام میں جمنا کے کنارے، اے کشورِ ہندوستاں، طلوع، ایک لمحہ گولکنڈہ کے مقبروں میں۔ دہلی کی جامع مسجد، بھارت کے مسلماں، سحر ہونے تک اور ذکرِ جمیل وغیرہ آزاد کی بہترین اور نمائندہ نظمیں ہیں۔ کئی نظمیں ایسی ہیں جو پہلے ہی کئی بار شائع ہو کر بہت مقبول ہوئیں۔ ان میں سب سے زیادہ شہرت "بھارت کے مسلماں" کو ہوئی۔ "دہلی کی جامع مسجد" بھی ایک کتابچے کی صورت میں ہندوستان اور پاکستان دونوں ملکوں میں شائع ہوئی اور خاصی مقبول ہوئی۔

آزاد کی ان نظموں میں لطافت، رنگینیِ اظہار اور ندرتِ بیان، خیال کی گہرائی کے جوہر نظر آتے ہیں۔ انھوں نے اردو شاعری کے ذریعے سے ہر چھوٹے بڑے کا دل جیت لیا ہے۔ نظم "سیرِ پاکستان" کے ذریعے سے آزاد نے پاکستانیوں کا دل جیتا۔ اسی طرح "اے کشورِ ہندوستاں" نظم کہہ کر ہندوستان والوں کو اپنا گرویدہ بنا لیا۔

۱۹۴۷ء کے بعد ہندوستانی مسلمانوں کی حالت زار انتہائی ناآسودہ اور قابلِ رحم تھی۔ مسلمانوں میں غم و یاسیت کا ماحول چھایا ہوا تھا مسلمان افسردگی اور ناامیدی کی زندگی گزار رہے تھے۔ اس بے چینی کے ماحول میں آزاد کی نظم "بھارت کے مسلماں" نے زخموں پر مرہم کا کام کیا۔ وہ تمام مسلمانوں کے لیے ہمدرد اور غمخوار بن گئے۔ آزاد کی اس نظم کو پڑھ کر کسی مسلمان شاعر نے انھیں "ہمدردِ مسلماں" کہا اور کسی نے "ہمدردِ انساں" اور کسی نے ان کو اپنا مسیحا کہا۔ غرض ہر طرف سے داد و تحسین کی صدا آنے لگی۔ ۱۹۵۲ء کے "معارف" میں یہ نظم شائع ہوئی۔ کراچی کا رسالہ "دعوت الحق" نے اسے شائع کیا۔ اس نظم کو بہت ہی پسندیدہ ہمدردانہ اور مخلصانہ جذبات سے معمور بتایا۔

"بھارت کے مسلماں" نظم میں آزاد کا پیام زمان و مکاں کے قیود سے آزاد ہے۔ یہ نظم کل جس شوق سے پڑھی جاتی تھی، آج بھی پڑھی جا رہی ہے۔ دنیا کے تمام خطّوں کے مسلمان خواجہ معین الدین چشتیؒ، سلطان الاولیا حضرت سیّد نظام الدینؒ، حضرت سیّد مجدد الف ثانیؒ، حضرت بایزید بسطامیؒ، حضرت امام غزالیؒ وغیرہ بزرگانِ دین سے عقیدت و محبّت رکھتے ہیں جن کا ذکر آزاد نے اپنی اس نظم میں کیا ہے۔ اسی طرح دنیا کے ہر خطّے

کے مسلمان پر اسلامی تعلیمات پر عمل کرنا فرض ہے۔ اس لیے یہ نظم ہر مسلمان کے لیے نصیحت آمیز ہے۔ آج بھی ہندوستان کے مسلمانوں کی حالت ویسی ہی ہے۔ اگر یہ نظم اب پڑھی جائے تو سبھی عش عش کرنے لگیں۔ دراصل آزاد کی یہ نظم زندۂ جاوید بن گئی ہے۔ نظم کے چند بند ملاحظہ ہوں ؎

اس دور میں تو کیوں ہے پریشاں و ہراساں
کیا بات ہے کیوں ہے متزلزل ترا ایماں
دانش کدۂ دہر کی اے شمع فروزاں
اے مطلع تہذیب کے خورشید درخشاں
حیرت ہے گھٹاؤں سے ترا نور ہے ترساں
بھارت کے مسلماں

اسلام کی تعلیم فراموش ہوئی کیوں
انساں کی تعظیم فراموش ہوئی کیوں
باطن کی وہ تنظیم فراموش ہوئی کیوں
اخلاص کی اقلیم فراموش ہوئی کیوں
حیرت میں ہوں میں دیکھ کے یہ عالم نسیاں
بھارت کے مسلماں

قرآن کی تعلیم سے پھر درس بقا لے
پھر روح میں پیغام محمدؐ کو بسا لے
گزرے ہوئے عظمت کے زمانے کو بلا لے
روٹھی ہوئی ایمان کی دولت کو منا لے
ایمان کی دولت کو گنوائے ہوئے انساں
بھارت کے مسلماں![1]

---

[1] جگن ناتھ آزاد۔ نوائے پریشاں، ص ۱۴۵، ۱۴۶۔

جگن ناتھ آزاد کی شاعری کا منفرد پہلو یہ ہے کہ وہ یاس کو رجائیت سے تبدیل کر دینا چاہتے ہیں۔ ان کا خیال یہ ہے کہ حالات پہ رونے سے بہتر یہ ہے کہ حالات کا مقابلہ کیا جائے۔ وہ نفرت کی جگہ محبت، عداوت کی جگہ اخوت پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ ہندوستان اور پاکستان کی تقسیم نے جو دلوں میں دراڑ پیدا کی، آزاد اس کو مٹا دینا چاہتے ہیں۔ چنانچہ "نوائے پریشاں" کی پہلی نظم "پیشکش" کے اشعار پڑھیے ؎

خس و خاشاک میں روحِ گلستاں لے کے آیا ہوں   خزاں کے دوش پہ ابرِ بہاراں لے کے آیا ہوں

جہاں ظلمت کا مرکز آندھیوں کا آشیانہ ہے   وہاں آزاد پیغامِ چراغاں لے کے آیا ہوں

آزاد کی اس نظم کو ہندوستان اور پاکستان دونوں ملکوں میں مقبولیت حاصل ہوئی۔ اسے بہت سراہا گیا۔ "نوائے پریشاں" بھی آزادی کے فوراً بعد کا مجموعۂ کلام ہے اس لیے اس میں بھی بہت سی نظمیں ایسی ملیں گی جن میں انھوں نے اپنی جنم بھومی کو یاد کیا ہے۔ چنانچہ "جمنا کے کنارے" میں راوی کو یاد کرتے ہیں اور پھر یادوں کی رَو میں بہتے ہوئے اپنے دوست احباب کی محفل آباد کر لیتے ہیں اور یادوں کا سلسلہ مکانِ اقبالؔ سے گزرتا ہوا لاہور کی گلیوں تک پہنچ جاتا ہے ؎

ہائے اے بچھڑے ہوئے بھولے ہوئے لاہور تو
کس طرح یاد آ گیا مجھ کو کہاں یاد آ گیا

یہ بے خیالی کا عالم عشق کی کارستانی ہے۔ یہ عشق اپنے وطن سے ہے۔ اس مقام سے ہے جہاں آزاد نے اپنی آنکھ کھولی، بچپن گزارا۔ ایک طرف آزاد اپنی جائے پیدائش سے محبت کرتے ہیں تو دوسری طرف ہندوستان کی ہر شے میں انھیں خوبی نظر آتی ہے۔ یہ ہندوستان خطّۂ جنّت نشاں، سجدہ گاہ قدسیاں، منبع انوارِ حق، کعبۂ روحانیاں، قبلۂ عرفانیاں، علم و فن، مہر و وفا اور صدق و دفا غرض ہر خوبی اس وطن میں موجود ہے۔ چند اشعار ملاحظہ کیجیے ؎

ہیں ترے نظّارے حسیں   روشن دل و روشن جبیں
ذرّے ہیں تیرے عنبریں
تیری ہوائیں دلکشا   تیری فضائیں دلنشیں
اے دلکشی کی داستاں   اونچا رہے ترا نشاں
اے کشورِ ہندوستاں   (اے کشورِ ہندوستاں)

اس کے بعد آزاد بنارس کی صبح سے لے کر اودھ کی شام اور پھر بنگال کی رعنائیوں سے ہوتے ہوتے پنجاب کی زیبائیوں کو بڑی آسانی سے عبور کر لیتے ہیں پھر کہتے ہیں ؎

افشاں جبیں پر ہے تیری
کشمیر کا باغِ جناں

آزاد نے اس نظم میں بنگلور اور گولکنڈہ کا خاص طور پر ذکر کیا ہے۔ یہ سرزمین وید مقدس کی زمین ہے۔ بزرگانِ دین کی زمین ہے۔ حضرت نظام الدین اولیاء کی سرزمین ہے۔ یہی کرشن کا گہوارہ ہے، مہاتما بدھ اور نانک کا دیس ہے۔ غرض ہندوستان کی بے شمار خوبیوں کو آزاد نے بڑے حسن و خوبی کے ساتھ آسان اور سیدھے الفاظ میں بیان کیا ہے۔

"اَن دیکھا محبوب" آزاد کی معرّیٰ نظم ہے جس میں بڑی نغمگی پائی جاتی ہے:

پھر سپنے میں آیا
بھولی بسری یادیں لایا، اَن دیکھا محبوب
دھندلی دھندلی سی دنیا میں نور کا اک پرتو لہرایا
سورج کی کرنوں نے آکر ذرّوں کو چمکایا
پھر سپنے میں آیا

نومبر ۱۹۴۸ء میں آزاد پہلی مرتبہ گورنمنٹ آرٹس کالج مدراس کی دعوت پر حیدرآباد بھی تشریف لائے تو گولکنڈہ کے مقبروں کی زیارت بھی کی۔ آزاد کے ذہن میں پورے گولکنڈہ کی تاریخ تھی چنانچہ اپنے سفرنامے میں (جنوبی ہند میں دو ہفتے) لکھتے ہیں؛

"اس سرزمین پر قطب شاہی خاندان کوئی دو سو برس تک حکمراں رہا اور یہ زمانہ دکن تو کیا سارے ہندوستان کی تاریخ میں ایک زرّیں عہد کے نام سے یاد کیا جاسکتا ہے۔"[۱]

گولکنڈہ کے مقابر سے آزاد بے حد متاثر ہوئے۔ یہ موضوع بار بار مصرعوں میں ڈھل کر ان کے ذہن میں آتا مگر اقبال کی نظم پہلے سے ہی "گورستان شاہی" کے عنوان سے موجود

---

[۱] جگن ناتھ آزاد۔ "جنوبی ہند میں دو ہفتے" ص ۴۶۔

تھی۔ اس لیے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت تو انھوں نے نظم کہنے کی کوشش نہیں کی مگر بعد میں انھوں نے ایک نظم کہی جو اس مجموعہ میں "ایک لمحہ گولکنڈہ کے مقبروں میں" کے عنوان سے موجود ہے، چند اشعار اس نظم کے ملاحظہ کیجیے ؎

خموش مقبروں کی، دل کا عالم، کہہ نہیں سکتا　　فغاں اے راہبر! یہ کیفیت دل سہہ نہیں سکتا

کہاں ممکن کہ میں چپ چاپ ہی ان سے گزر جاؤں　　کہاں ممکن کہ میں اس کو لباسِ نطق پہناؤں

یہ کس نے کر دیا یہ کہہ کے دل کے بوجھ کو ہلکا　　کہ حصّہ ہے یہ "گورستانِ شاہی" کے مصنف کا[1]

"بوئے رمیدہ" ۱۹۵۹ء سے ۱۹۶۶ء تک کے کہے گئے کلام کا مجموعہ ہے۔ اس مجموعۂ کلام میں رنگینی بھی ہے اور حسنِ بیان بھی۔ یہاں شاعر کا مزاج بدلا ہوا نظر آتا ہے۔ دراصل ۱۹۵۰ء کا زمانہ آزاد کے لیے غمِ روزگار اور غمِ دوراں کا زمانہ ہے۔ ۱۹۵۰ء کے ہندوستان کے حالات میں تیزی سے تبدیلی رونما ہوتی ہے۔ جنوبی ہند کے سفر میں آزاد کی نگاہ حسن و جمال سے ٹکراتی ہے اور خود بخود شاعری ایک نیا رُخ لے لیتی ہے چنانچہ عشق کی کیفیات غزلوں اور نظموں میں موجود ہیں۔ "بوئے رمیدہ" کی ابتدا میں غزلیں ہیں۔ "دکن میں چند روز" اس مجموعۂ کلام کی پہلی نظم ہے۔ نظم میں ایک جگہ کہتے ہیں ؎

جلوۂ دکن میں چشم تماشا کو جو ملا

شاید مری تمام دعاؤں کا تھا صلا

"بوئے رمیدہ" کی زیادہ تر نظمیں دکن کی یادوں پر مشتمل ہیں۔ دکن میں محبوبہ، دکن کی ہوائیں اور سرزمین غرض دکن کی ہر چیز سے وہ پیار کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ گلمرگ بھی دکن کے سامنے کچھ نہیں۔ کشمیر میں بھی وہ دکن کو ہی یاد کرتے ہیں ؎

جنت کشمیر تھی کھولے ہوئے دامانِ ناز

اور مجھ کو ان فضاؤں میں دکن یاد آیا

یوروپ کا سفر کر رہے ہوں یا پھر ساحل عرب پر کھڑے ہوں دکن کو ضرور یاد کرتے ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ کیجیے ؎

---

[1] پروفیسر جگن ناتھ آزاد۔ "نوائے پریشاں" ص ۸۹۔

یہ ہے یوروپ یہ نہیں ارضِ دکن — راستہ بھول گیا ہوں شاید[1]

یہ ساحلِ عرب پہ نظارہ غروب کا — کتنی نظر نواز ہے اے دل عدن کی شام
اس شام کا اگرچہ کہیں بھی نہیں جواب — کیوں یاد آگئی ہے نہ جانے دکن کی شام[2]

آزاد نے جس طرح غزلوں میں دکن کو یاد کیا ہے اُسی طرح نظموں میں بھی دکن کا ذکر ضرور موجود ہے۔ آزاد نے اپنی نظموں میں دکن کے بارے میں جو کچھ کہا ہے وہ محض ان کے تاثرات ہیں۔ دکن سے جذباتی لگاؤ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ مختلف پیرائے میں وہ دکن کا ذکر کرتے ہیں۔ نظموں کے چند اشعار ملاحظہ کیجیے۔ نظم "سیرِ کشمیر کا ایک تاثر" میں کہتے ہیں ؎

کنارِ آبِ وُلر بھی مجھے سکوں نہ ملا
کنارِ آبِ وُلر بھی دکن کی یاد آئی[3]

مسوری کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں ؎

میری خطا معاف مسوری کے برف زار
میں کیا کروں کہ مجھ کو دکن یاد آگیا

مزید اشعار ملاحظہ کیجیے ؎

جنّت میں بھی آزاد دل اپنا نہ لگے گا — جب تک کہ نگاہوں میں ہے تصویر دکن کی

رہا گمان کہ پھولوں کی انجمن میں رہے — دو ایک لمحے جو آزاد! ہم دکن میں رہے

نام اس کے مختلف ہیں مگر حسن ایک ہے — ارضِ دکن سے لے کے بلندیِ طور تک[4]

یہ تیرے تصورِ جانفزا کا کرم ہے تیرا کرم نہیں — سفرِ دکن کی تو بات کیا سفرِ حیات بھی کٹ گیا

حیدرآباد بھی آزاد کا پسندیدہ مقام ہے۔ کئی نظموں میں آزاد نے اس شہر کا ذکر کیا ہے ؎

---

[1] آزاد ۔ "بوئے رمیدہ" ص ۳۲۸ ۔ [2] ایضاً ص ۳۵۴۔
[3] ایضاً ص ۳۲۷۔ [4] ایضاً ص ۲۷۵۔

حیدر آباد ترے چہرۂ رنگیں سے عیاں
خونِ فرہاد بھی رنگِ رُخِ پرویز بھی ہے[1]

آزاد کی ایک نظم "بھوپال" ہے۔ ۲۸ مئی ۱۹۶۰ء میں کہی گئی۔ سرزمینِ بھوپال کو آزاد نے حیدر آبادِ صغیر کا نام دیا ہے، کہتے ہیں ؎

شہر وہ اک نام جس کا خطّہ محبوب ہے
دل کا جو مقصود ہے نظروں کا جو مطلوب ہے
حیدر آباد دکن کہتی ہے اک دنیا جسے
دلربائی کا وطن کہتی ہے اک دنیا جسے

آزاد، بھوپال میں حیدر آباد کی جھلک محسوس کرتے ہیں ؎

اس دیارِ شادماں کی اک جھلک تجھ میں بھی ہے
اس بہارِ بے خزاں کی اک مہک تجھ میں بھی ہے[2]

حیدر آباد کی یاد کی سب سے بڑی وجہ ہے کہ یہاں آزاد کو محبّت ہوگئی، جس کا آزاد نے کھل کر اظہار کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ آزاد نے دنیا کے بیشتر ممالک دیکھے ہیں اور بہت سارے شہروں کی سیر کی ہے۔ خود وہ جس مقام پر رہتے ہیں وہاں حسیناؤں کی کمی نہیں ہے۔ آزاد دراصل اپنی محبوب کی ہر گلی سے پیار کرتے چنانچہ نظم "نرگس بیمار" میں اپنی محبوبہ کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں ؎

دکن سے یہ خبر دوشِ صبا پر آج آئی ہے
ادائے ناز ان آنکھوں پر علالت بن کے چھائی ہے
وہ آنکھیں جن کو پہلے دن سے میں بیمار سمجھا تھا
جنھیں میں کیفِ دل کا محرمِ اسرار سمجھا تھا
سنا ہے اب وہ آنکھیں واقعی بیمار ہیں اے دل
وہ آنکھیں آشنائے لذتِ آزار ہیں اے دل[3]

آزاد ایک حساس شاعر ہیں۔ ان کا مزاج بھی مشرقی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا عشق بھی پاکیزہ ہے۔ یہ محبت ہوس پرستی پر مبنی نہیں۔ اس اخلاص کی جھلک ان کے ہر شعر میں دکھائی دیتی ہے ؎

سوچتا ہوں میں کہ وہ نغمہ مرے کس کام کا
مجھ کو رتبہ دے کے جس نے ان کو رسوا کر دیا

---

[1] آزاد "بوئے رمیدہ" ص ۳۲۴۔ [2] ایضاً ص ۱۹۴۔ [3] ایضاً ص ۱۹۹۔

خود تو رسوا تھا ہی لیکن اے دلِ ناداں یہ کیا
ان کی رسوائی کا بھی سامان پیدا کر دیا[1]

چوں کہ شاعر کا جذبۂ عشق پاکیزہ ہے اس لیے وہ عشقِ مجازی سے عشقِ حقیقی کی راہ طے کرتا ہوا بھی دکھائی دیتا ہے ؎

نام اس کے مختلف ہیں مگر حسن ایک ہے
ارضِ دکن سے لے کے بلندیِ طور تک

آزاد نے گرچہ کہ محبّت کی داستان بہت کم چھیڑی ہے مگر وہ بہر حال شاعر ہیں. اس لیے جلد متأثر ہو جاتے ہیں. ان کا مزاج بھی شاعرانہ ہے. چنانچہ ریل کے سفر میں کسی دوشیزہ کو دیکھ کر پوری نظم کہہ گزرتے ہیں ؎

کل رات کو بھوپال سے دہلی کے سفر میں — فردوس کے انوار تھے شاعر کی نظر میں
اک چاند ادھر جلوہ فشاں کوہ و کمر میں — اک چاند ادھر ریل کے ڈبے میں ضیا بار

آزاد اس "چاند" سے بھی متأثر ہوئے. کہتے ہیں ؎

جس طرح سے خوابِ سحری ٹوٹ کے سر میں — لمحاتِ سفر آج ہیں احساس میں ایسے
لٹتا رہا یہ قافلہ ہر راہ گزر میں[2] — آزاد یہ قافلۂ عشق کی روداد

جن لوگوں کو بھی آزاد کی شاعری سے شکایت تھی "بوئے رمیدہ" کی عشقیہ شاعری اور تغزل کی کیفیات کی وجہ سے ان کی تمام شکایتیں رفع ہو گئیں.

آزاد کو اپنے ملک سے پیار ہے. انھیں یہاں کی ہر چیز پیاری ہے. وہ ہندوستانی تہذیب کو پسند کرتے ہیں جبکہ یوروپی تہذیب انھیں کھوکھلی نظر آتی ہے. چنانچہ کئی نظموں میں آزاد نے یوروپی تہذیب کے اس کھوکھلے پن کو واضح کیا ہے. دو شعر ملاحظہ کیجیے ؎

اس طرح سے میں نے کب دیکھی تھی میخانے میں دھوم
عورتوں، مردوں کا لڑکوں لڑکیوں کا یہ ہجوم

---

[1] آزاد — "بوئے رمیدہ" ص ۲۷۹ — [2] ایضاً ص ۲۰۹ ۔

اتنی آگاہی کسی کو ہو یہ مہلت ہی نہیں
کس کی بانہیں کس کی گردن میں حمائل ہوگئیں

آزاد اپنے ملک کو ہر مقام پر یاد کرتے ہیں۔ انھیں یوروپ و دیگر ممالک میں جہاں دکن اور حیدرآباد یاد آتے ہیں وہیں وہ اپنے ملک کی دیگر اشیاء کو بھی یاد کرتے ہیں۔ فرات و دجلہ ندیاں دیکھنے کے بعد وہ گنگا اور جمنا کو یاد کرنے لگتے ہیں ؎

سامنے آئی جو تصویر فرات و دجلہ
آگئی یاد مجھے گنگ و جمن کی صورت

اسی طرح بلجیم کی شام میں اپنے وطن کو یاد کرتے ہیں ؎

اے بلجیم کی شام ہوں اپنے وطن سے دور
جس طرح عندلیب کوئی ہو چمن سے دور
جیسے چکور کو ہو جنوں مہ تمام
اے بلجیم کی شام

بہر حال آزاد کی نظموں میں جہاں یادِ وطن موجود ہے وہیں یادِ دکن بھی ہے ؎

اے جنوں اب تو ہی شاید مشکلیں آساں کرے
اک طرف یادِ وطن ہے اک طرف یادِ دکن

گہوارۂ علم وہنر: اس مجموعۂ کلام میں صرف نظمیں ہیں جن کا تعلق روس کے سفر سے ہے۔ آزاد کو ۱۹۷۸ء میں پہلی مرتبہ روس کے سفر کا موقع ملا۔ واپسی پر انھوں نے ایک سفر نامہ "پُشکن کے دیس میں" کے نام سے لکھا۔ روس میں آزاد کا قیام صرف اکیس ۲۱ دن کا تھا۔ (۳، ستمبر تا ۲۴، ستمبر ۱۹۷۸ء) مگر اس سفر سے آزاد بے حد متاثر ہوئے۔ سفر نامہ لکھنے کے خاصے عرصے بعد نظمیں کہیں۔ چنانچہ ان نظموں کے بارے میں لکھتے ہیں :

"اس سفر کا حاصل مذکورہ سفر نامے کے علاوہ وہ نظمیں بھی ہیں جو اس سفر میں موزوں ہوئیں۔ زیرِ نظر مجموعہ انہی نظموں پر مشتمل ہے۔" ایک تجلی ایک تبسم" اس سفر کی آخری نظم ہے جو روس سے روانگی کے

لمحات میں موزوں ہوئی۔ واپسی پر اس سفر کی یاد مدتوں دل میں رہی بلکہ آج بھی اس یاد سے شامِ جاں معطّر ہے۔ بالخصوص تاجکستان کا قیامِ نو، جس میں فارسی کے معروف ادبا، شعراء اور اہلِ قلم حضرات سے ملاقات ہوئی اور جن کا تفصیلی ذکر "پشکن کے دیس میں" کے صفحات میں موجود ہے۔ میری زندگی کی ایک انمٹ یاد بن گیا ہے اور ہندوستان آنے کے بعد اس سفر کے بارے میں پہلی نظم جو ہوئی وہ فارسی نظم "بہ نام احباب تاجکستان" ہے"۔[۱]

"گہوارۂ علم وہنر" کی نظموں کے مطالعہ کے لیے ضروری ہے کہ آزاد کا سفرنامہ "پشکن کے دیس میں" کا مطالعہ کیا جائے۔ کیوں کہ ان واقعات کا تفصیلی ذکر سفرنامے میں موجود ہے۔ آزاد نے اس نظموں کے ذریعے سے روس کے عظیم مفکرین و سیاست دانوں کو نذرانۂ عقیدت پیش کیا ہے۔ روس میں علم وہنر کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ جس طرح ہندوستان میں کھانے پینے کی چیزوں کے لیے قطاریں کھڑی کرنی پڑتی ہیں اسی طرح روس میں کتابوں کے لیے لائن بنانی پڑتی ہیں۔ آزاد نے اس لیے روس کو "گہوارۂ علم وہنر" کہا ہے۔ نظم "ایک تجلی ایک تبسم" کے آخر میں آزاد کہتے ہیں ؎

الوداع اے روس اے گہوارۂ علم وہنر
تیری دنیا سے یہ سب یادیں

کہ گویا مشعلیں ہیں نور کی
یا تجلی طور کی[۲]

روس میں آزاد جن عظیم شخصیتوں سے متاثر ہوئے ہیں ان میں مریم سلکنگ بھی ہیں جو سودیت رائٹرز یونین کی صدر ہیں، اُنھی کے یہاں آزاد مہمان تھے۔ اس مجموعۂ کلام کو آزاد نے سلگنگ کے نام ہی سے منسوب کیا ہے۔ لینن کی شخصیت سے آزاد پہلے ہی

۱؎ جگن ناتھ آزاد۔ "گہوارۂ علم وہنر" ص ۸ حرفِ اوّل۔ ۲؎ ایضاً ص ۵۹۔

سے مرعوب تھے۔ "لینن میوزیم" میں اس کے مجسّمے کو دیکھ کر اور زیادہ متأثر ہو گئے۔ سفرنامہ میں لکھتے ہیں:

"عظیم لینن کے ایک عظیم مجسّمے نے ہمارا استقبال کیا اور جوں جوں میں میوزیم میں آگے بڑھتا گیا مجھ پر ہیبت کی ایسی کیفیت طاری ہوتی گئی جو لینن کے متعلّق متعدّد کتابیں پڑھنے پر بھی طاری نہ ہوئی تھی۔ یہ میوزیم کیا تھا۔ تاریخ کا ایک بڑا اہم باب تھا جس کے صفحے لمحہ بہ لمحہ میرے سامنے کھلتے جا رہے تھے۔ نہ جانے یہ شخص فولاد کا بنا ہوا تھا، یا کیا تھا۔ اس کو کیا طلسماتی قوت عطا ہوئی تھی کہ اس نے غلاموں کے اندر بغاوت کا جذبہ بیدار کر کے زارشاہی تہس نہس کر کے رکھ دیا۔" [1]

نظم "لینن" میں آزاد نے اسی جذبے کو پیش کیا ہے ؎

سوچتا ہوں کام یہ کتنا بڑا تو نے کیا	فکر کو بندِ غلامی سے رہا تو نے کیا
کس طرح لفظوں میں تیرے کارنامے ہوں بیاں	حق یہ ہے زندگی کا حق ادا تو نے کیا [2]

نظم "تعبیرِ خواب" میں کہتے ہیں ؎

مسکنِ لینن اعظم ہے یہی ملکِ جلیل

ملکِ اعصارِ کہن کے لیے پیغامِ اصیل

لینن کے علاوہ کٹوزوف، پیٹر، پشکن، چیخوف، تالستائی، لرمن شوستا، کولانووا، کارل مارکس اور اینگلز وغیرہ کو بھی آزاد نے نذرانۂ عقیدت پیش کیا ہے۔ ایک نظم کا عنوان ہے "کریملن"۔ اس شہر کے بارے میں آزاد اپنے سفرنامے میں لکھتے ہیں:

"کریملن زارشاہی کے زمانے کی یادگار ہے جس میں لینن ایک فاتح کے طور پر ۱۲ مارچ ۱۹۱۸ء کو دن کے بارہ بجے پوری پرولتاری شان کے ساتھ داخل ہوا۔ آج کریملن روسی کمیونسٹ پارٹی اور حکومت کے

---

[1] آزاد۔ پشکن کے دیس میں، ص ۲۰۔ [2] آزاد۔ گہوارۂ علم و ہنر، ص ۵۶۔۵۵۔

اہم ترین دفاتر سے آباد ہے۔ ماسکو اگر سارے روس کا دل ہے تو کریملن ماسکو کا دل ہے اور کریملن کو دیکھے بغیر ماسکو سے واپس جانا ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص راشٹرپتی بھون، سنٹرل سکریٹریٹ اور لال قلعہ دیکھے بغیر دہلی سے واپس چلا جائے۔“[1]

نظم ”کریملن“ میں انہی جذبات کی عکاسی کی گئی ہے ؎

زارِ شاہی دور کی اے یادگار
تیرے ہاتھوں سے بڑھا مزدور کا ایک دن وقار
حال میں تیرے ہے مستقبل کی جھلکی آشکار

نظم کے آخر میں کہتے ہیں ؎

آج بھی بپھرے ہوئے طوفاں کا ساحل ہے تو
ماسکو ہے روس کا دل، ماسکو کا دل ہے تو[2]

نظم ”لینوا میں ایک دن“ میں بھی شاعر اپنے تأثرات کا اظہار کرتا ہے۔ تفصیلی ذکر سفرنامے میں موجود ہے۔ گویا ان تمام نظموں کی تشریح و تفصیل سفرنامے میں تلاش کر لی جائے۔ آزاد نے اخلاص سے کام لیا ہے یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں تاثیر ہے۔ ان کی ان نظموں سے ان کے قادر الکلامی کا بھی اظہار ہوتا ہے۔

مثنوی جمہور نامہ: جگن ناتھ آزاد کے یہاں جہاں اور کئی غیر مطبوعہ مسودات ہیں ان میں ایک نامکمل غیر مطبوعہ مثنوی بھی ہے۔ بالکلیہ طور پر یہ مثنوی غیر مطبوعہ اس لیے نہیں ہے کہ اس کے بعض حصے رسائل و جرائد میں شائع ہو چکے ہیں۔ مثنوی ”جمہور نامہ“ کے تقریباً تین ہزار اشعار ہیں۔ راقم الحروف نے دو ایک بار اس مثنوی کے بارے میں دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ یہ اب تک اسی طرح نامکمل ہے۔ پروفیسر گیان چند جین نے اس پر بصیرانہ تنقید کی ہے اور اس کا غائرانہ جائزہ لیا ہے۔ اس مثنوی کے بارے میں استادِ محترم پروفیسر جین صاحب لکھتے ہیں:

---

[1] آزاد ”پشکن کے دیس میں“ ص ۳۸۔ [2] آزاد ”گہوارۂ علم و ہنر“ ص ۳۰۔

"مثنوی جمہور نامہ ہزج مثمن سالم کے وزن میں لکھی گئی ہے۔ آزاد بھی تسلیم کرتے ہیں کہ بحر کا انتخاب موزوں ترین نہیں اس لیے اب وہ بحر بدلنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔" [۱]

اس مثنوی کا موضوع تخلیق کائنات اور ارتقائے آدم و کائنات ہے۔ البتہ آزاد نے سائنسی نقطۂ نظر سے تخلیق کائنات کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے جو ایک چیلنج ہے۔ انھوں نے رامائن، مہابھارت اور گیتا کو سراہا ہے۔ پروفیسر موصوف کے مطابق یہ مثنوی ۱۹۶۵ء میں ڈاکٹر سید عبدالمجید شمس آبادی پرنسپل کالج آف کامرس پٹنہ کی تصنیف مثنوی "حیات و کائنات" کا موضوع بھی یہی ہے جو آزاد کی مثنوی کا ہے۔ دونوں کا نقطۂ نظر بھی ایک ہے اور جوش کی "حرفِ آخر" کا موضوع بھی یہی ہے۔ پروفیسر گیان چند جین نے چیدہ چیدہ اشعار اور مثنوی کے بند بھی نقل کیے ہیں جن سے مثنوی کی عظمت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ انھوں نے جمہور نامے کو ان عنوانات کے تحت ترتیب دیا ہے:

(۱) حرفِ اوّل : نظریۂ ارتقا — بہ نام ابن آدم۔
(۲) ظہور آدم : کرۂ ارض، ایک سوالیہ نشان اور عقلِ انسانی کی نارسائی۔
(۳) ہمارے اوّلین اجداد : وادیِ نیل میں ابنِ آدم کے قدم۔ تہذیب کی اوّلین جھلک۔
(۴) بابل : شط العرب، نینوا اور ہندوستان میں تہذیب کی کرنیں۔
(۵) دنیا کی اوّلین کتاب : وید۔
(۶) رامائن
(۷) مہابھارت (۱) گیتا، ظلمت کی یورش، مہاویر، مہاتما بدھ وغیرہ۔
(۸) نور و ظلمت کی کشمکش۔
(۹) ولادت باسعادت۔
(۱۰) ہندوستان ہمارا۔

---

[۱] پروفیسر گیان چند جین ۔ جگن ناتھ آزاد کی غیر مطبوعہ مثنوی جمہور نامہ، ص ۔ ۱۵۰ از مشمولہ سہ ماہی "لمحے لمحے" بدایوں، ص ۔ ۱۵۰۔

"ولادت باسعادت" کے حصّے کئی زبانوں میں شائع ہو چکے ہیں جسے آزاد فخریہ انداز میں پیش کرتے ہیں۔ آزاد کی مثنوی کا یہ حصّہ دراصل نعتیہ کلام ہے۔ دسمبر ۱۹۵۹ء کے "معارف" میں "ولادت باسعادت" کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔ اس کا ترجمہ اردو، عربی، انگریزی اور فرانسیسی کے جیّد عالم ڈاکٹر حمید اللہ نے فرانسیسی میں کیا ہے اور فرانس کے ایک مشہور ناشر نے اسے شائع کیا ہے۔

جمہور نامہ کے متعلق گیان چند جین لکھتے ہیں:

"جمہور نامہ کا سرمایہ فخر اس کے متعدّد اشعار بیانات ہیں۔ بشر کی توصیف، مٹی کی عظمت، انسان پر سلام، قلوپطرہ کا خیرہ کُن حُسن، وید اور گیتا کی عظمت اور اس قبیل کے دوسرے بیانات نے اس مثنوی کو خارجی بیانیہ نہیں رہنے دیا بلکہ سراپا شعر بنا ڈالا۔ انھوں نے نظم میں کہیں خالص دیومالائی واقعات اور تلمیحات سے رنگ آمیزی نہیں کی بلکہ صرف انھیں واقعات اور شخصیات کو لیا ہے جن سے تاریخ منکر نہیں۔ اس پابندی کے ساتھ شاعری کو ہاتھ سے نہ جانے دینا بڑا کارنامہ ہے........ یہ نظم ابھی تین ہزار اشعار پر محیط ہے اسی نہج سے پورا ہوتے ہوتے بات کوئی دس ہزار اشعار پر ٹھہرے گی۔ کتنی جگر کاوی اور دماغ سوزی درکار ہے۔ کتنی راتوں کو زندہ کر کے خون جلانا ہوگا۔ کیا اسے مکمل کرنا چاہیے؟ کیا اس کا اصل اس کی کاوش کے ہم پلہ ہوگا! کیا زمانہ اس نظم کو کوئی بلند مرتبہ دے گا؟ یہ سوالات شاعر کے سامنے ہیں، ہمیں ان کا جواب فراہم کرنا چاہیے۔"[1]

---

[1] پروفیسر گیان چند جین ــ جگن ناتھ آزاد کی غیر مطبوعہ مثنوی (مشمولہ) ماہی "لمحے لمحے" بدایوں۔ مرتبہ حبیب سوز، ص ۱۶۲، ۱۶۳۔

آخر میں نتیجہ اخذ کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

"اگر یہ مکمل نہ ہوسکی تو اس کے موجودہ اجزا ابھی شائع نہیں ہوں گے اور یہ شائع نہ ہوئے تو شائقینِ ادب ایک اچھے شعری کارنامے کی سیر سے محروم رہ جائیں گے۔"[1]

۶ر دسمبر ۱۹۹۲ء کو جب بابری مسجد شہید کردی گئی تو آزاد کی مسلمانوں سے ہمدردی پھر ایک بار غم کی موجیں مارنے لگی۔ چنانچہ بابری مسجد کی شہادت پر انھوں نے ایک نظم کہی اور اسی کے ساتھ ایک تبصرہ بھی سیاست میں شائع ہوا۔ تبصرہ ملاحظہ کیجیے :

"۶ر دسمبر کو میں جموں سے دہلی روانہ ہوا۔ دوسرے دن ۷ر دسمبر کو مجوزہ اردو یونیورسٹی کی میٹنگ میں شرکت کے لیے۔ شام کا سفر تھا طیارے میں ایک ہم سفر نے بتایا کہ بابری مسجد کے ایک گنبد کو گرادیا گیا۔ میں نے کہا کہ آج دوپہر تک یعنی روانگی کے وقت تک تو ایسی کوئی خبر نہیں تھی۔ اس نے کہا بی۔بی۔سی نے اطلاع دی ہے۔ میں درد و غم کے طوفان میں ڈوب گیا اور اسی وقت اس نظم کی ابتدا ہوئی۔ صرف ابتدا کے تین بند ہوئے تھے کہ طیارہ دہلی پہنچ گیا۔ جب میں اپنی قیام گاہ پر یعنی بیٹے کے گھر پہنچا تو معلوم ہوا کہ ساری مسجد منہدم کی جاچکی ہے۔ نظم کا باقی حصّہ اس اطلاع کے بعد مکمل ہوا۔ اس لیے یہ نظم دو الگ الگ حصّوں میں منقسم ہوگئی ہے۔"[2]

پہلے تین بند میں آزاد کہتے ہیں کہ مسجد کے گنبد توڑنے والوں نے گنبد نہیں توڑا بلکہ دلوں کو توڑ ڈالا ہے۔ اس سے اسلام کو کچھ نقصان نہیں ہوگا۔ لیکن تو نے ہندو دھرم کے دل میں خنجر گھونپ دیا ہے۔ ہندوستان کا چہرہ مسخ کردیا گیا ہے، شعر ملاحظہ کیجیے ؎

---

[1] پروفیسر گیان چند جین۔ جگن ناتھ آزاد کی غیر مطبوعہ مثنوی جمہور نامہ (مشمولہ) سہ ماہی "لمحے لمحے" بدایوں۔ مرتبہ حبیب سوز، ص ۱۲۳۔

[2] روزنامہ "سیاست" مورخہ ۱۸ر اپریل ۱۹۹۳ء۔

نہیں ہے دھرم وہ ہرگز جسے تو دھرم کہتا ہے
تجھے کیا علم کیا ہے آتما، پرماتما کیا ہے

نظم کے کُل ۹ بند ہیں، آخر کے چھ بند مسجد کی مکمل شہادت کے بعد لکھے گئے ہیں چنانچہ کہتے ہیں ؎

میں اک گنبد کو روتا تھا مگر اب یہ کھلا مجھ پر
گرا ڈالا ہے اس ساری عبادت گاہ کو تو نے

آزاد کے دل کو خاصا صدمہ پہنچا وہ ہندو اور مسلمان دونوں کو ایک نظر سے دیکھتے ہیں۔ وہ مسجد کو توڑنے والوں سے کہتے ہیں کہ تو نے مسجد کو کیوں توڑا۔ تیرا بڑپن اس میں تھا کہ مسجد کو نقصان پہنچائے بغیر اس کے قریب ہی اپنے لیے ایک مندر بنا لیتا ؎

مروّت جس کو کہتے ہیں، مودّت جس کو کہتے ہیں
یہ مسجد اس مروّت، اس مودّت کی علامت تھی
اسی کے ساتھ تو ایک اپنا مندر بھی بنا لیتا
وہی تیرا بڑپن تھا، وہی تیری کرامت تھی

خدا گھر ہے مندر بھی خدا گھر ہے مسجد بھی
مجھے تو میرے ہندو دھرم نے بس یہ سکھایا ہے

نظم کے آخر میں کہتے ہیں ؎

یہ مسجد آج بھی زندہ ہے اہلِ دل کے سینوں میں
خبر بھی ہے تجھے، مسجد کا پیکر توڑنے والے
ابھی یہ سرزمین خالی نہیں ہے نیک بندوں سے
ابھی موجود ہیں ٹوٹے ہوئے دل جوڑنے والے[1]

"بچوں کی نظمیں"؛ جگن ناتھ آزاد کا ۱۹۶۸ء تک لکھا ہوا پانچواں مجموعۂ کلام ہے اس مجموعہ میں آزاد کی سولہ نظمیں شامل ہیں۔ ترقی اردو بورڈ وزارتِ تعلیم سماجی بہبود مرکزی

---

[1] روزنامہ "سیاست"، حیدرآباد، مورخہ ۱۸ر اپریل ۱۹۹۳ء۔

سرکار نے اسے شائع کیا ہے۔ ٹائیٹل بہت خوب صورت اور خوشنما ہے۔

دنیا کے بیشتر ممالک بچوں کے لیے بہترین ادبی و تفریحی مطبوعات پیش کرتے رہتے ہیں کیونکہ بچوں کا ذہن جلد اثر قبول کرتا ہے۔ بچّے خام مٹّی کی طرح ہیں۔ ہم جس طرح کا مواد ان کے سامنے پیش کریں گے وہ انھیں سانچوں میں ڈھل کر نکلیں گے۔ آج کے بچّے کل کے شہری ہیں۔ وہی قوم کے معمار ہیں۔ ان کی تعلیم و تربیت ہمارا اوّلین فرض ہے۔

دیگر شعرا کی طرح جگن ناتھ آزاد نے بھی بچّوں کے لیے بہترین نظمیں کہی ہیں۔ یہ ان کی خوش قسمتی ہے کہ ان کی زندگی میں ہی یہ نظمیں کتابی صورت میں شائع ہو گئیں اور خوب پڑھی گئیں بلکہ ان کی بہت سی نظمیں سرکاری و خانگی مدارس کے نصاب میں شامل ہیں۔

آزاد کی نظموں کو پڑھنے کے بعد یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ جس طرح ماہرِ اقبالیات ہیں اسی طرح ماہرِ نفسیات بھی ہیں۔ وہ بچّوں کی نفسیات سے بہ حسن وخوبی واقف ہیں۔ نظمیں کہتے وقت ان کی نفسیات کو نہیں بھولتے۔ یہی وجہ ہے کہ اس مجموعے کی بیشتر نظمیں عام فہم، سادہ و سلیس اور آسان زبان میں ہیں۔ ان نظموں کا موضوع بھی بچّوں کے مزاج سے مطابقت رکھتے ہیں۔

آزاد نے نہ صرف اپنی شاعری میں بچّوں کی نفسیات کو ملحوظ رکھا ہے بلکہ اقبال شناسی کے دوران بھی انھوں نے بچّوں کی عمر کا پورا خیال کیا ہے۔ چنانچہ چھوٹے بچّوں کے لیے (نو سے چودہ سال کی عمر تک) "اقبال کی کہانی"، (چودہ سے اٹھارہ سال کے طلبہ و طالبات) "اقبال۔ زندگی، شخصیت اور شاعری" عمدہ کتابیں ہیں جن میں عمر کا پورا لحاظ رکھا گیا ہے۔ اقبال کی ان نظموں کا انتخاب کیا گیا ہے جن سے بچّے اچھا اثر قبول کر سکتے ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ جس طرح آزاد نے نثر میں بچّوں کی عمر کو ملحوظ رکھا ہے بالکل اسی طرح جب وہ بچّوں کے لیے نظمیں لکھتے ہیں تو خود بھی تھوڑی دیر کے لیے بچّہ بن جاتے ہیں۔ تماشے والا، کلکتہ میل، گرمیاں آگئیں، سُن لو ایک کہانی بچّو، ہم بادل کہلاتے ہیں، کسانوں کا گیت اور جادو والا وغیرہ ان کی بہت اچھی نظمیں ہیں۔ ان نظموں کے علاوہ عید، دسہرہ، دیوالی اور دیس ہوا آزاد وغیرہ بھی ان کی عمدہ بچّوں کی نظمیں ہیں۔ نظم "تماشے والا"

کے چند اشعار درج کیے جاتے ہیں ؎

آؤ بچو! دو پیسے میں دنیا بھر کی سیر کرو
نظارے دکھلانے والا
جگ کی سیر کرانے والا
ڈبہ اپنے سر پہ اٹھائے
گلی گلی میں جانے والا

آج تمہارے گھر کے باہر رنگ جماتے آیا
دو پیسے میں دنیا بھر کی سیر کرانے آیا

"کلکتہ میل" کے چند اشعار بھی ملاحظہ کیجیے ؎

کلکتے سے میرے بھیّا لائے ہیں ایک ریل
ریل بہت ہی اچھی ہے یہ اس کو نہ سمجھو کھیل
چابی ہے اس ریل کا کوئلہ چابی اس کا تیل
کلکتہ سے آئی ہے یہ ہے کلکتہ میل

آزاد کی بعض نظمیں خاصی طویل ہیں۔ "سن لو ایک کہانی بچو!" میں کہتے ہیں ؎

بسکٹ کے دھوکے میں رانی کھا جاتی ہے روٹی
دودھ کے دھوکے ہیں وہ اکثر پی جاتی ہے پانی

آزاد کے الفاظ میں بچوں کے لیے خلوص و پیار ہے۔ محبّت ہے کبھی وہ تماشے والا بن کر بچوں کو آواز دیتے ہیں تو کبھی بچوں کو چھوٹی موٹی کہانی سنا کر ان کا دل بہلاتے ہیں۔ کبھی "جادو والا" بن کر کھیل تماشہ دکھاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اس طرح آزاد نے موضوع میں بھی بچوں کی نفسیات کا خاص خیال رکھا ہے بلکہ زبان و بیان میں بھی اس بات پر خاصی دھیان دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی نظمیں دل چسپ معلوم ہوتی ہیں۔ بچے بآسانی ان نظموں کو گنگنا سکتے ہیں اور زبانی یاد کر سکتے ہیں۔ نظم "گرمیاں آگئیں" ہو کہ "ہم بادل کہلاتے ہیں"، "عید" اور "دسہرہ"، کی نظمیں۔ ہر نظم میں آزاد نے چھوٹی بحر کا استعمال کیا ہے۔ "عید" کے اشعار

اسی طرح ہیں ؎

ہر گھر میں عید آئی　　　خوشیاں ہزار لائی

اسی طرح نظم "دسہرہ" کے اشعار کا بحر ہے ؎

بزمِ وطن میں آیا دسہرہ　　　رنگینیاں ساتھ لایا دسہرہ　　　وغیرہ۔

آزاد کے لکھنے کا سلسلہ اب بھی جاری ہے۔ وہ غزلوں کے مقابلے میں نظمیں زیادہ کہتے ہیں۔ ان کی نظمیں تقریباً تمام ادبی رسالوں میں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ ان کی نظموں میں پختگی ہے، روانی اور تسلسل ہر جگہ موجود ہے۔ بیشتر نظمیں پُر اثر ہیں۔ آزاد کی نظموں میں صداقت اور خلوص ہر جگہ موجود ہے۔ وہ زندگی کے مسائل سے اچھی طرح واقف ہیں۔ اس لیے ان کی نظموں میں موجودہ دور کے مسائل اور ان سے نمٹنے کا حوصلہ موجود ہے۔ نظم نگاری کی دنیا میں آزاد کا مرتبہ نمایاں ہے۔

جگن ناتھ آزاد کے مرثیے

انسان کی زندگی خوشی و غم سے عبارت ہے۔ دنیا میں کہیں کسی کے پیدا ہونے کی خوشی منائی جاتی ہے تو کہیں کسی کی موت پر رنج و غم کا اظہار کیا جاتا ہے۔ قدرت کا یہ قانون ابدی اور ازلی ہے۔

خوشی کے اظہار کے لیے انسان الفاظ کا سہارا لیتا ہے بالکل اسی طرح غم کے موقع پر بھی زبان سے رنج کے کلمات صادر ہوتے ہیں۔ شاعر حسّاس طبیعت کا مالک ہوتا ہے وہ اپنے ماحول سے جلد متاثّر ہوتا ہے۔ اس لیے اپنے عزیز و اقارب کی موت پر کچھ کہے بغیر نہیں رہ سکتا اور یہیں سے مرثیے کی تخلیق عمل میں آتی ہے۔ مرنے والے کی ذات شاعر کو اس حد تک متأثر کرتی ہے کہ وہ اپنے جذبات کو شعر کے قالب میں ڈھالنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

اسلامی تاریخ میں سانحۂ کربلا کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ کیونکہ حضرت امام حسین رضؓ خاتم النبیّین، آقائے نامدار اور تمام انبیاء کے سردار محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیارے نواسے ہیں۔ خاتونِ جنت، عورتوں کی سردار حضرت فاطمہ رضؓ کے لختِ جگر ہیں حضرت علی رضؓ کے نورِ نظر ہیں۔ ان کو کربلا کے میدان میں بھوکا پیاسا رکھا گیا انھیں اور ان کے تمام ساتھیوں کو بے رحمی کے ساتھ شہید کر دیا گیا۔ آلِ رسولؐ کی بے حرمتی کی گئی۔ یہی وجہ ہے کہ واقعۂ کربلا کے تقریباً تمام کرداروں کی عکاسی ہمارے شعراء نے مختلف انداز میں اپنے مرثیوں میں کیے ہیں۔

اردو شاعری میں مرثیہ نگاری کا فن فارسی کے زیرِ اثر ہے۔ عربی میں بھی مرثیے کہے گئے۔ دکن کے قطب شاہی دور میں اردو میں مرثیے لکھنے کا آغاز ہوا۔ مرثیے کا سفر خاصا طویل ہے۔ اردو مرثیہ میں میر انیس و مرزا دبیر نے جو نام کمایا وہ کسی اور کے حصے میں نہ آسکے۔ اردو مرثیہ آج تک ان کے سحر اور اثر سے نہیں نکل سکا۔ اردو شاعری میں مرثیے کی تعداد بھی بہت زیادہ ہے۔

اردو میں شخصی مرثیوں کی ابتدا کا سہرا غالبؔ اور مومنؔ کے سر ہے۔ غالبؔ نے عارف اور اپنی محبوبہ کی موت پر مرثیہ لکھا۔ مومنؔ نے بھی اپنی محبوبہ کی موت پر مرثیہ کہا۔ یہ مرثیے ذاتی رنج وغم کی نمائندگی کرتے ہیں مرنے والے کے بارے میں کچھ نہیں بتاتے۔ ایسے مرثیوں کا اثر محدود طبقہ پر پڑتا ہے۔

حالیؔ نے شخصی مرثیے کو خاصی وسعت دی۔ انھوں نے غالبؔ کی موت پر مرثیہ لکھا جس میں انھوں نے غالبؔ کی موت پر صرف آنسو ہی نہیں بہائے بلکہ ان کی سیرت اور صلاحیت کے بھی مرقعے کھینچے ہیں۔ ان کی موت سے ہونے والے خلاء کا بھی احساس دلایا ہے گویا کہ ہر ایک کے دل کی بات کہی ہے۔ اس طرح شخصی مرثیے دو حصوں میں تقسیم ہو جاتے ہیں۔ ایک وہ مراثی ہیں جو صرف ذاتی غم کا اظہار کرتے ہیں اور دوسری طرف وہ مراثی جو اپنی ہمہ گیری اور آفاقیت کے باعث پورے ملک یا شعر وادب کو اپنے حلقہ میں سمیٹ لیتے ہیں۔

پروفیسر ظہیر احمد صدیقی نے انھیں دو قسم کے مراثی کی نشاندہی کی ہے۔ (۱) انفرادی (۲) اجتماعی۔ وہ لکھتے ہیں :

> "انفرادی مرثیے میں مرنے والے کی ذات شاعر کو اس حد تک متاثر کرتی ہے کہ وہ اپنے جذبات کو شعر کے قالب میں ڈھالنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ ایسے مرثیوں کا اثر محدود طبقہ پر پڑ سکتا ہے۔ ایسے مرثیوں کی مثالیں ہیں غالبؔ کا مرثیہ جو عارف کی موت پر لکھا گیا۔ مومنؔ کا اپنی محبوبہ کے مرنے پر۔ جاں نثار اختر نے اپنی "صفیہ" کی موت پر، شمیم کرہانی کا احتشام حسین کے انتقال پر وغیرہ۔ یہ مرثیے

ذاتی رنج وغم کی نمائندگی کرتے ہیں مگر یہی ذاتی مرثیے ایک دوسرا
رُخ اختیار کرلیتے ہیں اور ذاتی غم اجتماعی صورت اختیار کرلیتا ہے۔
حالی کا مرثیہ غالب، چکبست کا مرثیہ گوکھلے، مجاز کا مرثیہ گاندھی انفرادی
ہونے کے باوجود اجتماعی حیثیت رکھتے ہیں۔" لہ

شخصی مرثیہ کی روایت کو مستحکم کرنے والوں میں حالی، چکبست، اقبال اور محروم کا نام سرفہرست ہے۔ چکبست نے متعدد مرثیے لکھے جن میں کشن نارائن در، تلک اور گوکھلے انتہائی اہم ہیں۔ چکبست نے ان مراثی میں میر انیس کے اندازِ بیان کی تقلید کی ہے۔ اسی طرح اقبال کے انتقال کے بعد بہت سارے مرثیے لکھے گئے جو "یادِ اقبال" کے نام سے شائع ہوئی۔ ان میں بہت سے نامور شعرا نے شخصی مرثیے کی روایت کو برقرار رکھا۔ ترقی پسند شعرا میں فیض اور مخدوم نے بھی اقبال پر مرثیے لکھے ہیں۔ اسی طرح گاندھی جی کی موت پر بھی متعدد اردو مرثیے لکھے گئے۔

اردو میں شخصی مرثیہ نگار شعرا میں جگن ناتھ آزاد کا نام بھی نمایاں ہے۔ بنیادی طور پر ان کے شخصی مرثیوں کو تین حصّوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

(۱) اپنی شریکِ حیات کی موت پر کہے گئے شخصی مرثیے۔
(۲) سیاسی شخصیتوں کی موت پر کہے گئے مرثیے۔
(۳) علمی وادبی شخصیتوں کی موت پر کہے گئے مرثیے۔

"شکنتلا" اور "آرزو" آزاد کے وہ مراثی ہیں جو انھوں نے اپنی مرحوم بیوی کی یاد میں لکھے ہیں۔ ان مرثیوں کو دیکھنے سے پتا چلتا ہے کہ آزاد اپنی بیوی سے کس قدر والہانہ محبت کرتے تھے۔ خلوص و ایثار اور وفاداری سمٹ کر آزاد کے مرثیوں کا جزو ہوگئی ہے۔ اندازِ بیان نے مرثیے کے تاثر کو شدید تر بنادیا ہے۔ "ایک آرزو" کے اشعار ہیں ؎

لہ ظہیر احمد صدیقی "شخصی مرثیے" (مشمولہ) اردو مرثیہ، مرتبہ ڈاکٹر شارب ردولوی، ص ۲۴۶۔

تو کہاں ہے لے میرے گلزارِ ہستی کی بہار
قسمت بیدار و درد نہاں کی چارہ کار

ہو گئی تو آبشاروں کے ترنم میں مکیں
یا ٹھکانہ کر لیا آوازِ بلبل میں کہیں

دیدۂ آہو میں ہے تو یا دمِ آہو میں ہے
کچھ بتا دے پھول میں یا پھول کی خوشبو میں ہے

تتلیوں کے خوشنما رنگوں میں آرامیدہ ہے
وقت کی پرواز کے دامن میں یا خوابیدہ ہے

اے کہ تجھ کو ڈھونڈتی ہے میری جانِ دردمند
اے کہ ایک پل کی جدائی بھی نہ تھی تجھ کو پسند

اِس طرح "شکنتلا" میں آزاد کے آنسو سیلاب بن کر بہہ نکلتے ہیں۔ جذبۂ محبت الفاظ کا پیکر لے کر طوفان کی طرح امنڈتا ہوا نظر آتا ہے۔ اس مرثیہ میں والہانہ عشق کا اظہار ہے۔ رفیقۂ حیات کی موت نے انھیں انتہائی کمزور کر دیا ہے۔ اندازِ بیان کی روانی اور جذبات کا بہاؤ ہر شعر میں موجود ہے۔ ان کے تمام مرثیوں میں "شکنتلا" ایک شاہکار مرثیہ ہے۔ مرثیے کے اشعار ملاحظہ کیجیے ؎

میں اسے لے کر خدا جانے کہاں پھرتا رہا
پتھروں پر ڈگمگاتا جا بجا گرتا رہا
چاند تارو! وہ سماں کتنا الم آثار تھا
مری قسمت سو رہی تھی اور میں بیدار تھا

اے گرفتار تپ کہنہ قرارِ چشم و دل
ایک مدت تک رہی ہے تو علیل و مضمحل

شکر ہے آخر حوادث کا یہ بادل چھٹ گیا
شکر ہے آخر تیرا دورِ مصائب کٹ گیا

سامنے میرے دعاؤں کا مری انجام ہے
اب ترے ہر درد ہر تکلیف کو آرام ہے

اب نہ روئے گی تو اپنی بچیوں کو دیکھ کر
اور اس معصوم کی خاطر نہ ترسے گی نظر

جو ترے دامن میں آیا مسکرایا چل بسا
جن کو یہ اندازِ دنیا کا نہ بھایا چل بسا

اب نہ ہم کڑوے دوا دارو پلائیں گے تجھے
اب نہ بیماروں کے بستر پر سلائیں گے تجھے

عالمِ فردوس میں تو آج آرامیدہ ہے
میرے سینے میں تری یادِ حسیں خوابیدہ ہے

ہائے کیا نقشہ دکھایا گردشِ ایام نے
تو نہیں ہے اور ہیں تیرے پھول میرے سامنے

چُن کے تری راکھ سے یہ پھول لے آیا ہوں میں
گوہرِ اشکِ رواں دے کر انھیں لایا ہوں میں

بزم فانی کی کثافت سے نہ آلودہ رہیں
پھول تیرے دامنِ گنگا میں آسودہ رہیں

مولانا صلاح الدین احمد آزاد کے اس مرثیے کے بارے میں لکھتے ہیں :

"جگن ناتھ آزاد نے "شکنتلا" کے عنوان سے اپنی رفیقۂ حیات کا مرثیہ لکھا ہے۔ مرثیہ کیا ہے "اشکِ خونیں" کا ایک سیلاب ہے جو زمینِ شعر کو شاداب کرتا ہوا منزلِ ابدی کی طرف رواں ہے۔ آزاد نے مرثیے لکھ کر حقیقتاً مرثیے کی صنف پر احسان کیا ہے جس کا تعلق رسمِ شعر سے نہیں، غمِ دل سے ہے اور ہمیں یقین ہے کہ مستقبل کا مؤرخ اسے زبانِ اردو کے بہترین مرثیوں میں جگہ دے گا۔ جذبات کا وفور اور الفاظ کا حسن دونوں اپنے عروج پر نظر آتے ہیں"۔[1]

ہندوستان کی تاریخ میں پنڈت جواہر لعل نہرو کی شخصیت محتاجِ تعارف نہیں۔ جدید ہندوستان کی تعمیر میں جواہر لعل نہرو کا بہت اہم حصہ ہے۔ ان کی شخصیت آفتاب کی مانند روشن ہے جس سے ہر سیاسی شخص بصیرت حاصل کرتا رہتا ہے۔ آزاد نہرو جی سے بچپن ہی سے متاثر تھے۔ پنڈت نہرو کے ادبی کارناموں پر بھی آزاد نے بصیرت افروز مضمون لکھا ہے جو "آنکھیں ترستیاں ہیں" میں موجود ہے۔ پنڈت نہرو نے آزادیِ وطن کے بعد جب حکومت سنبھالی ان کی یہی خواہش رہی کہ ملک آزادی کی برکتوں سے مالا مال ہو اور ہندوستان ہر اعتبار سے ترقی کرے۔ انھوں نے آخر دم تک ملک کی خدمت کی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی موت پر اَن گنت مرثیے لکھے گئے۔ آزاد نے بھی نہرو کی موت پر مرثیہ لکھا جو تمام ہندوستانیوں کے دلوں کی صدا بن گیا۔

آزاد نے نہرو کی موت پر "ماتمِ نہرو" لکھا۔ اس مرثیہ کے متعلق غلام ربانی تاباں لکھتے ہیں :

---

[1] ڈاکٹر عبدالستار دلوی۔ اردو شاعری میں شخصی مرثیوں کی روایت اور جگن ناتھ آزاد (مشمولہ) جگن ناتھ آزاد۔ ایک مطالعہ، مرتبہ ایوب واقف، ص ۱۹۰۔

"مجھے یہ کہنے میں کوئی تکلف نہیں کہ پنڈت نہرو پر جتنے بھی مرثیے میری نظر سے گزرے ہیں ان میں آزاد کا زیرِ نظر مرثیہ (ماتم نہرو) منفرد حیثیت رکھتے ہیں۔ نظم میں شروع سے آخر تک آورد نہیں ہے کہیں یہ احساس نہیں ہوتا کہ شعر صرف شعر کہنے کے لیے کہا گیا ہے اس میں تاثیر ہے، روانی ہے اور بڑی حد تک حقیقت پسندی"۔[۱]

جگن ناتھ آزاد نے اس مرثیے میں جواہر لعل نہرو کی عظیم اور ہمہ گیر شخصیت کے تقریباً تمام پہلوؤں کو تشبیہ اور استعارے کے لطیف پیرایہ اختیار کر کے انتہائی خوبصورتی کے ساتھ بیان کیا ہے اوّل سے آخر تک حقیقت بیانی سے کام لیا گیا ہے۔ انداز بھی دلکش اور حسین ہے۔ مبالغہ آرائی سے گریز کیا گیا ہے۔ اس طرح شخصی مرثیہ اجتماعی حیثیت کا حامل بن گیا ہے۔ مرثیہ کے اشعار ملاحظہ کیجیے ؎

اے دل! چمن سے کون یہ جان چمن گیا
بزمِ وطن سے کون وقارِ وطن گیا
فخرِ ہمالہ نازشِ گنگ و جمن گیا
دیوانہ کوئی چھوڑ کے دشت و دمن گیا
ہر ایک سمت سے دردو غم بے قیاس ہے
"مجنوں جو مر گیا ہے تو جنگل اداس ہے"

تیرے الم میں آج سیاست ہے نوحہ خواں
ماتم میں ہے خلوص، مروّت ہے نوحہ خواں
ہے ہر سینہ چاک، محبّت ہے نوحہ خواں
ہندوستاں کی کہنہ شرافت ہے نوحہ خواں
معراجِ درد نیند ابدی سو رہی ہے آج
انسانیت کی روح لہو رو رہی ہے آج

---

[۱] غلام ربانی تاباں ۔ حرفِ اوّل (مشمولہ) ماتمِ نہرو ۔ جگن ناتھ آزاد، ص ۱۔

واشنگٹن میں وہ تری تقریر دلپذیر
تقریر بھی کوئی کہ پہاڑوں میں جوئے شیر
لندن بھی ماسکو بھی ترے نطق کے اسیر
عالم تیرے سخن کی تجلّی سے مستنیر
آیا کہاں سے نالہ، نَے میں سرورِ مے
اصل اس کی نَے نواز کا دل ہے کہ چوبِ نَے

نہرو کے علاوہ دوسری سیاسی شخصیتوں میں رفیع احمد قدوائی کا مرتبہ بھی بہت اہم ہے، وہ سیاست میں اپنا منفرد درجہ رکھتے تھے جن کی مدبّرانہ صلاحیتوں کا ہر کوئی معترف تھا۔ وہ خلوص کے پیکر تھے۔ اپنی تمام صلاحیتوں سے انھوں نے قوم کو فائدہ پہنچایا محکمۂ ڈاک، محکمۂ غذا اور دیگر شعبوں سے وہ وابستہ رہے۔ وہ جس شعبہ سے بھی وابستہ رہے اس کا پورا حق ادا کیا۔ قحط سالی کے زمانے میں رفیع احمد قدوائی مرحوم نے اپنی فراست وصلاحیت کے ذریعے سے ملک کی اس نازک ترین غذائی صورتِ حال پر بھی قابو پالیا تھا۔ آزاد نے اپنے مرثیے میں رفیع احمد قدوائی کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے ان کے کارناموں پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ مرثیے کے چند اشعار نقل کیے جاتے ہیں۔[۵]

ہند سے قحط ٹلا جس کی فراست کے طفیل
ہاں وہی صاحبِ اعجاز اسی خاک میں ہے
کیوں نہ ہو درد سے لبریز یہاں دل ہم کو
دل کے ہر درد کا ہمراز اسی خاک میں ہے
عقل بے تاب اسی خاک میں ہے محو سکوں
عشق کا جذبِ تگ و تاز اسی خاک میں ہے
اس پہ ہندو و مسلماں کے دل کیوں نہ جھکیں
محرمِ سبحہ و زنّار اسی خاک میں ہے
وہ خردمند کہ دیوانہ رہا تیرے لیے
ہاں وہ دیوانۂ ہشیار اسی خاک میں ہے

علمی اور ادبی شخصیتوں پر آزاد نے جو مرثیے لکھے ہیں ان میں "ماتم سالک" اور "مولانا ابوالکلام آزاد" بہت اہم ہیں۔ ابوالکلام آزاد سیاست سے بھی وابستہ رہے ان کی علمی وادبی زندگی بھی انتہائی اہمیت کی حامل ہے۔ علم وادب ہو کہ صحافت ان کا کردار تاریخی

حیثیت رکھتا ہے۔ مولانا آزاد کے خطبات، غبارِ خاطر، ترجمان القرآن، تذکرہ اور دوسری علمی و ادبی کتابیں اور تقریریں علم و ادب میں بہت اہم مرتبہ رکھتی ہیں۔ جگن ناتھ آزاد ابوالکلام آزاد سے خاصی عقیدت رکھتے تھے۔ ان کی شخصیت سے وہ بے حد متاثر تھے۔ اس بات کا ذکر انھوں نے کئی موقعوں پر کیا ہے۔ "آنکھیں ترستیاں ہیں" میں ایک مقالہ ہے جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ کس درجہ ابوالکلام آزاد سے متاثر تھے۔ ان کا دلی لگاؤ کس طرح کا تھا۔ ۲۹ فروری ۱۹۵۸ء کو مولانا ابوالکلام آزاد دنیا سے رخصت ہو گئے۔ آزاد نے اپنے مضمون میں اور پھر مرثیہ کے ذریعے مولانا مرحوم کی شخصیت کی بھرپور عکاسی کی ہے اور انھیں خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔ ان کی قوتِ حافظہ، سادگی اور معلومات پر آزاد نے خاصی روشنی ڈالی ہے۔ جہاں تک اس مرثیہ کا تعلق ہے اس میں بھی وہی انداز ہے۔ عقیدت و احترام ہے۔ قابلیت و صلاحیت کا اعتراف ہے۔ آزاد نے مولانا آزاد مرحوم کی علمی و ادبی زندگی کو ہی اپنے مرثیے میں جگہ دی ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

جس کا دھڑکا تھا بالآخر وہ گھڑی بھی آگئی
وہ خبر آئی کہ بزمِ زندگی تھرّا گئی
روشنی جس کی حریمِ روح کو چمکا گئی
ظلمتِ مرگ اس ستارے کو بھی آخر کھا گئی

جس سے روشن اپنے سینے تھے منوّر تھے دماغ
بجھ گیا وہ علم کا حکمت کا دانش کا چراغ

نطق کا، فن کا، ہنر کا، علم کا عرشِ عظیم
کشورِ ہندوستاں میں طورِ معنی کا کلیم
آبروئے عصرِ حاضر نازشِ دورِ قدیم
فلسفے کے اور مذہب کے گلستاں کی شمیم

یہ خزانۂ زندگی آخر کہاں گم ہو گیا
ظلمتوں میں اک شرارِ جاوداں گم ہو گیا

چودہ بند پر مشتمل یہ مرثیہ مولانا کی علمی و ادبی شخصیت کو ہی اجاگر نہیں کرتا بلکہ قوتِ تحریر و تقریر، علم و فن، سیاسی بصیرت، سوجھ بوجھ، فلسفے پر عبور، غرض ان کی شخصیت کے بہت سے پہلوؤں کا احاطہ کرتا ہے۔ آخری بند ہے ؎

اے غلاموں کا لہو گرمانے والے الوداع!
آگ سی الفاظ میں برسانے والے الوداع!
خود تڑپ کر بزم کو تڑپانے والے الوداع!
اے جگا کر ہند کو سو جانے والے الوداع!

"آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے"

ان مرثیوں کے علاوہ آزاد نے اور کئی مرثیے لکھے۔ ان میں ٹیگور، گاندھی اور ماتم سالک کافی مشہور اور بلند ادبی مقام رکھتے ہیں۔ عبدالمجید سالک (مرحوم) سے جگن ناتھ آزاد کا لگاؤ بچپن سے تھا۔ انھوں نے اپنی بزرگانہ شفقتوں سے آزاد کی تعلیم میں وسعت بخشی۔ یہی وجہ ہے کہ آزاد ہمیشہ ان کا ادب و احترام کرتے تھے۔ سالک مرحوم سے آزاد بے حد متاثر تھے۔ چنانچہ "آنکھیں ترستیاں ہیں" میں مرحوم کے بارے میں خاصی تفصیل موجود ہے۔ آزاد ایک مقام پر لکھتے ہیں:

"میں ان نوادرِ اقبال کو جو قبلہ سالک صاحب کے ذریعے سے مجھ تک پہنچے ہیں آج بھی اپنے سینے سے لگائے پھرتا ہوں۔"[۱]

اس اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آزاد کے دل میں سالک مرحوم کے لیے کتنی جگہ تھی یہی وجہ ہے کہ آزاد نے اپنے مرثیے میں دلی محبت کا اظہار کیا ہے۔ مرحوم کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے ان کے کارناموں و صلاحیتوں کو پیش کرتے ہیں۔ آزاد کے کلام میں خلوص اور سچائی ہے جس سے مرثیہ میں جان پڑ گئی ہے۔ جذبات کا بہاؤ ہے۔ دلی عقیدت و احترام ہر شعر سے ظاہر ہے۔ مرثیہ کے چند بند ملاحظہ کیجیے ؎

۱؎ جگن ناتھ آزاد۔ "آنکھیں ترستیاں ہیں" ص ۵۷۔

محفل کو گیا چھوڑ کے محفل کا وہ محبوب
ہر بات رہی جس کی پسندیدہ و مرغوب
جس کی نگہِ فیض سے ناخوب ہوئے خوب
کہتے تھے جسے اہلِ نظر کعبۂ مطلوب

اب کعبۂ مطلوب وہ پائیں تو کہاں ہم
اے وحشتِ دل بول کہ جائیں تو کہاں ہم

وہ پیار کا شفقت کا عنایت کا خزینہ
اخلاص و محبت کا، مودت کا خزینہ
وہ مہر و وفا کا وہ مروّت کا خزینہ
لٹتی ہوئی دیرینہ شرافت کا خزینہ

آخر کو لٹا گردشِ ایام کے ہاتھوں
یا صبح کی تنویر مٹی، شام کے ہاتھوں

آزاد کے اس مرثیہ کے بارے میں شیخ محمد نجم الہدیٰ شمس الضحیٰ لکھتے ہیں:

"سالک مرحوم فکر و معانی کے علم و ادب کے فن گفتگو کے ایک بحرِ بے کنار تھے جنھوں نے اردو ادب کی ایک نسل کی فکری و ذہنی تربیت کی ہے آزاد نے "ماتم سالک" میں ان ہی سارے گوشوں کو عقیدت و محبّت کی روشنی سے اجاگر کیا ہے"۔[1]

آزاد نے اپنے شخصی مرثیوں میں جہاں اپنے دکھ درد کا اظہار کیا ہے وہیں مرنے والوں کی شخصیتوں کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے۔ ان کے کارناموں پر روشنی ڈالی ہے۔ مرنے والوں کو خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔ ان کے پیام کو عام کیا ہے۔ اس طرح یہ مرثیے انفرادی ہوتے ہوئے بھی اجتماعی بن گئے ہیں۔ زندۂ جاوید و تابندہ شخصیتوں سے جڑ کر آزاد کے مرثیے زندۂ جاوید بن گئے ہیں۔

آزاد کا ایک مرثیہ "نمازِ عصر" ہے جس کا موضوع مذہبی ہے۔ کربلا کی تپتی ہوئی زمین پر اہلِ بیت پر مظالم ڈھائے گئے۔ بھوک، پیاس، گرمی کی شدت کے باوجود بھی حضرت امام حسینؓ نے نمازِ ظہر قضا نہیں کی۔ عصر کی نماز کے لیے تیار ہیں۔ گویا کہ حضرت امام

---

[1] شیخ محمد نجم الہدیٰ شمس الضحیٰ۔ اردو کے شخصی مرثیے اور جگن ناتھ آزاد (مشمولہ) سہ ماہی ملیحے لمحے" بدایوں ۱۹۸۸ء۔ مدیر حبیب سوز، ص ۲۵۳، ۲۵۴۔

حسین رض نے تلوار کے سایے میں نمازِ عصر ادا کی۔ آزاد نے عقیدت مندانہ احساسات و خیالات اور جذبات کے ساتھ اس مرثیے کو لکھا ہے۔ مرثیے کے ہر بند میں عقیدت و احترام کا جذبہ موجود ہے۔ چند بند درج کیے جاتے ہیں ؎

میری نوا میں سوزِ کہن رونما ہے آج   درپیش نغمگی کو عجب معرکہ ہے آج
دنیائے دل میں ایک قیامت بپا ہے آج   میری زباں پہ تذکرۂ کربلا ہے آج
چھیڑا ہے دل نے آج شہادت کا تذکرہ
بے مثل و بے عدیل عبادت کا تذکرہ

اوپر تلے تپے ہوئے ذروں کا انتشار   ہتھیار جس قدر ہیں ہیں بدن پر ہیں شعلہ زار
اور اس کے ساتھ ساتھ ہیں چاروں طرف سے وار   سر تیغ سے شکستہ جگر تیر سے فگار
دو دن ہوئے ہیں پینے کو پانی ملا نہیں
لیکن نمازِ ظہر یہاں بھی قضا نہیں

دیکھا اے نگاہ دیکھ یہ منظر جگر خراش   تابِ نظر کہاں کہ کلیجہ ہے پاش پاش
فریاد سے فضاؤں میں پیدا ہے ارتعاش   کیا اے فلک تجھے تھی اسی وقت کی تلاش
دستِ قضا کو صبر ذرا بھی نہ ہو سکے
اور عصر کا فریضہ ادا بھی نہ ہو سکے

وہ ہاتھ اٹھا لعین کا شمشیر تول کر   بھرپور وار جسم ادھر اور سر ادھر
اے بے سوادِ رازِ حقیقت سے بے خبر   سجدہ یہی ہے سجدۂ معبود کم نظر
بے مثل و بے عدیل شہادت یہی تو ہے
کہتے ہیں جس کو اصل عبادت یہی تو ہے[1]

آزاد نے اب تک جتنے بھی مرثیے لکھے ہیں ان میں سوز و گداز کی کمی نہیں۔ جذبات کہیں کہیں سیل بن کر بہہ گئے ہیں۔ ادبی اور سیاسی شخصیتوں کے کارناموں کا ذکر کر کے آزاد نے ان مرثیوں کو آفاقی اور اجتماعی حیثیت عطا کی ہے۔ ڈاکٹر عبدالستار دلوی

---

[1] جگن ناتھ آزاد "نمازِ عصر" (مشمولہ) رثائی ادب میں ہندوؤں کا حصہ (مرتبہ) جعفر حسین، ص ۱۸۷، ۱۸۸۔

آزاد کے مرثیوں سے متعلق لکھتے ہیں:

"آزاد نے اپنے لکھے ہوئے مرثیوں میں کئی شخصیتوں کی تہوں کو کھوج نکالنے کی بھی کوششیں کی ہیں کبھی ان کی بلند قامتی اور عظمت کے پہلو اجاگر کیے ہیں تو کبھی ان کے کارناموں کو دہرا کر ان کے پیام کی ترجمانی ان کا مقصد رہا ہے ان سے آزاد کی صرف وقتی مرثیہ خوانی ظاہر نہیں ہوتی بلکہ ادبی حیثیت سے ان کی اہمیت ارفع ہے۔" [1]

---

[1] ڈاکٹر عبدالستار دلوی ۔ "اردو شاعری میں شخصی مرثیوں کی روایت اور جگن ناتھ آزاد" (مشمولہ) جگن ناتھ آزاد۔ ایک مطالعہ" مرتبہ ایوب واقف، ص ۱۹۳۔

جگن ناتھ آزاد بحیثیت رُباعی گو

جدید تحقیقات نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ رباعی کا وزن اسلامی زمانے سے پہلے کا ہے اور یہ ایران میں ایجاد ہوئی۔ اگرچہ اس کا نام عربی ہے لیکن اسے یہ نام بہت زمانے کے بعد دیا گیا ہے۔

تیسری چوتھی ہجری کی تاریخ سے پتا چلتا ہے کہ رباعی کو اُس زمانے میں "ترانہ" کہتے تھے۔ لوگ عموماً اسے گیت کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ یہ فارسی شاعری میں خاصی وسعت اختیار کر گئی۔ یہاں تک کہ دوسرے اصناف اس کے مقابلے میں پیچھے رہ گئے۔ فارسی میں بیسیوں ایسے شاعر گزرے ہیں جنھوں نے رباعی گوئی کی بدولت لازوال شہرت حاصل کی۔ عمر خیّام کا نام تو ہر خاص و عام کی زبان پر ہے۔ رباعی ایسی صنف ہے جو تخیّل کی بلندی اور بیان کی پختگی چاہتی ہے۔

اردو میں گرچہ کہ شاعری کے دوسرے اصناف نے انتہا درجہ ترقی حاصل کی مگر فارسی رباعی کے مقابلے میں اردو رباعی گوئی کو زیادہ ترقی نہیں ملی۔ ابتدا میں اردو رباعی ودکنی رباعیاں عشقیہ مضامین و پند و نصائح کا ذریعہ بنی رہیں۔ آگے چل کر اس میں خاصی وسعت پیدا ہوئی۔ موجودہ زمانے میں رباعیات کے موضوع میں خاصی تنوّع اور وسعت موجود ہے۔ رباعی میں مدح و ذم، عشق و تصوّف، مذہب، اخلاق،

پند و نصائح، سیاسیات اور سماجیات غرض ہر طرح کے مضامین باندھے جاتے ہیں۔

دکن میں رباعی گو شعرا کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ محمد قلی قطب شاہ، غواصی، وجہی، عادل شاہ ثانی وغیرہ کے کلام میں رباعیوں کی تعداد خاصی ہے[1] شمالی ہند کے مشہور شاعروں میں مرزا محمد رفیع سودا، خواجہ میر درد، سوز، میر تقی میر، انشا، جرأت اور مصحفی وغیرہ نے رباعی میں طبع آزمائی کی ہے۔ ان میں بعض کامیاب رباعی گو ہیں۔ میر انیس نے بہت سی رباعیاں کہی ہیں۔ ان کے یہاں تمام مروجہ مضامین ملتے ہیں۔ انھوں نے واقعاتِ کربلا پر بھی رباعیاں کہی ہیں۔ حالی کی رباعیاں، اُن کے اصلاحی مقصد کی پوری عکاسی کرتی ہیں۔ اکبر الہ آبادی نے بھی بہت سی رباعیاں اپنے رنگ میں کہی ہیں۔ جوش اور فراق کے کلام میں بھی رباعیوں کی تعداد اچھی خاصی ہے۔

دورِ جدید میں رباعی گو شعرا میں جگن ناتھ آزاد کا نام بھی اہمیت کا حامل ہے ان کی شاعری میں جس طرح دوسرے اصناف کا اپنا ایک الگ رنگ ہے اسی طرح ان کی رباعیاں بھی کئی رنگوں سے مزین ہیں۔ وہ جو بات کہتے ہیں، اخلاص کے ساتھ کہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے بات تیر کی طرح دل میں اتر جاتی ہے۔ آزاد کی رباعیوں میں درد و کرب کا احساس موجود ہے۔ دوست احباب کی یادیں ہیں۔ وطن سے دوری کا احساس ہے۔ "وطن میں اجنبی" کی دو رباعیاں ملاحظہ کیجیے ؎

جب یادِ وطن کے صبح و شام آتے ہیں
سینہ دردِ نہاں کا دل پہ برساتے ہیں
لمحاتِ گزشتہ بن کے شمشیر و سناں
بے ساختہ روح میں اتر جاتے ہیں[2]

طوفاں سا روح میں اُٹھاتی ہوئی آئیں
احساس میں نشتر سے چلاتی ہوئی آئیں
بچھڑے ہوئے احباب کی پیاری یادیں
پھر آج مرا درد بڑھاتی ہوئی آئیں[3]

آزاد کی رباعیوں میں بھی درد و کرب کا احساس ہر جگہ موجود ہے۔ بعض رنگین اشعار

---

[1] پروفیسر سیدہ جعفر۔ دکنی رباعیاں۔ [2] جگن ناتھ آزاد۔ وطن میں اجنبی، ص ۱۴۳۔ [3] ایضاً، ص ۸۱۔

میں بھی ایک قسم کی بے خودی کی کیفیت موجود ہے۔ جب بھی وہ کسی موضوع کو اپناتے ہیں خود بخود یا تو محبوب گم گشتہ کو یاد کرنے لگتے ہیں یا پھر وطن اور احباب کا ذکر چھیڑ دیتے ہیں۔ یہ تاثر ان کی تقریباً تمام رباعیوں میں موجود ہے۔ دو رباعیاں نقل کی جاتی ہیں ؎

منظر کوئی اب نظر کو بھاتا ہی نہیں
اب کوئی نگاہوں میں سماتا ہی نہیں
یا تیرا خیال دل میں آیا ہی نہ تھا
یا تیرا خیال دل سے جاتا ہی نہیں[1]

شام آتی ہے آزاد! بیابانوں میں
ہاں ریل کا ایک شور ہے میدانوں میں
پھر دل پہ مرے اک اداسی چھائی
پھر جاگ اٹھا ہے کوئی ارمانوں میں[2]

سیّد وحید اشرف نے جگن ناتھ آزاد کی رباعیوں کا گہرا مطالعہ کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"اگر وہ رباعی بلا مقصد لکھتے اور جب چاہتے صفحۂ قرطاس پر قلم کی جولانی دکھانا شروع کر دیتے تو اب تک ان کی رباعیوں کی ایک کثیر تعداد ہوتی۔ لیکن آزاد کی کل رباعیوں کی تعداد کم و بیش ایک سو پچاس ہے جو اُن کے مختلف مجموعوں میں بکھری ہوئی ہیں۔"[3]

پہلی بات یہ ہے کہ آزاد نے ہمیشہ بامقصد شاعری کی ہے چاہے رباعی گوئی ہو یا مرثیہ نگاری، جہاں تک رباعی کی تعداد بڑھانے کا سوال ہے، یہ کوئی اہم کام نہیں۔ اگر رباعیوں کی تعداد ایک سو پچاس بھی مان لی جائے تو اس سے آزاد کی شخصیت و مرتبے میں کوئی فرق نہیں آتا۔ آزاد نے مجموعۂ کلام کی تکمیل کے لیے کبھی شاعری نہیں کی تو بھلا وہ رباعی کیوں کہتے۔

آزاد کی رباعیوں میں فنی پختگی پائی جاتی ہے۔ فکر و خیال کے اعتبار سے بھی ان رباعیوں کو اعلیٰ درجہ حاصل ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ بیکراں، وطن میں اجنبی اور ستاروں

---

1. آزاد۔ نوائے پریشاں، ص ۹۳۔ 2. آزاد۔ بوئے رمیدہ، ص ۴۰۳۔
3. سیّد وحید اشرف۔ "جگن ناتھ آزاد بحیثیت رباعی گو" (مشمولہ) کتاب نما کا خصوصی شمارہ اپریل ۱۹۹۴ء، مرتبہ ایم۔ حبیب خاں، ص ۶۱۔

سے ذرّوں تک کی رباعیوں میں وہ فنی پختگی نہیں ہے جتنی کہ بعد کی رباعیوں میں ہے۔ مگر اس کے باوجود آزاد کی ابتدائی رباعیوں میں موضوع کو کافی اہمیت حاصل ہے۔ آزاد کا مزاج بنیادی طور پر نظم گوئی کی طرف مائل تھا۔ اس لیے ان کی ابتدائی شاعری میں رباعیوں کی تعداد کم ہے۔ نظم نگاری کے مقابلے میں غزلوں کی تعداد بھی بہت کم ہے۔ آزاد کی ابتدائی رباعیاں ملاحظہ ہوں ؎

احساس میں لَو دمک رہی ہے گویا　　پیمانے سے مے چھلک رہی ہے گویا
آنکھیں ہیں کہ ہر لحظہ جھپک جاتی ہیں　　شبنم پہ کرن تھرک رہی ہے گویا

ماحول ہے روشنی لُٹانے والا　　تاریک کرّہ ہے جگمگانے والا
جو دورِ نشاط ہے تری نظروں میں　　وہ دورِ نشاط ہے اب آنے والا

اشعار پہ اشعار چلے آتے ہیں　　افکار پہ افکار چلے آتے ہیں
یہ کس نے اٹھا دیا نگاہوں سے حجاب　　کھلتے ہوئے اسرار چلے آتے ہیں[1]

آزاد کی ان رباعیوں میں کہیں فنّی کمی کا احساس نہیں ہوتا۔ فکر اور موضوع بھی اعلیٰ ہے۔ آزاد ترقی پسند تحریک سے وابستہ نہ ہوتے ہوئے بھی ترقی پسندی کی طرف مائل بہ طبع رہے۔ انھوں نے جہاں آزادی اور جشنِ آزادی کے نغمے سنائے ہیں وہیں مزدوروں پر ڈھائے گئے مظالم کے خلاف بھی آواز اٹھائی۔ سرمایہ دارانہ نظام پر بھی تنقید کی ہے۔ دنیا کی بڑھتی ہوئی ترقی سے کبھی آنکھیں بند نہیں کیں۔ حقیقت پسندی کی نظروں سے دنیا کو دیکھا، نبض شناسی کی اور انھیں باتوں کو اپنی شاعری میں جگہ دی، جن کی ضرورت موجودہ دور کو ہے۔ اس مجموعے کی ایک اور رباعی ملاحظہ کیجیے ؎

تو کس کو سنا رہا ہے نغمے، گاتے　　اے شاعر خود فریب! اے دیوانے!
سرمایہ، ادب کو مول لے سکتا ہے　　سرمایہ مقام شعر کیوں پہچانے[2]

---

[1] جگن ناتھ آزاد۔ ستاروں سے ذرّوں تک، ص ۱۹۰۔ [2] ایضاً ص ۹۶۔

آزاد کی ان رباعیوں کو دیکھ کر بہ خوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اُن کے کلام میں کس قدر روانی ہے۔ اظہارِ بیان میں شگفتگی، رنگینی اور لطافت ہے، زبان و بیان میں گیرائی اور گہرائی ہے۔

"نوائے پریشاں" اور "بوئے رمیدہ" میں جو رباعیاں ہیں ان کے موضوعات زیادہ تر عشقیہ ہیں، بعض رباعیوں میں فلسفیانہ خیالات بھی باندھے گئے ہیں، تصوّف، مذہب اور سیاست کو بھی اپنا موضوع بنایا ہے۔ فن اور فن کار کے موضوع پر اظہارِ خیال کیا گیا ہے۔ چند رباعیاں ملاحظہ کیجیے ۔

تم نغمۂ سازِ دل سے ناواقف ہو　　کیفیتِ رازِ دل سے ناواقف ہو
الفاظ کی گھن گرج پر مرتے ہو تم　　تم لوگ گدازِ دل سے ناواقف ہو[1]

"کتنا اچھا کہا" کا محتاج نہیں　　شاعر کبھی واہ وا کا محتاج نہیں
ہر حال میں یہ فضا کو مہکاتا ہے　　جو پھول ہے وہ صبا کا محتاج نہیں[2]

پھر بزمِ سخن میں آ کے اشعار سناؤ　　اقبالؔ و امیرؔ و داغؔ واپس آجاؤ
جس دور میں سانس لے رہا ہے آزادؔ　　اس دور میں زندہ رہ کے اک دن تو دکھاؤ[3]

بلبل کی طرح دشت میں چہکا ہوں میں　　پتھر پہ مثالِ سبزہ لہکا ہوں میں
باغات کی دنیا میں مہکنے والو　　صحرا میں گلاب بن کے مہکا ہوں میں

آزاد کو اقبالؔ اور اردو زبان دونوں سے محبّت ہے۔ اگر آپ ان کو باتوں میں مشغول رکھنا چاہتے ہیں تو اقبالؔ یا اردو کا ذکر چھیڑ دیں پھر وہ کام کی بات بھی بھول جائیں گے۔ اس لیے جہاں انھوں نے نظموں اور غزلوں میں اردو کے متعلق اپنے خیالات

---

[1] آزاد۔ بوئے رمیدہ، ص ۲۹۵۔ [2] آزاد۔ نوائے پریشاں، ص ۲۴۔ [3] ایضاً ص ۱۱۹۔

کا اظہار کیا ہے۔ وہیں رباعیوں میں بھی اس طرح کے خیالات موجود ہیں۔ دو رباعیاں ملاحظہ کیجیے ؎

اردو ہے فقط زبان، کہسار نہیں — اک موج شمیم ہے، یہ تلوار نہیں
مشکل نہیں اردو کا مٹانا لیکن — کیا اپنے تمدن سے تمھیں پیار نہیں

اردو سے یہ فقدان محبت کیوں ہے — اپنی تہذیب سے عداوت کیوں ہے
تھے ہند کا فخر غالبؔ و داغؔ و انیسؔ — پھر اُن کی زباں سے یہ نفرت کیوں ہے

عام طور پر رباعی گو شعرا نے مصلح، پیامبر اور واعظ بن کر رباعیوں میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ بعض موقعوں پر آزادؔ بھی اپنی رباعیوں میں اسی طرح نصیحت کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ آزادؔ کی اصلاح اور رائے میں پیار اور محبت کا جذبہ ہر قدم پر موجود ہے۔ خلوص کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوٹتا۔ رباعیاں ملاحظہ کیجیے ؎

مفہوم تری سمجھ میں آیا کہ نہیں — غم بھی تری روح میں سمایا کہ نہیں
اے مری نوا پہ جھوم جانے والے — کچھ روح کلام کو بھی پایا کہ نہیں[1]

ہاں رات کی حیثیت سے بے علم نہ رہ — ناواقفیت کی موج میں دیکھ نہ بہہ
تو رات کو محض چند لمحے نہ سمجھ — خود زیست ہے زیست کا اسے جزو نہ کہہ

آزادؔ کی رباعیوں میں عشقیہ مضامین بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ باندھے گئے ہیں۔ آزادؔ نے جن رباعیوں میں عشقیہ مضامین پیش کیے ہیں ان میں غزل کی لفظیات DICTION کا پرتو صاف نظر آتا ہے۔ چند رباعیاں ملاحظہ کیجیے ؎

اے پیکر ناز، رنگ و بو کی تصویر — اے جسم گداز مثل دیبا و حریر
رہ رہ کے تصور میں چمک اٹھتی ہے — چہرے پہ ترے وہ مسکراہٹ کی لکیر[2]

---

[1] آزادؔ۔ نوائے پریشاں، ص ۱۲۰۔ [2] ایضاً ص ۹۳۔

ہاں یاد ہے ذہن میں اُبھرنا ترا — آنکھوں سے مرے دل میں اُترنا ترا
خود اپنے مکاں پہ مجھ کو دعوت دے کر — وہ مجھ سے جھجک کے بات کرنا ترا

آزاد نے عشق مجازی کے ذکر کے ساتھ عشق حقیقی کو بھی اپنا موضوعِ سخن بنایا ہے۔ آزاد اپنی رباعیوں میں بھی ایک فلسفی، دانشور اور کبھی شاعر دل برداشتہ کی طرح اپنی بات بڑی خوبصورتی کے ساتھ کہہ جاتے ہیں ؎

گردوں پہ وہ دور اک ستارا چمکا — ظلمات میں تابندہ شرارا چمکا
لیکن وہ فروغ دل کہ ہے شام سے سرد — ٹھنڈا ہو کر نہ پھر دوبارا چمکا[1]

ہر ضرب خموش دل پہ سہہ جاتی ہے — اک نور کی موج ہے کہ بہہ جاتی ہے
وہ بات کسی زباں پہ آتی ہی نہیں — جو بات بشر سے رات کہہ جاتی ہے

گہوارۂ درد غم میں سو جاتا ہے — کیا جانے کس جہاں میں کھو جاتا ہے
اکثر دیکھا ہے اس سفر میں آزاد — ہر شام کو دل اداس ہو جاتا ہے

بادل بھی ہوئے سیاہ رفتہ رفتہ — ظلمت ہوئی بے پناہ رفتہ رفتہ
ماحول پہ اک نظر جو ڈالی میں نے — دل سے اٹھی اک آہ رفتہ رفتہ

(بوئے رمیدہ)

سیّد وحید اشرف آزاد کی رباعیوں کے متعلق لکھتے ہیں :

"آزاد کی رباعیاں جہاں فنّی اعتبار سے اپنا ایک امتیاز رکھتی ہیں وہاں فکری اعتبار سے بھی خاص امتیاز کی حامل ہیں۔ آزاد کی رباعیاں بھی ان کے اخلاقی نقطۂ نظر کو پیش کرتی ہیں لیکن ان کی اخلاقیات میں انسانیت کا وہ بنیادی کردار جھلکتا ہے جس پر

---

[1] بوئے رمیدہ، ص ۴۰،۴۸۔

ساری انسانیت کا ایمان ہے۔ ایسا کہیں نہیں محسوس ہوتا کہ جیسے وہ کوئی موروثی درس دہرا رہے ہوں۔ یہ درست ہے کہ شرافت اور سلیم الطبعی آزاد کو ورثہ میں ملی ہے۔ ان کی ذہنی تربیت میں بھی موروثی اثرات کارفرما رہے ہیں لیکن جوہر ذات خود ان کا اکتساب کردہ ہے اور یہی جوہر ذاتی وجدان میں تحلیل ہو کر رباعی کی شکل میں نمودار ہوا ہے۔ اس میں ان کے ذاتی تجربات ومشاہدات بھی شامل ہیں۔"[1]

آزاد کی رباعیوں میں نصیحت کرنے کا لہجہ انتہائی نرم اور مشفقانہ ہے۔ خلوص کا جذبہ ہر شعر میں موجود ہے۔ اس لیے ان کی ہر نصیحت قابلِ قبول بھی ہے اور دل پذیر بھی؎

احباب کا ہر ناز اُٹھاتے جاؤ
مٹّی میں خودی اپنی ملاتے جاؤ
احباب کے ساتھ مل کے رہنے کے لیے
احباب کا ہر فریب کھاتے جاؤ[2]

ایک اور رباعی ملاحظہ کیجیے ؎

ذرّے کو نگاہوں میں بسا لے پہلے
تحقیق کے ہاتھوں میں اٹھا لے پہلے
صحراؤں کی وسعت تو بڑی شے ہے یہاں
اک ذرّے کی وسعت کو تو پا لے پہلے[3]

آزاد بنیادی طور پر نظم گو شاعر ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام کے مجموعوں میں غزلوں کی تعداد بھی کم ہے۔ رباعیات انھوں نے بہت کم کہی ہیں۔ آزاد جو کچھ کہنا چاہتے ہیں وہ غزل اور نظم کے ذریعے وقتاً فوقتاً پیش کرتے رہتے ہیں۔ رباعی گوئی کی طرف انھوں نے زیادہ توجہ نہیں دی مگر ان سب کے باوجود ان کی رباعیوں کو دیکھ کر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کے یہاں وہ سب کچھ ہے جو ایک کامیاب رباعی گو شاعر کے پاس ہونا چاہیے۔ آزاد کو دوسرے شعراء سے علاحدہ کرنے والی چیز ان کا اپنا

---

1. سید وحید اشرف ـ "جگن ناتھ آزاد بحیثیت رباعی گو" (مشمول کتاب نما کا خصوصی شمارہ اپریل ۱۹۹۴ء مرتبہ ایم۔ حبیب خاں، ص ۶۴، ۶۵۔
2. آزاد ـ نوائے پریشاں، ص ۱۲۰۔ 3. ایضاً، ص ۱۴۱۔

موضوع اور منفرد لب و لہجہ ہے۔ انھوں نے اپنی رباعیوں میں بھی انسانیت کے پیغام کو عام کیا ہے۔ زندگی کے مسائل بیان کیے ہیں۔ اپنے منفرد لب و لہجے کے ذریعے وہ چھوٹے بڑے کو نصیحت کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ان کے کلام میں سادگی ہے۔ احساس و جذبات کا بہاؤ ہر جگہ موجود ہے۔ بہر حال آزاد ایک کامیاب رباعی گو ہیں، ان کی کامیابی کا مظہر اگرچہ ان کی تمام رباعیاں نہیں ہیں مگر "نوائے پریشاں" کی رباعیاں اور "بوئے رمیدہ" کی رباعیوں کو ہم ضرور پیش کر سکتے ہیں۔ آزاد اب بھی لکھ رہے ہیں۔ اس لیے امید ہے کہ ان کی شاعری اسی طرح پروان چڑھتی رہے گی اور وہ رباعی کی طرف بھی توجہ دیں گے۔

چوتھا باب

جگن ناتھ آزاد بحیثیت ماہرِ اقبالیات

جگن ناتھ آزاد ایک ہمہ جہت شخص ہیں۔ ایک طرف وہ مشہور اور کامیاب شاعر ہیں تو دوسری طرف بہت اچھے نثر نگار و نقاد ہیں۔ انھوں نے سوانح نگاری کی ہے اور خاکے بھی کھینچے ہیں۔ ان کے سفرنامے بھی بہت مشہور ہوئے ہیں۔ ادب میں ان فن پاروں کی خاصی اہمیت ہے۔ مگر ان سب میں آزاد کا مرتبہ اقبالیات کے سلسلے میں بہت ہی بلند ہے۔ وہ ہندوستان و پاکستان ہی میں نہیں بلکہ ساری دنیا میں جہاں کہیں اردو زبان بولی جاتی ہے وہاں آزاد ماہرِ اقبالیات کی حیثیت سے پہچانے جاتے ہیں۔

علامہ اقبال کی شخصیت ایک جلوۂ صد رنگ بلکہ ہزار رنگ کا مرقع ہے۔ ایک طرف وہ شاعر ہیں تو دوسری طرف مفکر و مصلح بھی ہیں۔ وہ قوم کے معمار بھی ہیں۔ وہ تمام ہندوستانیوں کے لیے روشن ستارے کی مانند ہیں۔ ان کے افکار و اشعار نے تمام عالم کے انسانوں کو جھنجھوڑ ڈالا۔ علامہ اقبال کے کلام میں تمام بنی نوعِ انساں کے لیے درس ہے۔ آزادی کی تڑپ، خودداری کا پیغام، جرأت، ہمّت و حوصلے کا پیغام ہے اور خودی کے ذریعے سے انقلاب کا درس ہے۔ علامہ اقبال ایک بہت بلند پایہ شاعر ہیں۔ ان کی شخصیت ہمہ گیر ہے۔

علامہ اقبال کی فکر کا سرچشمہ قرآن ہی ہے۔ ان کا دیا ہوا پیغام بلاشبہ اسلام سے

مستعار ہے مگر اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہم علامہ اقبال کی عظیم شخصیت کو صرف اسی پیمانے سے ناپیں، کسی ایک خانے میں رکھ کر ان کی شخصیت کی عکاسی کرنا علامہ اقبال اور ان کے کلام کے ساتھ ناانصافی ہے۔

جگن ناتھ آزاد نے ۱۹۳۶ء سے ہی اقبال کے بارے میں لکھنا شروع کر دیا تھا۔ چنانچہ ان کا پہلا مضمون "اقبال کی منظر نگاری" "ہمایوں" مئی ۱۹۳۶ء میں شائع ہوا تھا۔ اس زمانے میں اقبال کے کلام کے چرچے ہر جگہ ہو رہے تھے۔ اقبال کی نظمیں کتابچوں کی شکلوں میں شائع ہوتی تھیں۔ ان کا کلام زبان زد خاص و عام ہو گیا تھا۔ علامہ اقبال کے شیدائیوں میں جگن ناتھ آزاد بھی تھے، جن کو علامہ کی تقریباً سبھی نظمیں اور غزلیں یاد ہیں۔ وہ "حافظ اقبال" کے نام سے مشہور ہوئے۔

آزادی کے بعد ہندوستان میں علامہ اقبال کا نام لینا دشوار ہو گیا تھا حکومت کی طرف سے کوئی پابندی عائد نہیں تھی مگر عام طور پر ریڈیو، ٹی وی اور جلسوں میں علامہ اقبال کا نام نہیں لیا جاتا تھا۔ یہ سلسلہ تقریباً ۱۹۵۵ء سے ۱۹۹۶ء تک جاری رہا۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ عام طور پر ہندوستانیوں کا یہ خیال تھا کہ ملک کی تقسیم کی ذمہ داری علامہ اقبال کے خطبۂ صدارت پر ہے جو انھوں نے ۱۹۳۰ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس منعقدہ الٰہ آباد میں پڑھا تھا۔ آزادی سے چند سال قبل یا آزادی کے فوراً بعد علامہ اقبال کے متعلق لکھنے والوں میں آل احمد سرور، مجنوں گورکھپوری، علی سردار جعفری اور سید عابد حسین وغیرہ کے نام اہم ہیں۔ علی سردار جعفری نے جو کتاب لکھی وہ کسی حد تک ANTI-IQBAL رجحان لیے ہوئے تھی۔ اسی طرح ڈاکٹر سچدانند سنہا نے جو آزادی سے ذرا قبل یعنی ۱۹۴۷ء میں ہی جو کتاب لکھی اس میں علامہ اقبال پر چند باتوں کی وجہ سے اعتراضات کیے گئے تھے۔ بعض کا کہنا تھا کہ اقبال صرف مسلمانوں کے شاعر ہیں جب کہ بعض فاشسٹ ہونے کا ہی الزام لگا رہے تھے۔ چنانچہ سچدانند سنہا کا یہی اعتراض تھا کہ اقبال کا کلام صرف مسلمانوں کے لیے ہی ہے اور اس میں کوئی عالمگیر اپیل نہیں ہے۔

آزاد کے ابتدائی مقالے انہیں بنیاد پر لکھے گئے چنانچہ "شعر اقبال کا ہندوستانی

پس منظر" اور" اقبال کے کلام کا صوفیانہ لب و لہجہ" اور" اقبال اور اس کا عہد"، یہ تینوں مقالے اسی دور میں لکھے گئے۔ اس لیے ضروری ہے کہ جب ہم ان مقالوں کا تنقیدی جائزہ لیں تو اس دور کے سیاسی اور سماجی پس منظر کو ضرور مدِ نظر رکھیں۔ آزاد اپنے ان مقالوں کے متعلق لکھتے ہیں:

"سنہ ۱۹۵۴ء، سنہ ۱۹۵۵ء کا ایک ذاتی واقعہ سُن لیجیے۔ جناب آصف علی اصغر مجنوں جموں و کشمیر یونیورسٹی سری نگر کے وائس چانسلر تھے۔ انھوں نے مجھ سے فرمائش کی کہ میں جموں و کشمیر یونیورسٹی سری نگر میں تین لکچر غالب کے فکر و فن کے متعلق دوں اور پھر یہی لکچر یونیورسٹی کے جموں ڈیژن میں بھی دیے جائیں۔ جموں میں اس وقت الگ یونیورسٹی نہیں تھی۔

میں نے ان سے کہا کہ غالب پر بھی کبھی میں لکچر دوں گا لیکن اس وقت تو آپ مجھ سے اقبال پر لکچر دلوائیے۔ فیضی صاحب سنّاٹے میں آ گئے، فرمانے لگے سنہ ۱۹۴۷ء سے کر آج تک کسی نے جموں و کشمیر میں اقبال کا نام نہیں لیا۔ آپ کیوں اس موضوع پر لکچر دینا چاہتے ہیں۔ میں نے کہا ایسا نہیں ہے .... محترم فیضی صاحب کی فرمائش پر یہ تین لکچروں کے عنوانات یہ تجویز کیے:

(۱) کلامِ اقبال کا ہندوستانی پس منظر

(۲) کلامِ اقبال کا صوفیانہ لب و لہجہ

(۳) اقبال اور اس کا عہد۔" [۱]

ان مقالات کے تیار کرنے کے بعد آزاد کو مذکورہ جموں و کشمیر یونیورسٹی میں لکچر دینے کی اجازت نہیں ملی۔ کچھ مدت بعد یہ لکچرس کتابی صورت میں "اقبال اور اس کا عہد" کے نام سے

---

[۱] جگن ناتھ آزاد — "ہندوستان میں اقبالیات آزادی کے بعد" ص ۱۷، ۱۸۔

ادارۂ انیس اردو الٰہ آباد سے شائع ہوئے۔ "ہندوستان میں اقبالیات۔ آزادی کے بعد" اس مضمون کو بھی آزاد نے انھیں حالات کے پس منظر میں لکھا۔ آزاد نے اقبال پر لگائے گئے تمام الزامات کا جواب دیا۔ چنانچہ "اقبال اور اس کا عہد" کے "حرفِ اوّل" میں لکھتے ہیں:

"اسلام کی محبت اقبال کے رگ و ریشہ میں رچی ہوئی تھی یہ کیفیت اقبال کے کلام میں اوّل سے آخر تک نمایاں ہے لیکن یہ اقبال اور کلامِ اقبال سے بے اعتنائی برتنے کی کوئی وجہ نہیں ہے نہ ہی اس بنا پر ہم اقبال کے نظریات کو رد کرنے کا حکم صادر فرما سکتے ہیں۔ ملٹن اور ڈانٹے عیسائیت کی محبت سے سرشار تھے اور تلسی داس اور رابندر ناتھ ٹیگور کا کلام میں ہندو دھرم سے عشق بے پایاں کا جذبہ کارفرما نظر آتا ہے۔ عشقِ مذہب، عشق بنی نوع انسان تک پہنچنے کا ایک صالح ذریعہ ہے۔ ان دونوں میں اگر دیکھنے والوں کو تضاد نظر آئے تو اسے کم نظری کے سوا اور کس بات پر محمول کیا جا سکتا ہے"۔ [۱]

آزاد نے اپنے مقالوں میں اس بات پر زور دیا کہ اقبال کو مختلف خانوں میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔ ان کی شخصیت ہمہ گیر ہے اور انھوں نے ہندوستان سے کبھی بھی بے تعلقی نہیں برتی۔ انھیں صرف اسلامی شاعر کہنا غلط فہمی کا نتیجہ ہے۔ انھوں نے اس بات پر بھی زور دیا ہے کہ اقبال نے ہندوستان اور ہندوستان کے مناظر فطرت، مذہبی روایات، درویشوں، رشیوں منیوں اور فقیروں سے محبت کی ہے۔ چنانچہ "بانگ درا" میں "ہمالہ" سے لے کر جاوید نامہ کے فارسی کلام تک میں یہ اثرات پائے جاتے ہیں۔ آزاد نے ان پہلوؤں کی طرف توجہ کی اور ان کا حق ادا کیا۔ اس موضوع سے متعلق آزاد کا مطالعہ بہت وسیع ہے۔ ایک طرف کلامِ اقبال ازبر ہے تو دوسری طرف ہندوستانی قدیم مذاہب کے بارے میں بھی خاصی معلومات رکھتے ہیں۔ آزاد

۱۔ جگن ناتھ آزاد۔ اقبال اور اس کا عہد، ص ۱۱، ۱۲۔ الادب لاہور۔

کے خیال میں اقبالؔ کے یہاں ہندوستانی تہذیب و روایات کا سب سے زیادہ احترام پایا جاتا ہے اور یہ خاص زمانے تک محدود نہیں۔ ایک مقام پر لکھتے ہیں:

"۱۸۵۷ء سے لے کر آج تک شاید ہی کوئی اردو یا فارسی کا ہندوستانی شاعر ایسا نظر آئے جس نے قدیم بھارتی سنسکرتی کو اس احترام کی نگاہ سے دیکھا ہو جس سے علّامہ اقبال نے دیکھا ہے اور اس سے اس قدر فیض حاصل کیا ہو جس قدر اقبالؔ نے کیا ہے۔"[۱]

اقبالؔ کے "حبِ وطن" اور "حبِ اسلام" کے بارے میں ایک انٹرویو کا جواب دیتے ہوئے کہتے ہیں:

"میں یہ سمجھتا ہوں کہ حبِ وطن اور حبِ اسلام اقبال کے یہاں دونوں اوّل سے آخر تک موجود ہیں ع

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا

تو ۱۹۰۴ء کی نظم ہے، اس سے پہلے ان کا کلام دیکھیں ۱۹۰۰ء تک کا جو بے شک "بانگِ درا" میں شامل نہیں ہے۔ لیکن ہے تو انھیں کا کلام ۱۹۰۰ء کی نظم "نالۂ یتیم" ساری کی ساری نظم اوّل سے آخر تک "حبِ اسلام" سے لبریز ہے۔ اس کے بعد ایک نظم ہے "ایک یتیم کا خطاب ہلالِ عید سے" وہ ساری کی ساری حبِ اسلام سے لبریز ہے۔ اس طرح ۱۹۰۲ء کی نظم "اسلامیہ کالج کا خطاب پنجاب سے" ساری کی ساری حبِ اسلام سے لبریز ہے۔ کلامِ اقبال میں حبِ وطن بھی آخر تک رہی اور حبِ اسلام بھی۔ تبدیلی یہ ہوئی کہ پہلے ان کے نزدیک سیاست کی بنیاد وطن تھا۔ واپسی پر انھوں نے سیاست کی بنیاد مذہب کو قرار دیا۔"[۲]

---

[۱] جگن ناتھ آزاد۔ اقبال اور اس کا عہد، ص ۱۶۔ [۲] ڈاکٹر ضیاء الدین۔ پروفیسر آزاد سے تین ملاقاتیں (مشمولہ) ارمغانِ آزاد مرتبہ ڈاکٹر ظہور الدین، ص ۲۷۶۔

آزاد نے اپنی باتوں کو مدلل بیان کیا ہے۔ اقبال کی نظم "سوامی رام تیرتھ کے بارے میں لکھتے ہیں:

"سوامی رام تیرتھ ہندوؤں کے ایک مذہبی رہنما تھے۔ ویدانت یعنی وحدت الوجود ان کا عقیدہ تھا۔ اسلامی وحدت الوجود نہیں جس میں کائنات کو مظہر ذات خداوندی قرار دیا گیا تھا، بلکہ وہ وحدت الوجود جس کی ابتدا ہندوستان میں شری شنکر اچاریہ نے کی اور جس کے مطابق کائنات کو مایا کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ سوامی رام تیرتھ نے گنگا میں سمادھی لگائی تھی۔ اقبال یہاں ویدانت کے نظریے کو چند اشعار میں اس طرح بیان کرتے ہیں جیسے کوزے میں سمندر کو بند کر دیا ہو۔

ہم بغل دریا سے ہے اے قطرۂ بیتاب تو
پہلے گوہر تھا اب گوہر نایاب ہے تو
نفس ہستی اک کرشمہ ہے دل آگاہ کا
لا کے دریا میں نہاں موتی ہے الا اللہ کا"[1]

آزاد نے اپنی اس کتاب میں کئی مثالوں کے ذریعے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اقبال کے کلام میں حب وطنیت کی کمی نہیں ہے۔ آزاد نے اقبال کے تمام مجموعۂ کلام کا جائزہ لیتے ہوئے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ اقبال کے یہاں شروع سے آخر تک وطنیت موجود ہے یہ کبھی ختم نہیں ہوئی۔ چاہے زندگی کا آخری لمحہ ہی کیوں نہ ہو۔ چنانچہ ایک اور مقام پر لکھتے ہیں:

"اقبال کا کلام اول سے آخر تک بہ آوازِ بلند یہ کہہ رہا ہے کہ میرے مصنف کے نظریات کو سمجھنے کے لیے اس ژرف نگاہی سے کام نہیں لیا گیا ہے جس کا یہ مستحق تھا۔ اقبال نے وطنیت کو کبھی اسلام کی ضد قرار نہیں دیا بلکہ وطنیت کے اس سیاسی اقتدار کو اسلام

---

[1] آزاد۔ اقبال اور اس کا عہد، ص ۲۵، ۲۶۔

کی ضد قرار دیا ہے جس سے ہمارے دل میں مذکورہ خرابیوں کے لیے
راستہ کھلتا ہے۔ یہ وہی مکروہ سیاسی تصور ہے جس سے مخلوقِ خدا
غلط طریقے سے بٹ جاتی ہے اور قومیت اسلام کی جڑ کٹتی ہے۔"[۱]

"ارمغانِ حجاز" کے حوالے سے آزاد لکھتے ہیں کہ اقبال کی اس تصنیف میں بھی ان کے خیال
کی صداقت موجود ہے۔ "ارمغانِ حجاز" کی رباعیات میں اخوت انسانی کا جذبہ موجود ہے۔
آزاد لکھتے ہیں:

"عالمگیر محبت کا یہ جذبہ حبِ وطن کے کیف و سرمستی سے کہیں بھی
خالی نہیں رہا۔ "ارمغانِ حجاز" بھی اس کیفیت سے سرشار ہے ہندوستان
کی غلامی نے اقبال کو ہمیشہ پریشان رکھا۔ یہ پریشان خاطر اس آخری
تصنیف میں، جو مصنف کے انتقال کے بعد منظرِ عام پر آئی، جا بجا
نمایاں ہے۔ اقبال نے فرنگی استعمار پر یہاں بھی ضرب کاری لگانے
سے گریز نہیں کیا ہے۔ آپ نے بڑے واضح الفاظ میں اہلِ وطن کو یہ
تلقین کی ہے کہ اب وقت آچکا ہے کہ جب فرنگی بت کو ہمیشہ کے لیے
طاقِ دل سے نیچے گرا دیا جائے۔"[۲]

اس کتاب کا دوسرا موضوع "اقبال کے کلام کا متصوفانہ لب و لہجہ" ہے۔ تصوف کے
اصل لفظ اور ماخذ پر بحث نہ کرتے ہوئے آزاد مولانا روم، خواجہ حافظ، حضرت امیر خسرو،
خواجہ میر درد، جامی، عطار اور رابندر ناتھ ٹیگور وغیرہ کے افکارِ عالیہ اور ان کے متصوفانہ
خیالات کا تذکرہ کرتے ہیں۔ انھیں نظریات کے تحت آزاد اقبال کے تصوف کو جانچتے
اور پرکھتے ہیں۔ اس سلسلے میں آزاد "اسرارِ خودی" کا دیباچہ، "ایران میں مابعد الطبیعات
کا ارتقا" (اقبال کے پی۔ ایچ۔ ڈی کا مقالہ) اور تشکیل جدید الٰہیات کے علاوہ اقبال کے
خطوط سے بھی مدد حاصل کرتے ہیں۔

---

[۱] جگن ناتھ آزاد۔ اقبال اور اس کا عہد، ص ۲۸ — [۲] ایضاً ص ۵۱، ۵۲۔

دوسرے صوفی شعراء کی طرح اقبال کا نظریۂ تصوّف بھی ارتقائی منزل سے گزرا ہے۔ اقبال کے خیالات میں تبدیلی آئی ہے۔ وہ بہت سارے صوفیاء سے متاثّر ہوئے ہیں۔ فارسی شعراء میں رومی، عطّار اور سنائی وغیرہ سے خاص طور پر زیادہ متاثّر تھے۔ اقبال کے نظریۂ تصوّف سے ادبی حلقوں میں کافی ہلچل مچ گئی۔ خاص طور پر وہ اشعار جو خواجہ حافظ کے بارے میں لکھے گئے تھے۔ آزاد ان تمام خطوط کو جو مختلف لوگوں نے اس سلسلے میں انھیں لکھے تھے اور اقبال کے خطوط جو جواب میں لکھے گئے، پیش نظر رکھتے ہوئے آزاد لکھتے ہیں:

"خطوط کے ان اقتباسات سے یہ بخوبی ظاہر ہو سکتی ہے کہ اقبال تصوّف کے خلاف نہیں تھے بلکہ اس تصوّف کے خلاف تھے جسے انھوں نے غیر اسلامی تصوّف سے تعبیر کیا ہے۔"[۱]

آزاد اسلامی اور غیر اسلامی تصوّف سے بحث کرتے ہوئے اقبال کے ان خیالات پر تبصرہ کرتے ہیں جو اُن کے مختلف دیباچوں کے ذریعے منظرِ عام پر آچکے ہیں۔ ان تمام کا خلاصہ آزاد اس طرح بیان کرتے ہیں،

"یہی وہ ترکِ عمل کا فلسفہ ہے جسے اقبال نے جا بجا غیر اسلامی تصوّف کا نام دیا ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ یہ فلسفہ شری شنکراچاریہ ہی نے پیش کیا ہو۔ جب اسی نقطۂ خیال سے محی الدین عربی اندلسی قرآن کی تفسیر کرتے ہیں تو اقبال اسے بھی غیر اسلامی قرار دیتے ہیں۔ اس تمیز میں ہندو اور مسلمان کی وہ قید نہیں جو عصرِ حاضر کے اس ترقی یافتہ دور میں ہم نے اپنے اوپر عائد کر رکھی ہے۔"[۲]

آزاد نے دلائل و براہین کے لیے مولانا ابوالکلام آزاد کے خطوط کے اقتباسات کو بھی پیش کیا ہے۔ علامہ اقبال کے اردو اور فارسی دونوں کلام سے استفادہ کیا گیا

---

[۱] جگن ناتھ آزاد۔ اقبال اور اس کا عہد، ص ۶۷۔ [۲] ایضاً ۶۸، ۶۹۔

ہے۔ پیامِ مشرق، زبورِ عجم، بالِ جبرئیل، ضربِ کلیم، ارمغانِ حجاز، اور اسرارِ خودی و رموزِ بے خودی وغیرہ سے بھی حوالے دیے گئے ہیں۔

علامہ اقبالؔ اسلام سے بہت زیادہ متاثر تھے۔ وہ خود ایک سچے مسلمان تھے۔ اس سے آزادؔ کو انکار نہیں ہے مگر آزادؔ کی دانست میں اقبالؔ کے کلام میں "مسلم" اور اسلام جیسی اصطلاحیں اپنے حقیقی اور لغوی معنی میں استعمال ہوئی ہیں۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

"اقبال نے سارے کلام میں "اسلام" سے مراد امن و سلامتی اور صالح ذوق جہد و عمل کی تلقین کی ہے اور یہی سبب ہے کہ جہاں آپ نے شری شنکر، شیخ اکبر اور خواجہ حافظ کے خیالات کو غیر اسلامی کہا ہے وہاں شری کرشن اور رامانج کے افکار کو غیر اسلامی نہیں کہا بلکہ ان کے افکار کی تائید اور انھیں برقرار رکھنے کی تلقین کی ہے۔"[1]

علامہ اقبال ایک عظیم شاعر ہی نہیں بلکہ وہ ایک "مفکر" مصلح اور فلسفی بھی ہیں۔ جہاں وہ اپنے افکارِ عالیہ سے تبلیغ کا کام کرتے ہیں وہیں وہ ایک نفس شناس کی طرح حالات کے مطابق دوا استعمال کرنا چاہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اقبالؔ نے ان تمام باتوں کو جو موجودہ دور کے مسلمانوں کی ترقی میں حائل ہو جائیں، کی مخالفت کی ہے اور جن صفات کی بنا پر مسلمانوں میں جہد و عمل کی تربیت ہوتی ہو ان کا برملا اظہار کیا ہے غیر مسلم علماء، دانشور اور مفکرین وغیرہ کے کمالات کا اعتراف کرنا اور ان کے خیالات و افکار سے استفادہ کرنا اور ان حقیقتوں کے ذریعے اپنی قوم کو فائدہ پہنچانا علامہ کی شخصیت کو اور عظیم تر بناتا ہے۔ علامہ کی شخصیت کے گوناگوں پہلو ہیں۔ آزادؔ نے ان کی شخصیت کے اسی خاص پہلو پر نظر ڈالی ہے۔ علامہ کے افکار میں ہندوستانیت ہر جگہ موجود ہے اسی طرح تصوّف میں بھی ان کا ایک منفرد نظریہ ہے اور یہ نظریہ موجودہ حالات کا متحمل بھی ہے۔

تیسرے مقالے کا عنوان ہے "اقبال اور اس کا عہد"۔ اس مضمون میں اقبالؔ کے فکر و فن کے مجموعی تاثر کو بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ مضمون کے آغاز میں ۱۸۵۷ء کے

---

[1] آزادؔ — اقبال اور اس کا عہد، ص ۶۹۔

حالات کا جائزہ لیتے ہوئے ہندوستان کے شعر و ادب کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ شاعر اپنے ماحول اور سماج سے ہی اثر قبول کرتا ہے۔ وہ ماحول سے متاثر ہوتا ہے اور ماحول کو متاثر بھی کرتا ہے۔ اقبالؔ کی شاعری کا دور سیاسی و سماجی بغاوت کا دور ہے۔ اس لیے ان کی شاعری میں یہ اثرات موجود ہیں مگر وہ جہاں سیاسی و سماجی حالات سے متاثر ہوئے ہیں وہاں اپنی انفرادیت برقرار رکھی ہے۔ وہ روایت پرستی کے باغی بھی نہیں ہیں اور تقلید کے سراسر قائل بھی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا کلام ایک طرف روایت پرست شاعر کا کلام ہے تو دوسری طرف ایک باغی شاعر کا کلام بھی ہے۔

زندگی اور فن کا رشتہ جب ٹوٹ چکا تھا۔ فن کار اور شعراء حضرات ذہنی مرض کا شکار تھے۔ الطاف حسین حالیؔ نے "مقدمۂ شعر و شاعری" کے ذریعے شاعروں اور ادیبوں کو "فن برائے زندگی" کی طرف گامزن کرنے کی کوشش کی۔ اقبالؔ نے بھی حالیؔ کے اصولوں کو اپنایا۔ آزادؔ نے انھیں نکات کی نشاندہی کی ہے۔ لکھتے ہیں:

> "جس دور میں فن برائے زندگی کے پردے میں فن برائے فن کے بلکہ فن برائے موت کے اصول پر عمل ہو رہا تھا اقبالؔ صحیح معنوں میں فن برائے زندگی کے علمبردار اور موید بن کر آئے۔ اقبالؔ نے اس حقیقت تک پہنچنے میں کوئی دیر نہیں لگائی۔"[1]

آزادؔ نے اقبالؔ کے اشعار کے ذریعے ان کے فکر و فن کا بہت جامع جائزہ لیا ہے۔ اقبالؔ کی شاعری کے محاسن گنائے ہیں۔ اقبالؔ نے جہاں موضوع و معانی کی طرف توجہ کی وہیں شعر کے حسن کو نظر انداز نہیں کیا۔ آزادؔ لکھتے ہیں:

> "اس میں کوئی شک نہیں کہ اقبالؔ موضوع و معانی کو حسن پر ترجیح دیتے ہیں لیکن ایسا شعر تو کلامِ اقبال میں ڈھونڈنے سے نہیں ملے گا جو حسن کے جلوؤں سے جگمگا نہ رہا ہو۔"[2]

---

[1] جگن ناتھ آزاد۔ اقبال اور اس کا عہد، ص ۹۶۔ [2] ایضاً" ص ۱۰۱۔

"مسجد قرطبہ" کی مثال پیش کرتے ہوئے اقبال کے فکر وفن کا بڑا ہی اچھا جائزہ لیا گیا ہے۔ اقبال کی فکر بھی جداگانہ ہے۔ آزاد نے اقبال کے فکر وفن اور ہنر کے مقاصد کو جگہ جگہ مثالوں اور اشعار کے ذریعے واضح کیا ہے۔ اس طرح انھوں نے اقبال کے نظریۂ رقص وموسیقی کا بھی جائزہ لیا ہے۔ اقبال کے رقص اور موسیقی کا تصور شعر کے تصور سے مختلف نہیں ہے۔ اس سلسلے میں وہ مندرجہ ذیل اشعار پیش کرتے ہیں ؎

وہ نغمہ سردیٔ خونِ غزل سرا کی دلیل　　　کہ جس کو سن کے ترا چہرہ تابناک نہیں
نوا کو کرتا ہے موجِ نفس سے زہر آلود　　　وہ نے نواز کہ جس کا ضمیر پاک نہیں[1]

اقبال اپنے عہد کے شعراء سے اس لیے بیزار ہیں کہ وہ نہیں چاہتے کہ پرانے اور فرسودہ روایتوں کو ہی اپنایا جائے۔ اشعار کے ذریعے بے عملی کی ترغیب، افسردگی اور مایوسی کا ماحول پیدا کرنا شاعری کی غایت کے خلاف ہے۔ اس کے برعکس وہ سماج کو حوصلہ دینا چاہتے ہیں۔ بہر حال آزاد نے اقبال کے کلام کی عظمت کو مختلف استدلال، بحث ومباحث کے ذریعے انتہائی دلنشیں انداز میں بیان کیا ہے۔ آزاد لکھتے ہیں:

"اقبال ہر اعتبار سے ایک عہد آفریں شاعر ہیں۔ ہم اقبال کے خیالات سے ہمیشہ متفق ہوں یا نہ ہوں ان خیالات کی عظمت سے انکار نہیں کر سکتے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ اقبال نے جو بات کہی ہے وہ انسانیت کی بلندی سے کہی ہے۔ اقبال صرف مقصد کی عظمت ہی کے قائل نہیں ہیں بلکہ اس کے حصول کے لیے طریقِ کار کی عظمت کے بھی قائل ہیں۔ عظمت کے اس تصور نے اقبال کی شاعری کو ایک آفاقی حیثیت اور عالمگیر قدر بخشی ہے۔"[2]

آزاد نے اپنے مقالے میں اقبال کی عظمت کو ہر اعتبار سے سراہا ہے۔ اقبال کی عظمت کا ذکر کرتے ہوئے وہ اس دور کے دیگر شعراء کا بھی تذکرہ کرتے ہیں۔ ایسے شعراء

---

[1] جگن ناتھ آزاد۔ اقبال اور اس کا عہد، ص ۱۰۵۔ [2] ایضاً ص ۱۰۹۔

جنھوں نے اقبالؔ سے ان کا آہنگ مستعار لیا اور اپنے فکر و خیالات میں تبدیلی لائی، ان سب کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ آزاد کے مقالے کا یہ اقتباس ملاحظہ کیجیے :

"اقبالؔ نے انسان کے اندر قوتِ یقین پیدا کرنے کی جو کوشش کی ہے وہ ہماری شاعری میں اوّلین کوشش ہے اقبال اگر اردو اور فارسی شاعری کو اس موڑ سے آشنا نہ کرتے تو آج جوشؔ ملیح آبادی، مجازؔ، احسان دانش اور سردار جعفری کی شاعری کا انداز یقیناً مختلف ہوتا۔ جوشؔ کو شاعرِ انقلاب بنانے میں اس ماحول کا بہت بڑا ہاتھ ہے جس کی تخلیق اقبالؔ کے تفکر نے کی۔ اقبالؔ کی صدائے بازگشت ہمیں صرف نظم گو شعراء کے کلام ہی میں نہیں سنائی دیتی بلکہ غزل گو شعرا بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔" [1]

اقبالؔ کا پیغام آزادی انسان کا پیغام ہے۔ غلامی انسان کے لیے لعنت ہے۔ اقبالؔ نے اپنی شاعری اور افکار کے ذریعے اس غلامی کی زنجیر کو توڑنے کی پوری کوشش کی ہے۔ آزاد کا اندازِ بیان رواں دواں ہے ان کے مضامین بے حد معلوماتی ہیں۔ علامہ نیاز فتحپوری آزاد کے ان مقالوں کے متعلق لکھتے ہیں :

"یوں تو موضوع کے لحاظ سے یہ تینوں مقالے ایک دوسرے سے جُدا ہیں لیکن جس حد تک اقبالؔ کا تعلق ہے ان سب میں بڑا گہرا ربط پایا جاتا ہے اور تینوں مقالے ایک دوسرے کا تتمہ نظر آتے ہیں۔" [2]

آزاد کے یہ مقالے ابتدائی ہیں۔ ان مقالوں پر اب تک کئی حضرات نے تنقید و تبصرہ کیا ہے۔ ان میں ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی، امیر چند بہار، ڈاکٹر جلیس سوانی، مولانا عبدالماجد دریا بادی اور ڈاکٹر حامد اللہ ندوی وغیرہ اہم نام ہیں۔ اس کتاب کے متعلق ڈاکٹر حامد اللہ ندوی لکھتے ہیں :

---

[1] جگن ناتھ آزاد۔ اقبال اور اس کا عہد، ص ۱۱۷۔ [2] علامہ نیاز فتحپوری۔ اقبال اور اس کا عہد (مشمولہ) جگن ناتھ آزاد۔ حیات اور ادبی خدمات، مرتبہ ڈاکٹر علیق انجم، ص ۱۷۹۔

"اقبال اور اس کا عہد میں، خود جاوید نامہ، پس چہ باید کرد، اے اقوامِ مشرق، اسرار و رموز، ارمغانِ حجاز، اور ضربِ کلیم کی مدد سے جو عام طور پر اقبال کو ایک اسلامی مفکر کی حیثیت سے پیش کرنے کے لیے بطور حوالہ استعمال کی جاتی ہیں یہ بتایا جاتا ہے کہ اقبال نے عین اس وقت بھی جبکہ وہ اسلام کی برتری کے گیت گاتے تھے ہندوستان کی تمدنی قدروں کو نہیں بھلایا۔

اس طرح اقبال کو وطن دوست ثابت کرکے آزاد نے اگر ایک طرف انھیں ہندوستان میں نشانۂ ملامت بننے سے بچایا تو دوسری طرف یہ بھی ثابت کر دیا کہ وہ نہ صرف وطن اور وطن کے بہادر سپوتوں کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں بلکہ ہر اس فرزندِ وطن کا احترام کرتے ہیں جو ہندوستان کی تمدنی قدروں کا احترام کرتا ہے۔ اس کا تعلق انفرادی طور پر کسی مکتبِ فکر سے ہو۔"[۱]

اقبالیات کے سلسلے میں آزاد کی دوسری کتاب "ہندوستان میں اقبالیات آزادی کے بعد اور دوسرے توسیعی لکچر" بہت اہم تصنیف ہے۔ ہندوستان کی تقسیم کے بعد اقبال کو ان کا صحیح مقام اور منصب دلانے میں جگن ناتھ آزاد کا نام سرِفہرست ہے۔ آزاد کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے اقبال پر لگائے گئے الزامات کو دور کرنے کی بھرپور کوشش کی۔ ایسے حالات میں جب کہ اقبال کا نام لینا بھی مشکل تھا، آزاد نے اپنے مقالات اور کتابوں کے ذریعے ساری دنیا کو اقبال شناس بنایا۔ ایک طرف انھوں نے یہ ثابت کیا کہ وہ اسلامی شاعر ہوتے ہوئے بھی ہندوستانی تہذیب، ثقافت و تمدن، یہاں تک کہ ویدانت رشی منیوں اور گیانیوں تک سے متاثر تھے اور ان کے کلام میں یہ اثرات جگہ جگہ نمایاں ہیں تو دوسری طرف یہ بھی پیش کیا کہ ان کا کلام شروع سے آخر تک "حبِ اسلام"

---

[۱] حامد اللہ ندوی — آزاد کی نثری تخلیقات (مشمولہ) جگن ناتھ آزاد — ایک مطالعہ مرتب ایوب واقف، ص ۲۷۷، ۲۷۸۔

سے بہر ہے۔ اقبالؔ کسی فرد یا جماعت کے شاعر نہیں تھے بلکہ ان کی شاعری ساری دنیا کے لیے تھی وہ سب کے شاعر تھے۔ ان کا پیغام آفاقیت پر مبنی ہے ان کے کلام میں ساری انسانی برادری کے لیے پیغام اول ہے۔

آزادی کے بعد ہندوستان میں جو حالات رونما ہوئے، اقبال کے متعلق لوگوں کے خیالات کس طرح کے تھے۔ اقبالیات پر جو کچھ لکھا اور پڑھا جا رہا تھا ان سب باتوں کا تذکرہ آپ کو اس کتاب میں ملے گا۔ اس کتاب میں چار مندرجہ ذیل مقالے ہیں:

(۱) ہندوستان میں اقبالیات آزادی کے بعد

(۲) اقبال مغربی مصنفین کی نظر میں

(۳) انسان اقبال کی نظر میں

(۴) اقبالؔ اور جوشؔ

پہلے مقالے میں آزادؔ نے ہندوستان میں اقبالیات کا جائزہ لیا ہے۔ ۱۹۴۷ء سے پہلے کا پس منظر اور پھر اس کے بعد کیے گئے کاموں کا تفصیلی ذکر ہے۔ آزادی سے پہلے ڈاکٹر سچدانند سنہا کی کتاب "IQBAL: Iqbal the poet and his message" کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ عابد حسین کی کتاب میں اقبالؔ کے متعلق دو مضامین تھے۔

آزادؔ کے مطابق آزادی کے بعد علامہ اقبالؔ پر سب سے اہم اور پہلی کتاب جو ہندوستان میں شائع ہوئی وہ مجنوں گورکھپوری کی کتاب تھی۔ آل احمد سرور بھی اس زمانے میں علامہ اقبالؔ پر متعدد مضامین لکھ چکے تھے۔ سردار جعفری نے بھی علامہ اقبال کے متعلق ایک کتاب لکھی اور اس میں ان پر فاشسٹ ہونے کا الزام لگایا۔ بہر حال ان کتابوں میں بعض کتابیں ایسی تھیں جو ANTI-IQBAL رجحان لیے ہوئے تھیں۔

اس کے بعد آزادؔ نے اپنی کتاب " اقبال اور اس کا عہد" کا تذکرہ کیا ہے۔ اس کتاب کے مقالے پڑھنے کے لیے لکھے گئے تھے مگر ہندوستان کے حالات نے آزاد کو پڑھنے نہیں دیا اور یہ تمام تر مقالے کتابی شکل میں منظرِ عام پر آئے۔ اس طرح ہندوستان میں اقبالیات کے سلسلے میں سب سے پہلے آزاد ہی کی کتاب " اقبال اور اس کا عہد" ہے۔ یہ

کتاب اقبالؔ کے سلسلے میں راہ ہموار کرنے کے لیے کارگر ثابت ہوئی۔

آزادؔ کے بعد گرچیکہ اقبالؔ کے بارے میں کافی سناٹا چھایا ہوا تھا۔ مگر اقبالیات کے متعلق لکھنے والوں کی تعداد خاصی تھی۔ چنانچہ اپنے مقالے میں آزادؔ لکھتے ہیں:

"جہاں تک میرا حافظہ کام کرتا ہے میں کہہ سکتا ہوں کہ مجلّہ عثمانیہ حیدرآباد دکن، نگار لکھنؤ، معارف اعظم گڑھ، شاعر آگرہ، اردو دہلی، سب رس حیدرآباد، آجکل دہلی، کتاب نما دہلی، برہان دہلی، فروغِ اردو لکھنؤ، شاہراہ دہلی، علی گڑھ میگزین، دارالعلوم دیوبند کا میگزین، کاروانِ ادب بمبئی، زمانہ کانپور وغیرہ کے صفحات اس دور میں بھی اقبال اور اقبالیات کی روشنی سے جگمگاتے رہے جبکہ بہ حیثیت مجموعی اقبال کے بارے میں خاموشی چھائی ہوئی تھی اور ان جرائد کا ذکر میں نے کیا ہے لکھنے والے مستند اہلِ قلم اور ادیب تھے۔" [1]

اس دور میں جن اہلِ قلم حضرات نے اقبالؔ کے متعلق مضامین لکھے ان میں بقول آزاد غلام ربانی عزیز، فرمان فتحپوری، آل احمد سرور، اختر علی تلہری، عبدالسلام ندوی، راجندر ناتھ شیدا، نیاز فتحپوری، شوکت سبزواری، سید احتشام حسین، سردار جعفری، فراق گورکھپوری، باقر مہدی، پروفیسر مسعود حسین خاں انور وغیرہ اہم نام ہیں۔ عزیز احمد کا مضمون "اقبال اور ارتقائے تخلیق" اسی دور کا مضمون ہے۔

آزادؔ کا یہ مقالہ انتہائی معلوماتی ہے۔ انھوں نے ۱۹۴۷ء کے بعد کے نہ صرف جرائد و رسائل کا ذکر کیا ہے بلکہ ان کتابوں کا ذکر بھی کیا ہے جو اس زمانے میں شائع ہوئی۔ مثلاً عبدالسلام ندوی کی کتاب "اقبال کامل"، ظہیر الدین جامعی کی کتاب "اقبال کی کہانی کچھ ان کی اور کچھ میری زبانی"، یکتا امروہوی کی کتاب "اقبال خواتین کی نظر میں"، ظفر احمد صدیقی کی کتاب "حکمت کلیمی" وغیرہ کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔

---

[1] جگن ناتھ آزاد۔ ہندوستان میں اقبالیات، ص ۲۰، ۲۱۔

حیدر آباد میں سیّد خلیل اللہ حسینی نے اقبال اکیڈمی قائم کی۔ دوسرے متعدد سیمنار بھی منعقد ہوئے جو اقبال کے متعلق تھے۔ کشمیر میں بھی اقبال کے متعلق کام ہوا۔ حالات تیزی سے بدلنے لگے۔ رفتہ رفتہ اقبال کا نام ہندوستان میں بھی عام ہو گیا۔ آزاد لکھتے ہیں:

"وقت گزرتا گیا۔ علامہ اقبال کے متعلق مختلف جرائد میں چھپنے والے مقالات کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا۔ جن مصنّفین کا نام میں نے اس باب کے شروع میں لیا ہے ان کے مقالات اور ان میں سے بعض کی کتابیں منظرِ عام پر آئیں۔ دراصل جوں جوں سیاسی فضا میں ٹھہراؤ آتا چلا گیا اور تقسیمِ ملک سے پیدا شدہ گرد بیٹھتی چلی گئی اردو اور اقبال دونوں کے متعلق ملک کا بہ حیثیت مجموعی رویّہ بدلتا چلا گیا۔ دراصل اقبال اتنا بڑا شاعر ہے کہ ملک کی علمی اور ادبی فضا سے اس کی عدم موجودگی کو ملک نے خود محسوس کیا۔ بعض اہم انگریزی، ہندی اور دوسری زبانوں کے اخبارات اور جرائد نے اس بات کی ضرورت محسوس کی کہ وہ اقبال کے متعلق علمی اور ادبی مقالات شائع کریں۔ ہندوستان ٹائمز، ٹائمز آف انڈیا، نو بھارت ٹائمز، اسٹیٹسمین اور انڈین ایکسپریس ان سب اخبارات نے اپنے ادبی ضمیموں میں اس کمی کو محسوس کیا اور اقبال پر مضامین کبھی کبھار ان میں چھپنے لگے۔" [۱]

۱۹۶۰ء کے قریب علامہ اقبال کا کلام آل انڈیا ریڈیو سے اِکادُکا نشر ہونے لگا۔ مگر اس دور میں بھی بعض حضرات کا ذہن صاف نہیں تھا۔ چنانچہ اقبال کے متعلق جب بھی کوئی مضمون شائع ہوتا، اس کے دو چار روز بعد کوئی نہ کوئی خط مخالفت میں شائع ہو جاتا۔ اس سے اس دور کے سیاسی فضا کا اندازہ ہوتا ہے۔

آزاد نے اپنے مقالے میں تقریباً ۱۹۷۷ء تک کے اقبالیات کا احاطہ کیا ہے۔ ۱۹۷۲ء

---

[۱] جگن ناتھ آزاد۔ ہندوستان میں اقبالیات آزادی کے بعد اور دوسرے توسیعی لکچر، ص ۲۳۔

میں ہی علامہ اقبالؔ کے صد سالہ جشن منانے کے سلسلے میں تاریخ ولادت کا اختلاف پیدا ہوا۔ اس موضوع پر کافی مواد جمع ہوا۔ اقبالیات کے متعلق لکھنے والوں کی تعداد میں بھی اضافہ ہو گیا۔ اس دور کے لکھنے والوں میں محمد الدین فوق، رام بابو سکسینہ، لی کرینن، خلیفہ عبدالحکیم، عبدالمجید سالک، بابا جان غفور وف، ڈاکٹر جاوید اقبال، ڈاکٹر وحید قریشی، مالک رام، نواب سر ذوالفقار علی خاں، لالہ سری رام، عبداللہ انور بیگ، ملک راج آنند، محمد طاہر فاروقی، حافظ محمود شیرانی، مولوی احمد دین، سیّد وحید الدین اور چراغ حسن حسرت وغیرہ جنھوں نے اقبالیات پر بہت کچھ لکھا۔ اقبالؔ کے متعلق لکھنے والوں میں جگن ناتھ آزاد کا نام بھی موجود ہے جن کے کئی مضامین اور کتابیں منظرِ عام پر آچکی تھیں۔ تاریخِ پیدائش کے سلسلے میں بھی آزاد کی تحقیق درست قرار دی گئی۔ صد سالہ جشن کے موقع پر آزاد نے "اقبال نمائش" کا اہتمام کیا۔ یہ نمائش ۲۷ اکتوبر ۱۹۷۳ء کو سری نگر میں منعقد ہوئی۔

ہندوستان کی آزادی کے فوراً بعد اردو اور اقبالؔ کے بارے میں جو منفی لہر تھی، وہ ۱۹۷۳ء کے بعد تک بھی باقی بھی اور اب بھی ہے مگر بہت کم۔ چنانچہ آزاد نے جب نمائش منعقد کی تو اس وقت انھیں جہاں مبارک باد کے خطوط ملے وہیں انھیں غدار کا خطاب بھی دیا۔ آزاد لکھتے ہیں:

> "ان خطوط کے جواب میں جہاں مرتب کو ملک کے بعض علمی اور ادبی حلقوں سے خاصا تعاون ملا وہاں اسے بعض عتاب نامے بھی موصول ہوئے جن میں اس قسم کی عبارت درج تھی کہ آپ ہندوستان کے ایک دشمن کی یاد میں نمائش کا انتظام کر رہے ہیں اس وقت ہندوستان میں مسلم نواز حکومت نہ ہوتی اور کوئی صحیح طرح کی جمہوری حکومت ہوتی تو اس وقت جیل خانے میں ہوتے ایک صاحب نے یہ لکھا کہ آپ کا نام ملک کے غدّاروں کی فہرست میں لکھا جائے گا۔"[1]

اس کے بعد ملک میں اقبالیات کے سلسلے میں اور اہم کام ہوا۔ ماحول سازگار ہونے لگا۔

---

[1] جگن ناتھ آزاد — ہندوستان میں اقبالیات آزادی کے بعد، ص ۳۷۔

یونیورسٹیوں میں جہاں اردو کی تعلیم دی جاتی تھی وہیں اقبالیات کا موضوع نصاب میں شامل کیا گیا۔ پی۔ ایچ۔ ڈی سطح پر کام ہونے لگا۔ بہت سے جرائد نے اقبال نمبر شائع کیے۔

۱۹۸۶ء میں اقبال اکیڈمی حیدرآباد ہی کے زیرِ اہتمام انٹرنیشنل اقبال سمینار منعقد ہوا جس میں متعدد ہندوستانی ماہرینِ اقبالیات کے علاوہ پاکستان، روس اور عرب ممالک سے بھی اقبال شناس اہلِ قلم نے شرکت کی۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے بھی ایک اور سمینار ۱۹۸۶ء میں شعبۂ فارسی کے زیرِ اہتمام منعقد کیا۔ یہ بھی ایک انٹرنیشنل سمینار تھا۔ یونیورسٹیوں میں اقبال چیئر کا اہتمام بھی ہونے لگا۔ انگریز مصنفین نے بھی اقبال کے متعلق مضامین لکھے جو ہندوستان میں شائع ہوئے۔ آزاد کا اقبالیات کے سلسلے میں اس طرح کا احاطہ بہت معلوماتی بھی ہے اور تحقیق طلب بھی۔ ان کا یہ ایک ایسا منفرد کارنامہ ہے جسے اقبالیات کی کڑی سے الگ کرنا ناممکن ہے اور اقبال شناسی کے لیے بے حد اہم ہے۔

اس کتاب کا دوسرا موضوع "اقبال مغربی مصنفین کی نظر میں" ہے۔ اقبال نے مغربی علوم و فنون اور مغربی تہذیب کے بارے میں بہت کچھ لکھا ہے۔ بعض مغربی مصنفین نے اقبال کے کلام اور نثر دونوں کا مطالعہ کیا اور ان کا انگریزی میں ترجمہ بھی کیا۔ مغربی مصنفین میں آر۔ اے۔ نکلسن نے ۱۹۲۰ء میں "اسرارِ خودی" کا انگریزی میں ترجمہ کیا تھا جس سے اقبال کو کافی شہرت ملی۔ آزاد نے ان تمام مصنفین کے نام گنائے ہیں جو کسی نہ کسی طور اقبال سے متاثر ہوئے اور اقبال کے بارے میں لکھا۔ آرتھر آربری کے کام کا کینوس بھی خاصا وسیع ہے۔ زبورِ عجم، پیامِ مشرق، شکوہ جواب شکوہ، رموزِ بے خودی اور جاوید نامے کے تراجم ان کے ایسے کام ہیں جو اقبالیات کے سلسلے میں ان کے نام کو ہمیشہ زندہ رکھیں گے۔

جاوید نامے کا اطالوی زبان میں بھی ترجمہ ہوا۔ ولفرڈ کانٹ ویل اسمتھ کی کتاب میں بھی اقبال کے متعلق دو باب تھے۔ وکٹر کرینن کی کتاب POEM OF IQBAL میں بعض منتخب اقبال کی نظمیں ہیں۔ علامہ اقبال کے کلام کا ترجمہ فرانسیسی میں بھی ہوا ہے ــــ شیلا مک ڈونو نے اقبال کی نظم "مسجد قرطبہ" پر مقالہ لکھا جو بہت ہی اہم ہے۔ انھوں نے اقبال کا ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کی شاعری سے تقابلی مطالعہ کیا ہے۔

تیسرا موضوع "انسان اقبال کی نظر میں" ہے۔ اقبال کے یہاں انسان کی عظمت کیا ہے۔ وہ انسان کو کس حد تک عظیم جانتے ہیں۔ آزاد نے اس موضوع پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔

اقبال نے انسان کو عظیم قرار دیا ہے۔ اقبال انسان کا رشتہ خدا سے جوڑ دیتے ہیں۔ آدم کا جنّت سے زمین تک کا سفر ارتقا کے روپ میں ہے۔ یہ انسان کا زوال نہیں بلکہ عروج ہے۔ انسان خدا کا بندہ بھی ہے اور خدا سے قریب بھی ہے۔ وہ ایک نکتہ چیں بھی ہے اور وہ کلیم اللہ بھی ہے۔ اقبال کہتے ہیں ؎

مجھ کو پیدا کر کے اپنا نکتہ چیں پیدا کیا
نقش ہوں اپنے مصوّر سے گلہ رکھتا ہوں میں

کبھی ہم سے کبھی غیروں سے شناسائی ہے
بات کہنے کی نہیں تو بھی تو ہرجائی ہے

اقبال مادے کے ارتقا کے بھی قائل ہیں۔ انسان خدا کا مخلوق ہے وہ اس کے بھی قائل ہیں۔ البتہ وہ مادّے کو روح کا لباسِ ظاہری کہتے ہیں۔ اقبال نے جو عظمتِ آدم کا معیار پیش کیا ہے اس کے لیے سوزِ دروں، عملِ پیہم ضروری ہے۔ آزاد لکھتے ہیں:

"کفر اور اسلام اقبال کی نگاہ میں کچھ اور ہی مفہوم رکھتے ہیں محض اسی شرط کے پیش نظر جو انھوں نے ایک مثالی انسان کے لیے عائد کی ہے۔ یعنی عشق، سوزِ دروں، کاوشِ پیہم، تلاشِ مسلسل، اس ضمن میں اقبال کے مندرجہ ذیل اشعار جو فلسفۂ اقبال کے مرکزی خیال پر بھرپور روشنی ڈالتے ہیں، خاص توجہ کے مستحق ہیں۔" [1]

اس سلسلے میں آزاد نے اقبال کے دو چار اشعار بھی نقل کیے ہیں۔ اقبال نے گرونانک،

---

[1] جگن ناتھ آزاد۔ ہندوستان میں اقبالیات آزادی کے بعد، ص ۸۷۔

کرشن جی وغیرہ کی تعلیمات کو اسلامی تعلیمات سے قریب سمجھا۔ گرونانک کو وہ مردِ کامل کہتے ہیں۔ ان تمام باتوں سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اقبالؔ کے یہاں جو انسانیت کا تصوّر ہے وہ یقیناً اسلام سے الگ نہیں ہے۔ البتّہ ان کا یہ عالمگیر اندازِ فکر ہے جس کی بنا پر جہاں کہیں وہ سچّائی اور صداقت کو دیکھتے ہیں اسے قبول کر لیتے ہیں۔ عملِ پیہم، جستجو پیہم اور سوزِ دروں کی تلاش کے لیے کسی خاص فرقے کے افراد کا تعین بھی بے معنی ہے۔ جہاں کہیں بھی یہ اوصاف پائے جائیں انھیں حاصل کر لینے میں کوئی قباحت نہیں اور نہ یہ اسلامی اصول کے مغائر ہے۔ اس سے یہ نتیجہ کہیں نہیں نکلتا کہ علّامہ اقبال اسلامی عقائد کے خلاف تھے۔ اقرار باللسان یا ایمان بالقلب کے خلاف تھے۔ ختم الرسل، مولائے کُل انہی کی دی ہوئی اصطلاحیں ہیں۔ جو شخص حضرت محمدؐ کو آخری نبی مانتا ہے اور قرآن و حدیث پر بھی ایمان رکھتا ہے۔ قرآن و حدیث کی روشنی میں مومن وہی کہلائے گا، ایمان کے جزئیات پر بھی ایقان رکھے۔ جہاں تک رہبانیت کا تعلق ہے، علّامہ اقبالؔ کا نظریہ قرآن و حدیث سے متابعت رکھتا ہے۔ "اسلام میں رہبانیت نہیں ہے"۔ "تم پر تمھارے نفس کا بھی حق ہے، اپنے نفس پر ظلم مت کرو" وغیرہ بہت سے اقوال و احادیث مذکور ہیں۔ اقبالؔ کے نزدیک انسانِ کامل اور عظمتِ آدم کا ایک معیار مقرر ہے جو اسلامی تعلیم سے مطابقت رکھتا ہے۔ انسانِ کامل بننے کے لیے سوزِ دروں ضروری ہے۔ سوزِ دروں ہی عشق ہے۔ ایسا عشق جو مخلوق کو خالق سے ملا دیتا ہے۔

اس کتاب کا چوتھا اور آخری مضمون "اقبالؔ اور جوشؔ" ہے۔ آزادؔ اور جوشؔ دونوں ایک عرصے تک ایک ساتھ رہے۔ اس مدت میں انھوں نے جوشؔ سے بہت کچھ سیکھا۔ ان کے عادات و اطوار سے واقفیت حاصل ہوئی۔ ایک طرف جوشؔ کی رفاقت ہے تو دوسری طرف آزادؔ کا اقبالؔ سے اٹوٹ رشتہ محبت ہے۔ اقبالؔ کے ساتھ عقیدت و احترام ہے۔

جوشؔ کا اقبالؔ کی جانب معاندانہ رویّہ تھا۔ اس بات کی صداقت کے لیے آزادؔ نے کئی مثالیں پیش کی ہیں۔ جوشؔ عام طور پر اقبالؔ پر کس طرح کے اعتراضات کرتے

تھے، ان اعتراضات کی حقیقت کیا ہے، آزاد نے اس موضوع پر خاصی روشنی ڈالی ہے۔ جوشؔ کے اعتراضات میں صداقت اور سچائی بہت کم ہوا کرتی تھی۔ آزاد نے اقبالؔ اور جوشؔ کے کلام کا تقابلی مطالعہ کیا ہے۔ جوشؔ نے نہ چاہتے ہوئے بھی اقبالؔ کے اثر کو قبول کیا۔ چنانچہ جوشؔ اور اقبال کے اشعار نقل کرنے کے بعد آزاد لکھتے ہیں:

"اگر جوشؔ کی نظر سے اقبالؔ کے یہ افکار نظم و نثر کی صورت میں نہیں گزرتے تو بات دوسری ہے ورنہ یہ بات بعید از قیاس نہیں کہ جوشؔ نے فکرِ اقبال اور شعرِ اقبال کے متعلق زبان سے "لا"، کہنے کے باوجود کسی نہ کسی طرح سے "بلیٰ" کہا ہے اور اقبال کے فکر و فن کا اثر قبول کیا ہے"۔[1]

اس کے بعد آزاد جوشؔ کی دو[2] رُباعی نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ان رباعیات کے مصرعوں کا آہنگ، الفاظ کا در و بست، ان میں نغمگی کی کیفیت ماورائے تعریف ہے لیکن نہ جانے کیا بات ہے کہ جب بھی جوشؔ کا اس طرح کا کلام میری نظر سے گزرتا ہے میرا ذہن بے اختیار اقبال کے اس شعر کی جانب منتقل ہو جاتا ہے"۔[2]

جوشؔ ایک قادر الکلام شاعر تھے مگر فکر و فلسفہ سے اس طرح کا لگاؤ نہیں تھا جس طرح کا لگاؤ اقبالؔ رکھتے تھے۔ اقبالؔ کا فلسفہ کے ساتھ لگاؤ فطرتِ ثانیہ بن گیا تھا۔ اس کے برخلاف جوشؔ منہ کا مزہ بدلنے کے لیے فلسفیانہ اشعار کہتے تھے۔ آزاد لکھتے ہیں:

"میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ جوشؔ کا فکر اور فلسفہ کے ساتھ ایک لگاؤ ضرور ہے اس کے ساتھ ہی جوشؔ کو وہ اندازِ بیان بھی ملا ہے جو گہرے دقیق فلسفیانہ مضامین کے لیے بہت مناسب ثابت

---

[1] جگن ناتھ آزاد۔ ہندوستان میں اقبالیات، ص ۱۰۱۔ [2] ایضاً۔

ہوسکتا ہے۔ یہ اندازِ بیان جوش کے ہم عصروں میں اور کسی کو نصیب نہیں ہوا۔ جہاں تک جوش کی زبان کا تعلق ہے بقول آل احمد سرور اقبال کی زبان اور جوشؔ کی زبان میں بنیادی طور پر کوئی فرق نہیں۔ جوشؔ کو مختلف مسائل پر سوچ بچار کرنے کا شوق بھی ہے لیکن کمی یہ رہی کہ یہ شوق ان کی فطرتِ ثانیہ نہ بن سکا اور وہ اپنی سوچ بچار اور وجدان کو یکجا نہ کر سکے۔"[۱]

اقبالؔ کے فلسفیانہ اشعار میں جذبہ ساتھ ساتھ ہوتا ہے جب کہ بقول آزاد جوشؔ کے یہاں فکر اکثر و بیشتر جذبہ نہیں بنتا بلکہ وہ فکر کو شعر کا لباس پہناتے ہیں۔ جوشؔ نے اپنے کلام میں فکری عناصر کی کمی کو شکوہِ الفاظ سے پورا کرنے کی کوشش کی ہے۔ آزاد جوشؔ اور اقبالؔ کا تقابلی مطالعہ کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ جوشؔ کی نظم چالیس بند پر مشتمل ہونے کے باوجود جہاں سے چلی قریب وہیں آکے ختم ہوگئی اور اقبالؔ کی نو بند پر مشتمل مذکورہ نظم اتنی منزلیں طے کر گئی کہ اس پر اس وقت تک دنیا کی مختلف زبانوں میں صفحوں کے صفحے لکھے جا چکے ہیں اور ابھی صفحوں کے صفحے لکھے جائیں گے۔"[۲]

اقبالؔ صرف شاعر ہی نہیں بلکہ مفکر و مدبر بھی تھے۔ انھوں نے جہاں اسلامی علوم کا مطالعہ کیا، وہاں قرآن و حدیث کو اپنی فکر کا محور بنایا۔ مغربی علوم و فنون بھی سیکھے۔ مغربی مفکرین کا گہرا مطالعہ کیا۔ یہی وجہ ہے کہ اقبالؔ کا کلام فلسفیانہ خیالات سے لبریز ہے۔ انھوں نے یونانی، مغربی، عربی، عجمی اور ہندوستانی فلاسفروں سے متاثر ہو کر ایک منفرد کلام ہمارے سامنے پیش کیا ہے۔ قیامِ یوروپ کے دوران اقبالؔ نے بیکنؔ، لاکؔ، کانٹؔ، فشٹےؔ، شوپن ہائر، کارل مارکس، نٹشےؔ، برگساں، دانتےؔ، ملٹنؔ، گوئٹےؔ اور بہت سے دوسرے مصنفین و مفکرین کے نظریات کا گہرا مطالعہ کیا۔ اقبالؔ کی شخصیت بنیادی طور پر اسلامی اور ہندوستانی افکار و نظریات کی پروردہ ہے۔ ان کے مزاج اور فکر کو بنیادی

---

[۱] آزاد۔ ہندوستان میں اقبالیات، ص ۹۹-۹۸۔ [۲] ایضاً ص ۱۰۹۔

طور پر اسلامی اور ہندوستانی عناصر نے پروان چڑھایا مگر آپ کی شخصیت میں اس وقت نکھار پیدا ہوا جب اقبالؔ نے مغربی اور عالمی افکار و نظریات کو اپنے طور پر اپنایا۔

"اقبال اور مغربی مفکرین" آزاد کے مقالات کا مجموعہ ہے۔ یہ مقالات اگرچہ مختلف اوقات میں لکھے گئے ہیں مگر ان کا موضوع اقبالؔ اور مغربی فلسفے کا باہمی تعلق ہے۔ آزاد نے اپنے نظریات و خیالات کو بہت اچھے انداز میں پیش کیا ہے۔

اسلامی نظریات ہوں کہ ہندوستانی افکار یا یوروپی تمدن، اقبال سب سے متاثر ہونے کے باوجود انھوں نے اپنا راستہ الگ بنایا۔ بقول خلیق انجم :

"اسلامی فکر اور اسلامی تہذیب کے بارے میں اقبال کا عقیدہ تھا کہ "ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی" اور وہ اس راز سے یہ خوبی واقف تھے کہ مغربی مفکر کو نظر انداز کر کے ہم خود کو نقصان پہنچائیں گے اس لیے ضروری ہے کہ یوروپی تہذیب کی اصل روح کو سمجھا جائے اور پھر اسلام کو یوروپی خیالات کی روشنی میں پیش کیا جائے۔ اقبالؔ نے اپنا راستہ خود تلاش کیا ہے۔ ان کے تجرباتی اور تنقیدی ذہن نے ردّ و قبول کے ذریعے اپنے فلسفیانہ نظام کی تعمیر کی۔" [۱]

اقبال عصری تقاضوں سے واقف تھے مگر وہ مغربی چمک دمک کو بھی محسوس کر رہے تھے جس میں سوائے مکر و فریب کے کچھ نہ تھا اور جسے شراب زندگی کا نام دیا جاسکتا ہے چنانچہ تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ میں لکھتے ہیں :

"ہمارے سامنے واحد راستہ یہی ہے کہ ہم علوم جدید کی جانب ایک مودّبانہ اور آزادانہ رویّہ اختیار کریں اور انھی علوم کی روشنی میں تعلیم اسلام کو سمجھیں، خواہ اپنی اس کوشش میں ہمیں اپنے

---

[۱] ڈاکٹر خلیق انجم۔ اقبال اور مغربی مفکرین (مشمولہ) سہ ماہی "لمحے لمحے" بدایوں، مدیر حبیب سوز، ص ۳۷۱۔

پیش رُوؤں سے اختلاف ہی کیوں نہ کرنا پڑے"۔

یہی وجہ ہے کہ اقبالؔ نے جس روایت اور راستے کو اپنایا وہ نہ صرف مسلم سماج بلکہ عالم انسانیت کے لیے اہم اور ضروری ہے۔ اقبالؔ کی فکر عالمگیر حیثیت رکھتی ہے۔ اس لیے اسے کسی محدود اور تنگ نظریے کی چار دیواری میں مقید نہیں کیا جاسکتا۔ اقبالؔ کے افکار و نظریات کے بارے میں ہمیشہ ہی اختلاف رہا۔ ایک جماعت نے اقبالؔ کو اسلام تک محدود کیا تو دوسرے نے صرف مغرب و یونان کے نظریے کو لے کر انھیں صرف مغربی مفکر گردانا۔ آزاد کا خیال ہے کہ "اعلیٰ شاعری کسی فلسفے یا تائید یا تردید کا نام نہیں ہے۔ ایک بڑا وسیع المطالعہ شاعر دوسروں کے نظریات کو پسند بھی کرسکتا ہے۔ ناپسند۔ دوسرے بڑے شعراء اور فلسفیوں کے افکار سے اثر پذیر بھی ہوسکتا ہے اور نہیں بھی"۔ [1]

اقبالؔ ایک بڑے شاعر بھی تھے اور فن کار بھی۔ وہ ایک وسیع النظر فلسفی بھی تھے۔ انھوں نے بڑے ذوق و شوق کے ساتھ یوروپی فکر و نظر کے سرچشموں سے اپنی پیاس بجھائی ہے۔ "فکرِ اقبال" میں خلیفہ عبد الحکیم لکھتے ہیں:

"اقبال کا ایک مخصوص اندازِ فکر اور نظریۂ حیات تھا۔ اس نخل کی پرورش اس نے مختلف عناصر سے کی۔ ان میں سے کچھ عناصر خاص قرآنی تعلیم کے ہیں کچھ رومی کے صوفیانہ تاویل اور روحانی تجربے کے۔ کچھ مغرب کے۔ ان مفکروں کے افکار کے جن کا اقبال ہم نوا ہے یا جو اقبال کے ہم صفیر ہیں"۔ [2]

اقبالؔ اور مغربی فلسفیوں اور مفکرین کا ذہنی قرب و بعد، اقبالیات کا نہایت اہم مسئلہ ہے۔ آزاد لکھتے ہیں:

---

[1] آزاد — اقبال اور مغربی مفکرین، ص ۴۱۔

[2] خلیفہ عبد الحکیم: فکرِ اقبال" ص ۲۸۷۔

"اہلِ قلم کی ایک جماعت نے مذہبی جوش میں یہ ثابت کرنے کے لیے پورا زور لگا دیا ہے کہ اقبالؔ نے قدم قدم پر مختلف مغربی فلسفیانہ نظریات کی تردید اور تغلیط کی ہے۔ دوسری جماعت ان حضرات پر مشتمل ہے جن کے نزدیک علاّمہ اقبال کے افکار مغربی مفکرین کے افکار کے پرتو ہیں۔" [۱]

آزادؔ ان دونوں تصوّرات سے اختلاف رکھتے ہیں۔ وہ ہر مقالے میں متعلقہ مفکّر یا فلاسفر کا تعارف کراتے ہیں پھر اس کے افکار و نظریات کے نمایاں پہلوؤں کا تذکرہ کرتے ہوئے اقبالؔ کے یہاں اس کے اثرات کا منصفانہ جائزہ لیتے ہیں۔

اقبالؔ کے اصطلاحات خودی، بے خودی، مردِ کامل، عشق، عقل، وجدان خدا، کائنات، زمان و مکان اور حرکت و عمل کے بارے میں مغربی مفکرین اور اقبالؔ کے تصوّرات میں کہاں کہاں اشتباہ ہے اور کہاں کہاں اختلافات پائے جاتے ہیں۔ آزادؔ نے ان سب کا احاطہ کیا ہے۔ ڈاکٹر منظر اعظمی لکھتے ہیں :

"ان کی گراں قدر تصنیف "اقبال اور مغربی مفکرین" جب چھپی تو لوگوں کو اور بھی حیرت ہوئی۔ اہلِ علم ان کی وسعتِ مطالعہ کے قائل ہو گئے۔ اس میں مصنف نے مغرب کے تقریباً تمام ہی قابلِ ذکر فلاسفرس اور اہلِ علم شاعروں کے مختلف نظریات کا نہایت ہی خوبصورتی سے ذکر کیا ہے اور اقبالؔ نے اس سے کہاں تک استفادہ کیا اور کہاں رد کر دیا ان سب مسائل کا احاطہ ہو گیا ہے اور اس طرح سے ہوا ہے کہ خود اقبال کے تصوّرات واضح ہو کر سامنے آجاتے ہیں۔" [۲]

---

[۱] آزاد۔ اقبال اور مغربی مفکرین، ص ۱۳۔

[۲] ڈاکٹر منظر اعظمی۔ سخن دلنواز کا عالم شاعر۔ جگن ناتھ آزاد، ص ۱۳۰ (مشمولہ) ارمغانِ آزاد مرتبہ ڈاکٹر ظہور الدین۔

اس کتاب میں کُل گیارہ مضامین ہیں۔ آخر میں "حرفِ آخر" کے طور پر نتیجہ اخذ کیا گیا ہے۔ ہر مقالے میں آزاد نے مغربی مفکرین کے نظریات سے اقبال کے افکار کا موازنہ کیا ہے جو بہت ہی مشکل کام ہے۔ سب سے پہلے انھوں نے یونان کے فلسفیوں کا تذکرہ کیا ہے۔ سقراط کے بارے میں آزاد کا خیال ہے کہ اقبال کے اشعار میں سقراط کا ذکر نہیں ہے مگر اقبال نے "تشکیل جدید الٰہیاتِ اسلامیہ" میں سقراط کا ذکر کیا ہے، افلاطون سقراط کا شاگرد تھا۔ اقبال افلاطون کی عظمت کے قائل ہیں اور اس کے اکثر فلسفیانہ افکار کے قائل ہیں۔ انھوں نے صرف افلاطون کے نظریۂ اعیان کی مخالفت کی باقی اس کی عظمت سے انکار نہیں کیا۔ اقبال کے اشعار نقل کرنے کے بعد آزاد لکھتے ہیں :

> "یہ ساری کی ساری تنقید صرف افلاطون کے فلسفۂ اعیان پر ہے کیونکہ زندگی کے بارے میں اقبال کا نظریہ یہ ہے کہ ؏
>
> زندگی جز قوت اعجاز نیست
>
> جہاں تک افلاطون کے باقی نظریات کا تعلق ہے اقبال نے ان پر کوئی تنقید نہیں کی بلکہ اکثر نظریات کی تائید بھی کی ہے۔"[۱]

ارسطو و افلاطون کے نظریۂ اعیان کا مفصل جائزہ لیتے ہوئے آزاد نے اقبال کے فلسفے کو انتہائی مدلل انداز میں پیش کیا ہے۔ اقبال کے پی۔ایچ۔ڈی کا مقالہ "ایران میں مابعد الطبیعات کا ارتقاء" کے اقتباسات بھی پیش کیے گئے ہیں۔ آزاد نے دنیائے فلسفہ کی تین اہم شخصیتوں سقراط، افلاطون اور ارسطو کی عظمت کو سراہا ہے۔ لکھتے ہیں:

> "سقراط اگر منبع وجدان تھا تو افلاطون نے اس وجدان کو آنے والی نسلوں کے لیے ایک روایت بنا کے پیش کر دیا۔ فلسفہ اس کے ہاتھوں میں آ کے ایک زندہ قوت بن گیا۔ ارسطو نے اس روایت

---

[۱] جگن ناتھ آزاد۔ اقبال اور مغربی مفکرین، ص ۲۵۔

کو علم بنا کے دنیا کے حوالے کیا۔ علم کی دنیا ایک اکائی۔ یہ مشرق اور مغرب کی حد بندیوں میں منقسم نہیں ہے اقبالؔ اس راز سے باخبر ہی نہیں بلکہ یہ راز ایک تڑپ بن کے ان کے دل میں موجود ہے۔"[۱]

اس کے بعد آزادؔ نے "زبورِ عجم" کی نظم مثال کے طور پر پیش کی ہے۔ ڈاکٹر ظہور الدین اس مقالے کے متعلق لکھتے ہیں:

"اقبال اور فکر یونان" کے ضمن میں آزادؔ نے سقراط اور ارسطو کے فلسفیانہ نکات سے متعلق اقبال کے رویّوں کو دوسرے محققین کی توضیحات کی مدد سے جس طرح پیش کیا ہے اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ وہ خود افلاطون کے فلسفیانہ افکار اور ان کے اندر چھپے ہوئے آفاقی معانی سے کما حقہٗ واقف ہیں۔ سقراط کی تلاش حق، افلاطون کے فلسفۂ ایمان اور ارسطو کے سائنسی نظریات کو جس طرح آزادؔ نے اقبالؔ کی اپنی تحریروں کی روشنی میں واضح کیا ہے وہ انھی کا حصّہ ہے۔"[۲]

آزادؔ نے ان مقالوں میں بالترتیب ان تمام مغربی مفکرین کا جائزہ لیا ہے جن سے اقبالؔ متاثر ہوئے یا کسی حد تک متفق تھے۔ عموماً اقبالؔ کے افکار نے ٹکراؤ کا رُخ اختیار کیا ہے اور انھوں نے مغرب سے ہٹ کر اپنا ایک الگ راستہ منتخب کیا ہے۔ یہ کتاب اقبالیات کے سلسلے میں آزادؔ کی اہم تصنیف ہے جسے ان کا شاہکار کہا جاسکتا ہے۔ اس کے لیے انھوں نے بہت محنت کی۔ مغربی مفکرین کا گہرا مطالعہ کیا۔ ڈاکٹر یوسف حسین خاں لکھتے ہیں:

---

[۱] جگن ناتھ آزاد۔ اقبال اور مغربی مفکرین، ص ۳۸۔

[۲] ڈاکٹر ظہور الدین۔ "پروفیسر جگن ناتھ آزاد کی فلسفیانہ بصیرت" (مشمولہ) ارمغانِ آزاد مرتبہ ڈاکٹر ظہور الدین، ص ۹۵۔

"آپ نے یہ کتاب بڑی محنت سے لکھی ہے اس کے لیے آپ کو بہت پڑھنا پڑا ہوگا۔ آپ نے جو نتائج اخذ کیے ہیں وہ دلائل اور تجربے پر مبنی ہیں۔ میں بڑی حد تک اس سے متفق ہوں۔ آپ نے جن جن مفکرین کو چُنا ہے اُن کے تصوّرات کا بہت اچھا تجزیہ کیا ہے۔ میں آپ کو اس کامیاب کوشش پر مبارک باد پیش کرتا ہوں"۔ [1]

"اقبال اور جدید فکرِ مغرب" اس کتاب کا دوسرا اہم مقالہ ہے۔ اس مضمون میں بیکن، لاک اور کانٹ کے علاوہ ڈیکارٹ، اسپینوزا اور لبینز کے افکار کو بھی پیش کیا گیا ہے۔ اقبالؔ نے براہین و دلائل کی اہمیت سے انکار نہیں کیا ہے بلکہ ساتھ ہی ساتھ اسے انتہائے مقصود بھی قرار نہیں دیا۔ آزادؔ کے مطابق "گلشنِ راز جدید" میں بیکن کا خاص طور سے ذکر نظر آتا ہے۔ اقبالؔ لاک، برکلے اور ہیوم سے پورے طور پر متفق نہیں ہیں۔ وہ لاک کے مادّے کو مختارِ کُل قرار دینے کے نظریے کے خلاف ہیں۔ کانٹ کے نظریے سے اقبالؔ بہت متاثر ہیں مگر ان نظریات کو بھی اقبالؔ نے جوں کا توں قبول نہیں کیا۔ آزادؔ لکھتے ہیں :

"اقبالؔ کانٹ کے ساتھ بہت دور تک نہیں چلتے۔ کانٹ کی نظر میں انسان کی مختاری اور حیاتِ ابدی نظامِ کائنات کے انصاف کی دلیلیں ہیں لیکن اقبالؔ کے نزدیک یہ دونوں انسان کی اپنی جہد کے انعامات ہیں۔ کانٹ فرد کو واجب الوجود قرار دیتا ہے۔ اقبالؔ فرد کی جہد میں تپی ہوئی شخصیت کو"۔ [2]

نٹشے اور کانٹ دونوں قریب قریب ہم عصر تھے۔ نٹشے نے اپنے مسائل کا حل کانٹ کی تصنیف "تنقیدِ عقلِ محض" میں ڈھونڈا۔ وہ کانٹ سے بے حد متاثر ہوا۔ اس نے اپنے افکار کو یوں پیش کیا ہے :

---

[1] ڈاکٹر یوسف حسین خاں۔ ایک خط کا اقتباس (مشمولہ) ارمغانِ آزادؔ، مرتبہ ڈاکٹر ظہور الدین، ص ۱۳۱۔

[2] جگن ناتھ آزادؔ۔ اقبال اور مغربی مفکرین، ص ۴۵۔

"جب ہمیشہ میرے دل میں یہ احساس جاگزیں رہتا ہے کہ مجھے ایک فرض ادا کرنا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ میں ایک مدرک بالحواس مظہر سے بالاتر ہوں اور میں ایک فوق الحواس کائنات کا شہری ہوں جنّت کی حدیں موت کے بعد شروع نہیں ہوتیں بلکہ جنّت پہلے ہی ہمارا احاطہ کیے ہوئے ہے اور ہر قلب انسانی اس کی ضو سے منور ہے۔ نٹشے کی ابتدائی واردات قلب و نظر سے قطع نظر یہ ایک ایسا مقام ہے جہاں اقبال اس کے ہمنوا ہیں اور یہی خیالات اقبال کے یہاں ساحرانہ انداز سے ہمارے سامنے آتے ہیں۔" [1]

اس کے بعد چند اشعار پیش کرتے ہیں۔ اقبال، نٹشے اور برکلے کے ساتھ چل کر ایک قدم اپنے لیے نیا راستہ نکال لیتے ہیں اور کہتے ہیں ؎

جہان تازہ کی افکار تازہ سے ہے نمود
کہ سنگ و خشت سے ہوتے نہیں جہاں پیدا

شوپن ہائر بھی کانٹ سے متاثر ہے۔ اپنے ماحول کی اجتماعی ناکامی اور مایوسی نے اس کی فکر کو قنوطیت کے راستے پر ڈال دیا ہے۔ علامہ اقبال نے اس کا ذکر "پیام مشرق" میں کیا ہے۔ اقبال نے شوپن ہائر کی عظمت کا اعتراف کیا ہے مگر اس کے قنوطیت کے نظریے کی تغلیط بھی کی ہے۔ دوسروں کے غم میں تڑپنا اقبال کے نزدیک پسندیدہ عمل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ شوپن ہائر کی تعریف کرتے ہیں۔ آزاد اپنے مقالے میں لکھتے ہیں:

"اقبال نے شوپن ہائر کے نظریات کو اپنا کر انھیں اردو اور فارسی شاعری کا سحر انگیز جزو بنا دیا ہے مثلاً شوپن ہائر کی جس کتاب کا ذکر اوپر آیا ہے وہ اس فقرے سے شروع ہوتی ہے "یہ عالم خارجی میرے ہی خیال کا پرتو ہے" اقبال کہتے ہیں ؎

ایں جہاں چیست صنم خانۂ افکار من است [2]

---

[1] آزاد۔ اقبال اور مغربی مفکرین، ص ۵۰، ۴۹ [2] ایضاً، ص ۵۸۔

"آرزو کی تکمیل آرزو کی موت ہے"۔ اس معاملے میں بھی شوپن ہائر اور اقبال دونوں متفق نظر آتے ہیں۔ شوپن ہائر نے موت کی بھیانک تصویر کشی کی ہے۔ اقبال کے نزدیک موت ایک مقام ہے ؎

نظر اللہ پر رکھتا ہے مسلمان غیور
موت کیا ہے فقط اک عالم معنی کا سفر

اسی طرح شوپن ہائر کو عورت میں جنسی دل کشی کے علاوہ اور کوئی خوبی نظر نہیں آتی جب کہ اقبال نے عورت کو اعلا مقام دیا ہے ؎

"وجود زن سے ہے تصویر کائنات میں رنگ" [1] وغیرہ

کارل مارکس کے خیالات دنیا کی سیاست پر اس طرح اثر انداز ہوئے کہ دنیا کی تاریخ میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ ڈاکٹر اعجاز حسین، آل احمد سرور، پنڈت جواہر لال نہرو، ایڈورڈ تھامسن، عزیز احمد، سردار جعفری اور ڈاکٹر تاثیر وغیرہ میں سے بعض نے یہ کہا کہ اقبال عمر کے آخری حصے میں سوشلزم کے قریب ہو گئے تھے۔ بعضوں نے مسلم سوشلسٹ کہا۔ آزاد ان سب کے خیال سے اتفاق نہیں کرتے۔ آزاد اس غلط فہمی کے دو تین اسباب بتلاتے ہیں ان میں سے ایک اقبال کی جادو بھری شاعری ہے، دوسرا تھامسن اور نہرو کی تحریریں ہیں۔ نیز دوسرے نقادوں کے خیالات، تیسری بات جسے آزاد نے حاشیہ میں تحریر کیا ہے، وہ بھی بہت اہم ہے۔ آزاد حاشیہ میں لکھتے ہیں :

"اس کا ایک تیسرا سبب بعض پڑھے لکھے ہندوستانیوں کا ضعفِ ایمان بھی ہو سکتا ہے وہ ترقی پسندی کے شوق میں اپنے آپ کو سوشلسٹ یا کمیونسٹ کہلانا بھی پسند کرتے ہیں اور ساتھ یہ بھی چاہتے ہیں کہ وہ ہندو یا مسلمان بھی کہلائیں۔" [2]

آزاد نے اقبال کے مضامین، خطوط، ریڈیو نشریات، آخری دور کا کلام نیز قرآن و حدیث کی روشنی میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اقبال اسلامی سوشلسٹ

---

[1] جگن ناتھ آزاد۔ اقبال اور مغربی مفکرین، ص ۶۰، ۶۱۔ [2] ایضاً۔ ص ۷۹ (حاشیہ)۔

نہیں تھے۔ اس کی گنجائش نہ کلامِ اقبال میں ہے اور نہ ہی اسلام کے ضابطۂ حیات میں ہے۔ آزاد لکھتے ہیں :

"اقبال سرمایہ داری کے خلاف مزدور کی بغاوت سے تو خوش تھے۔ لیکن اشتراکی نظامِ حکومت پر ان کا قطعی ایمان نہیں تھا۔ اقبال کے جن اشعار یا نظموں کو لے کر انھیں یا ان کی روح کی اشتراکی کے لقب سے نوازا جا رہا ہے وہ نظمیں ایک تو اس جذبۂ بغاوت کا نتیجہ ہیں جو اقبال کے دل میں سرمایہ داری اور جاگیرداری کے خلاف سلگ رہا تھا دوسرا انسان دوستی کا۔ اقبال چوں کہ عملی طور پر سرمایہ داری اور جاگیرداری کے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھا سکتے تھے اور عملی سیاست میں انھیں سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کے ساتھ قدم بہ قدم چلنا تھا اس لیے ان کی شاعری میں یہ دبی ہوئی آگ اور تیزی سے بھڑکی ہے"۔[1]

اقبال جس نظام کو چاہتے ہیں وہ اسلام میں نظر آتا ہے۔ اقبال نے اپنے نظریہ کی وضاحت اپنی نظم "اشتراکیت" میں کی ہے۔ اقبال نے کارل مارکس کو پیغمبرِ بے جبرئیل اور پیغمبرِ حق ناشناس بھی کہا ہے۔ اقبال صرف ملوکیت کے خلاف تھے نہ کہ اشتراکیت کے حق میں۔ آخر میں یہ نتیجہ اخذ کرتے ہوئے آزاد لکھتے ہیں :

"اقبال کے ان اشعار کی روشنی میں زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اقبال مغربی یوروپ کے جمہوری نظام پر اشتراکی نظام کو ترجیح دیتے ہیں لیکن اشتراکی نظام کے مقابلے میں اسلام کو بدرجہا بہتر نظام سمجھتے ہیں"۔[2]

"اقبال اور نٹشے" میں آزاد نے نٹشے کے حالاتِ زندگی، تعلیم اور فلسفۂ افکار

---

[1] جگن ناتھ آزاد۔ اقبال اور مغربی مفکرین، ص ۸۲، ۸۱۔ [2] ایضاً ص ۹۸۔

پر مفصّل روشنی ڈالی ہے۔ اقبال نے نٹشے کا بہت زیادہ اثر قبول کیا ہے۔ ایک قطعہ نقل کرنے کے بعد اقبال کی کتاب "تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ" کا اقتباس پیش کرتے ہیں۔ نٹشے نے مسیحی فلسفۂ اخلاق پر زبردست حملہ کیا ہے۔ اس کا دماغ اس لیے کافر ہے کہ وہ خدا کا منکر ہے مگر بعض اخلاقی نتائج میں اس کے افکار مذہب اسلام کے بہت قریب ہیں یہی وجہ ہے کہ اقبال نٹشے کے فلسفۂ حیات سے متاثر ہیں۔ آزاد لکھتے ہیں:

"نٹشے کے اس فلسفۂ حیات سے کہ سخت ہو جاؤ، خطرے کی زندگی بسر کرو، اچھائی کیا ہے؟ جو تم میں قوت کا احساس پیدا کرے۔ برائی کیا ہے؟ وہ سب جو کمزوری سے حاصل ہوتا ہے، اقبال بہت متاثر ہوئے ہیں"۔[۱]

اس کے بعد آزاد "اسرارِ خودی" کی کہانی "حکایت الماس و زغال" کے علاوہ اور بہت سی مثالیں پیش کرتے ہیں۔ "خرابات فرنگ" کا ذکر کرتے ہوئے آزاد ہمیں یہ بتاتے ہیں کہ نٹشے کا فلسفۂ خواہش اقتدار چوں کہ نظریۂ مذہب اور اخلاق کی نفی کرتا ہے اس لیے اقبال نٹشے سے الگ اپنا راستہ اختیار کرتے ہیں۔

آزاد نے نٹشے کا مختلف فلسفۂ افکار سے اقبال کے کلام سے موازنہ کیا ہے اور وہ اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ اقبال نٹشے سے متاثر ہوئے بلکہ اس کی ذات کے ساتھ انھیں ایک خاص تعلق پیدا ہو گیا تھا۔ اس لیے اقبال کو اس بات کی حسرت رہی کہ کاش نٹشے کو کوئی شیخ احمد سرہندی مل جاتا۔ اقبال نے نٹشے کے بہت سے نظریات کی مخالفت بھی کی ہے۔ نٹشے کے فوق البشر اور علامہ کے "مردِ مومن" میں ذرا سی مماثلت ہے۔ آزاد نے اس پر بھی عالمانہ بحث کی ہے۔ آزاد نٹشے کے اقوال اور اقبال کے اشعار دونوں ساتھ ساتھ پیش کرتے ہیں۔ ایک مقام پر آزاد لکھتے ہیں:

"علامہ نے ایک طرف تو نٹشے سے الگ راستہ اختیار کیا اور دوسری طرف نٹشے کے بعض نظریات کو اپنی ترمیم اور اضافے کے ساتھ لباسِ شعر پہنایا ہے۔ یہ صرف ان کی فکر ہی کی عظمت ہی کی نہیں بلکہ شاعرانہ

---

[۱] آزاد - اقبال اور مغربی مفکرین، ص ۱۷۱۔

عظمت کی بھی دلیل ہے۔ یہ کہنا کہ اس قسم کی مثالوں سے علامہ کی
شاعرانہ عظمت پر حرف آتا ہے، صحت مندانہ انداز سے صحیح نہیں
ہے بلکہ مریضانہ انداز سے سوچنے کا نتیجہ ہے۔"[1]

برگساں، دانتے، ملٹن اور گوئٹے میں صرف برگساں ہی مغربی مفکرین کے زمرے
میں آتا ہے۔ دانتے، ملٹن اور گوئٹے تینوں فلسفی شاعر ہیں۔ آزاد کے مطابق اقبال
سب سے زیادہ مغربی مفکرین میں، برگساں ہی سے متاثر ہوئے ہیں۔ برگساں کے خیال
میں عقل حقیقت کا ادراک اس وقت تک نہیں کر سکتی جب تک کہ وجدان کی حدوں
میں داخل نہ ہو جائے۔ یہاں اقبال برگساں کے ہم خیال ہیں اور اس نظریے کو انھوں
نے کئی جگہوں پر خوب صورتی سے پیش بھی کیا ہے۔

آزاد برگساں کے مختلف افکار و خیالات کو پیش کرتے ہوئے اقبال کے نظریات
کا ان سے مقابلہ کیا ہے۔ وہ زیادہ تر اقبال کے تصور کو برگساں سے ہم آہنگ پاتے
ہیں۔ چنانچہ برگساں کے نظریے کو پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ہر آنے والا لمحہ صرف ایک نئی چیز نہیں ہے بلکہ اس کی پہلے
سے پیش بینی بھی ناممکن ہے۔ تغیر ایک ایسا فطری اور بنیادی عمل
ہے کہ شاید پوری طرح تصور میں بھی نہ آسکے، یہاں اقبال اور
برگساں کے نظریۂ زماں میں ہمیں کوئی فرق نظر نہیں آتا مگر جہاں
برگساں ہر لحظہ تغیر پذیر زماں ہی کو حقیقت کہتا ہے اور اسی کو
ہستی قائم بالذات مانتا ہے وہاں اقبال ایک ایک راستہ
اختیار کرتے ہیں"[2]

برگساں سے اپنے اختلافات کو علامہ اقبال نے "تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ"
میں بڑی وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ یہ اختلاف علامہ کے کلام میں بھی کئی جگہ
موجود ہے۔ لیکن ان تمام اختلافات کے باوجود یہ ایک حقیقت ہے کہ اقبال نظریاتی

---

[1] آزاد۔ اقبال اور مغربی مفکرین، ص ۱۱۶۔ [2] ایضاً، ص ۱۲۱، ۱۲۲۔

اعتبار سے تمام مغربی مفکرین کی بہ نسبت برگساں سے زیادہ قریب ہیں۔

دوسرے تمام مفکرین کی طرح آزاد نے دانتے، ملٹن اور گوئٹے کے حالاتِ زندگی بیان کرتے ہیں مگر یہاں افکار و نظریات پیش کرنے کی بجائے ان کے اشعار نقل کیے گئے ہیں۔ "ڈیوائن کامیڈی" ایک بیانیہ نظم ہے لیکن اس میں شاعر کا کمال فن تنہا قصہ در قصہ کے حسن بیان میں نہیں ہے جتنا بیان کو انتہائی نزاکت کے تمثیل لباس پہنانے میں ہے۔ "ڈیوائن کامیڈی" کی تمام خوبیاں جاوید نامے میں موجود ہے۔ آزاد لکھتے ہیں:

> "اگر 'جاوید نامہ' کا تصوّر اقبال نے "ڈیوائن کامیڈی" سے لیا بھی ہو تو اقبال کی شاعرانہ یا مفکرانہ عظمت پر کوئی حرف نہیں آتا کیوں کہ جاوید نامہ 'ڈیوائن کامیڈی' کا چربہ نہیں بلکہ ایک ایسا اوریجنل شاہکار ہے جس میں اقبال کی علمیت، مشاہدات، تجربات اور واردات قلبی بڑے فنکارانہ اور انوکھے انداز سے بیان ہوئے ہیں"۔ [1]

دانتے اور اقبال کی شاعری کا تقابلی مطالعہ کیا گیا ہے۔ جگہ جگہ آزاد نے دانتے اور اقبال کے اشعار نقل کیے ہیں۔

اقبال نے ابلیس کو محض شر کی علامت کہہ کر مردود قرار نہیں دیا بلکہ ایک ایسی قوت کے طور پر پیش کیا ہے جس میں موجودگی میں نیکی اور خیر کی قوتوں کا موجود ہونا اسی طرح ضروری ہے جس طرح عقاب کو اونچا اڑانے کے لیے بادِ مخالف میں تیزی و تندی کی موجودگی۔

مغربی شعراء میں ملٹن اور گوئٹے نے اسی خاص نظریے سے ابلیس کو دیکھا ہے ملٹن کی نظم فردوس گم گشتہ PARADISE LOST میں جو انسان کے زوال کی داستان ہے ابلیس، ہمیں محض ایک علامتِ شر کے طور پر نہیں بلکہ علامت حرکت

---

[1] آزاد۔ اقبال اور مغربی مفکرین، ص ۱۲۸۔

وجہد و عمل کے طور پر نظر آتا ہے۔

گوئٹے نے اپنے مشہور ڈرامہ "فاؤسٹ" میں عقلیت پسندی کے خلاف آواز اٹھائی ہے۔ فاؤسٹ پر یہ حقیقت کھلتی ہے کہ محض علم اور عقل کی بدولت انسان حقیقت کو نہیں پا سکتا۔ فاؤسٹ دراصل عمل ہی کو حقیقت تک پہنچنے کا ذریعہ بتلاتے ہیں۔ فاؤسٹ کے کردار کے ذریعے سے گوئٹے نے یہ بات اپنے قاری کے ذہن نشین کرانے کی کوشش کی ہے کہ انسان اگر ابلیس کے زیر اثر پست نفسیاتی خواہش میں الجھ کر نہ رہ جائے تو وہ اس مجازی عشق کے ذریعے سے عشق حقیقی تک پہنچ سکتا ہے۔ اقبال کے یہاں بھی ابلیس کا تصور گوئٹے کے تصورِ ابلیس سے مختلف نہیں۔

آزاد کی یہ تصنیف بہت ہی اہمیت کی حامل ہے۔ بقول ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی:

> "اقبال اور مغربی مفکرین، اپنے موضوع پر ایک عالمانہ مطالعہ ہے۔ یہ کتاب اقبالیاتی ادب میں ایک وقیع مقام رکھتی ہے۔ آزاد کی اس کتاب سے اقبالیات کے طالبِ علم برسوں تک استفادہ کرتے رہیں گے۔"[۱]

"اقبال اور کشمیر" اقبالیات کے ضمن میں جگن ناتھ آزاد کی یہ تصنیف بھی بہت اہم ہے۔ اس زمانے میں اس عنوان کے تحت کثرت سے مضامین لکھے گئے اور کتابیں بھی شائع ہوئیں۔ آزاد نے "اقبال اور کشمیر" عنوان کے تحت چند تاریک گوشے روشن کیے ہیں۔ ایسی شخصیتوں سے واقف کروایا ہے جو اقبال کے اولین جوہر شناس تھے اور ایسے میگزین جن میں اقبال کا کلام شائع ہوتا تھا۔ جن میں اقبال کے افکار و نظریات پر بحث و مباحثے ہوتے تھے۔ آزاد نے ان سے سب سے روشناس کرایا ہے۔ یہی نہیں، اقبال نے کتنی مرتبہ کشمیر کا سفر کیا؟ کشمیریوں سے ان کے تعلقات، خود علامہ کا کشمیر سے لگاؤ، کشمیر کی تحریکیں، اقبال کی ان تحریکوں سے دلچسپی اور وابستگی اور

۱۔ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی۔ "آزاد کی ایک تصنیف اقبال اور مغربی مفکرین" (مشمولہ) سہ ماہی "لمحے لمحے" بدایوں، ص ۳۷۶۔

مشاہیرِ کشمیر سے تعلقات وغیرہ ایسے موضوع ہیں جن پر آزاد نے تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔

علّامہ اقبال کو کشمیر سے روحانی تعلق تھا، اس میں کوئی دو رائے نہیں۔ وہ اپنے کشمیری ہونے پر فخر کرتے تھے۔ یہ بھی کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے۔ "اقبال اور کشمیر" کے بارے میں یہ فیصلہ کرنا کہ محب کون ہے اور محبوب کون، مشکل کام ہے۔

منشی محمد الدین فوقؔ جو کشمیری میگزین کے اڈیٹر تھے اور اقبالؔ سے جن کے تعلقات اچھے تھے۔ سب سے پہلے علّامہ اقبالؔ کے حالاتِ زندگی شائع کیے۔ انھوں نے دو کتابیں "مشاہیرِ کشمیر" اور "تاریخ اقوامِ کشمیر" کے نام سے لکھیں جن میں اقبالؔ کے حالاتِ زندگی کو مفصّل طور پر بیان کیا گیا گویا کہ یہ سب سے پہلے علّامہ کے جوہر شناس تھے۔ یہی وجہ ہے کہ آزاد نے کشمیری میگزین اور "تاریخ اقوامِ کشمیر" کے طویل اقتباسات کو اپنی کتاب میں جگہ دی ہے اور ساتھ ہی ساتھ محمد الدین فوقؔ کے مکمل حالاتِ زندگی بھی نقل کیے ہیں۔

دوسری شخصیت احمد دین ایڈوکیٹ کی ہے جنھوں نے "اقبال" کے نام سے "کلامِ اقبالؔ" شائع کیا اور بعد میں اسے تلف کر دیا۔ ان دونوں شخصیتوں کے متعلق آزاد خاصی تفصیلات بہم پہنچاتے ہیں۔ محمد الدین فوقؔ کے بارے میں ایک جگہ لکھتے ہیں؛

> "محمد الدین فوقؔ کے ساتھ اقبالؔ کے گہرے دوستانہ مراسم تھے
> اقدارِ مشترک تین تھیں۔ حُبِّ اردو، حُبِّ کشمیر اور حُبِّ اسلام۔
> اس دوستی کی ابتدا لڑکپن ہی سے ہو گئی تھی۔"[۱]

آزاد نے ان دو شخصیتوں کے تعلقات، مراسم اور کلام کا غائرانہ جائزہ لیا ہے۔ فوقؔ شاعر بھی تھے اور مورّخ بھی۔ اس لیے ان کی شاعری اور تاریخ نگاری کا بھی تذکرہ کیا گیا۔ اقبالؔ اور فوقؔ کے خطوط جن سے ان کے مراسم کا اندازہ ہوتا ہے۔ آزاد نے ان خطوط کے اقتباسات پیش کیے ہیں۔

---

[۱] آزاد۔ اقبال اور کشمیر، ص ۲۴۔

"اقبال اور کشمیر" کا زیادہ تر حصہ ان دو اہم شخصیتوں کے حالاتِ زندگی پر مشتمل ہے، پھر ان کی کتابوں پر تبصرے ہیں۔ چنانچہ فوقؔ کی کشمیری میگزین، مشاہیرِ کشمیر، تاریخ اقوامِ کشمیر، کتابوں میں جو اقبالؔ کا ذکر ہے، آزادؔ نے انھیں اپنا موضوع بنایا ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

"اقبالؔ کے سوانحِ حیات جو "مشاہیرِ کشمیر" میں شائع ہوئے ایک طرح سے ان سوانح حیات کی توسیع تھے۔ جو کشمیری میگزین میں شائع ہو چکے تھے"۔[1]

"تاریخ اقوامِ کشمیر" کے بھی آزادؔ نے اقتباسات پیش کیے ہیں اور اس کتاب کی اہمیت بتلائی ہے۔ آزاد لکھتے ہیں:

"تاریخ اقوامِ کشمیر، جولائی (۱۹۴۳ء) میں شائع ہوئی۔ اس مقالے کا عنوان ہے "مسلمان سپرو خاندان"۔ اس میں جہاں تک اقبالؔ کی زندگی کے حالات کا تعلق ہے کوئی نئی بات نہیں ہے لیکن خاندان اقبال کے متعلق جو کچھ لکھا ہے وہ خاصا اہم ہے"۔[2]

اس کے بعد آزادؔ، اقبالؔ کے پچیس خطوط کو اپنی کتاب میں شامل کرتے ہیں جو محمد الدین فوقؔ کے نام لکھے گئے ہیں۔ ان خطوط کے ذریعے سے ایک طرف علامہ کے خیالات کی عکاسی ہوتی ہے تو دوسری طرف محمد الدین فوقؔ سے جو تعلقات تھے ان کا بھی اظہار ہوتا ہے۔ خط میں اقبالؔ نے کہیں ڈیر فوقؔ، بھئی فوقؔ اور کہیں برادرِ مکرم و معظم کہہ کر مخاطب کیا ہے۔ ان خطوط میں بے تکلفانہ اور دوستانہ ماحول پایا جاتا ہے۔ کسی کسی موضوع پر قدرے تفصیل بھی ہے۔ خاص طور پر فوقؔ کی کتابوں پر تبصرہ اور کشمیر کے حالات کے خطوط طویل ہیں۔ کیمبرج (انگلستان) سے اقبالؔ نے جو خط تحریر فرمائے ہیں وہ کسی حد تک سفرنامہ بن گیا ہے۔ سفر کے حالات، وہاں کے مسلمانوں کے حالات، سب مل کر سفرنامہ بننے میں کوئی کسر باقی نہیں ہے۔

---

[1] آزاد۔ اقبال اور کشمیر، ص ۳۱۔ [2] ایضاً، ص ۳۶۔

آخری خط میں انجمن کشمیری مسلمانان لاہور کا ذکر ہے۔ دوسرے باب میں بھی اس عنوان کے تحت انجمن کے حالات و کوائف لکھے گئے ہیں۔ سب سے پہلے اقبال کی ستائیس[۲۷] اشعار کی مکمل نظم ہے جو "فلاحِ قوم" عنوان کے تحت لکھی گئی تھی اور یہ نظم طالب علمی کے زمانے میں ہی انجمن کشمیری مسلمانان لاہور میں پڑھی گئی۔ آگے چل کر اقبال اس انجمن کے جنرل سکریٹری مقرر ہوئے تھے۔

مولوی احمد دین کا اس سے قبل ذکر کیا گیا ہے، ان کی کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے آزاد لکھتے ہیں:

> کتاب 'اقبال' کے مطالعہ سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اقبال شناسوں میں ان کا رتبہ بہت اونچا ہے اور بالخصوص جب اس بات پر نظر جاتی ہے کہ آپ نے اقبال پر ۲۸۴ صفحے کی کتاب اس وقت لکھی جب نواب ذوالفقار علی خاں کی انگریزی تصنیف A VOICE FROM THE EAST کے علاوہ اور کوئی کتاب نشانِ راہ کے طور پر موجود نہیں تھی تو آپ کی اقبال شناسی پر ایمان لانا پڑتا ہے"۔[۱]

مولوی احمد دین کے حالاتِ زندگی کے لیے آزاد اقبال ریویو کراچی کا حوالہ دیتے ہیں جس میں مشفق خواجہ نے مولوی احمد دین کا تذکرہ کیا ہے اور حالات لکھے ہیں۔ اس سلسلے میں مولوی احمد دین کی کتابوں کا تذکرہ بھی کیا گیا ہے۔ اقبال سے احمد دین کے مراسم و تعلقات نیز کلام، تصانیف اور خطوط کا ذکر موجود ہے۔ آزاد ان خطوط کے بھی اقتباسات پیش کرتے ہیں جو کلیم احمد شجاع اور مولانا غلام رسول مہر نے آزاد کو لکھے۔ آزاد نے اس بات کی تحقیق کے لیے کہ احمد دین نے جو کلامِ اقبال یکجا کر کے شائع کر دیا تھا اور پھر اسے جلا ڈالا، اس کی حقیقت کیا ہے؟ اس کے لیے بہت سارے لوگوں کو خطوط لکھے۔ چنانچہ احمد دین کے فرزند کو بھی انھوں نے خط لکھ کر معاملے کی تہ تک پہنچنے کی کوشش کی۔ اس طرح آزاد کا یہ کارنامہ اور قابلِ تحسین ہے۔

۱؎ آزاد۔ اقبال اور کشمیر، ص ۹۱۔

اقبالؔ کشمیر ایک بار تشریف لائے یا متعدد بار ؟ اس بارے میں بھی آزادؔ نے خاصی تحقیق کی ہے ۔ چنانچہ آزادؔ کی تحقیق ہے کہ جون ۱۹۲۱ء میں اقبالؔ پہلی اور آخری بار کشمیر تشریف لائے ۔ آزادؔ نے اس ضمن میں " ساقی نامہ " کے اس حصّے سے بحث کی ہے جس میں کشمیر کا ذکر ہے اور جس کے بارے میں یہ بھی کہا گیا کہ اس میں کشمیریوں کا مذاق اُڑایا گیا ہے ۔ آزادؔ نے اس الزام کا دفاع کیا ہے ۔ اس سلسلے میں علامہ کے خط دلیل کے طور پر پیش کرتے ہیں ۔ علامہ اقبالؔ کے خط کا اقتباس ملاحظہ کیجیے :

" جو لوگ میرے اشعار کو کشمیریوں کا ہجو تصوّر کرتے ہیں وہ شعر کے مذاق اور مقاصد سے بالکل بے بہرہ ہیں ان کے لیے یہی جواب کافی ہے کہ میرے آبا و اجداد اہلِ خطہ میں سے ہیں " ۔ [۱]

اقبالؔ کے سفرِ کشمیر کی غرض و غایت کے متعلق خود اقبالؔ کے خطوط پیش کیے گئے ہیں جو منشی صاحب کے نام لکھے گئے ہیں ۔ اسی طرح آزادؔ نے کشمیر کے معمر حضرات سے بھی اس بارے میں گفتگو کی کہ اقبالؔ کتنی بار کشمیر تشریف لائے اور آخر اس نتیجے پر پہنچے کہ اقبالؔ صرف ایک ہی بار کشمیر تشریف لاسکے اور دوسری مرتبہ کی خواہش رکھتے تھے مگر یہ خواہش پوری نہ ہوئی ۔

اس کے بعد آزادؔ نے اقبالؔ کی " دو غیر معروف نظمیں " اور ایک خط کو اپنی کتاب میں شامل کیا ہے ۔ منشی سراج الدین سے اقبالؔ کے دوستانہ مراسم تھے ۔ انھوں نے چار انگوٹھیاں اقبالؔ کو تحفۃً بھیجی تھیں ، جس کے جواب میں اقبالؔ نے ایک خط اور ایک نظم رسید کے طور پر بھیجی جنھیں آزادؔ نے اپنی کتاب کی زینت بنائی ہے ۔ پہلی نظم تو انگوٹھیوں کے متعلق تھی ۔ دوسری نظم کے بارے میں آزادؔ لکھتے ہیں :

" دوسری نظم وہی ہے جس کا ذکر گزشتہ باب میں کیا جاچکا ہے اور جو اقبالؔ نے خواجہ عبدالصمد ککڑو رئیس بارہ مولہ کے فرزند

---

[۱] خط بنام خورشید احمد ۲۶ مئی ۱۹۲۳ء (مشمولہ) اقبال اور کشمیر از جگن ناتھ آزاد ، ص ۱۱۲ ۔

کی موت پر کہی۔ اس نظم کا عنوان ہے "ماتم پسر" اور یہ "مخزن" میں
شائع ہوئی تھی۔ یہ بھی ۱۹۰۲ء کی نظم ہے"۔[1]

بقول آزاد یہ نوحہ یا ماتم درد و گداز سے یکسر خالی ہے۔ سب سے زیادہ طویل اور اہم مضامین "سیاسیات کشمیر" اور "کشمیر کمیٹی" ہیں۔ اقبال نے کشمیر کی تحریک آزادی کے ساتھ اپنا جوش و خروش شامل کر دیا۔ وہ ہمیشہ اس بات کے خواہش مند رہے کہ کشمیریوں کو آزادی کے ساتھ دو وقت کی روٹی نصیب ہو۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے رہنمایانِ کشمیر کا ساتھ دیا اور ان کی تحریکوں سے وابستہ ہوئے۔ آزاد اس سلسلے میں لکھتے ہیں :

"اقبال نے کشمیر میں ایک جمہوری نظام لانے کے لیے خود قید و بند کو دعوت دی ہو یا نہ دی ہو لیکن جہاں تک اس تحریک کی کامیابی کے لیے جہاد بالقلم کا تعلق ہے۔ تحریک آزادیِ کشمیر کے تعلق سے اقبال کی خدمات کشمیر کے آسمانِ سیاست پر چاند تاروں کی طرح چمکتی رہیں گی"۔[2]

اس سلسلے میں آزاد نے کئی مکتوبات کو مکمل طور پر شامل کتاب کیا ہے جن کے ذریعے سے اقبال کی جد و جہد، تحریک سے وابستگی اور کشمیریوں کے متعلق خیالات اور پھر خود ان کے خدمات کا اندازہ ہوتا ہے۔

"کشمیر کمیٹی" خاصا طویل مضمون ہے۔ اس کے دو حصے ہیں۔ پہلے حصے میں "فرقۂ احمدیہ" کے تعلق سے خاطر خواہ مواد موجود ہے۔ دوسرے حصے میں اقبال کے فرقۂ احمدیہ سے تعلق پر اظہارِ خیال کیا گیا ہے۔ احمدیوں کا یہ خیال تھا کہ علامہ اقبال کے والد شیخ نور محمد نے مرزا غلام احمد کے ہاتھ پر بیعت کی تھی۔ محمد اقبال اور ان کے بھائی شیخ عطا محمد دونوں احمدیہ جماعت کے رکن تھے۔ اقبال پر لگائے گئے الزامات اور اقبال

---

[1] جگن ناتھ آزاد۔ اقبال اور کشمیر، ص ۱۲۷۔ [2] ایضاً، ص ۱۳۹۔

کی طرف سے دیئے گئے جوابات کا تجزیہ کرتے ہوئے آزاد لکھتے ہیں:

"ظاہر ہے کہ اقبالؔ پر یہ الزام دراصل احمدیہ تحریک کی طرف سے عائد ہو رہا تھا۔ دوسری بات اس موقع پر احمدیہ تحریک کے حامیوں نے یہ کہی کہ اقبالؔ اس لیے احمدیہ تحریک کے خلاف ہو گئے ہیں کہ گول میز کانفرنس میں عملی طور پر مسلمانوں کی قیادت ایک طرح سے ظفر اللہ خاں کے ہاتھ میں رہی حالاں کہ اقبالؔ یہ چاہتے تھے کہ یہ مقام مجھے حاصل رہے لیکن یہ دونوں الزامات اقبالؔ کے اس اعتراض کا جواب نہیں دے رہے ہیں کہ احمدیہ تحریک آل انڈ کشمیر کمیٹی کے ذریعے اپنے سیاسی مقاصد حاصل کرنے کے لیے کوشاں تھی۔" [1]

"نٹشے سے غنی کاشمیری تک"۔ اس مضمون میں آزاد نے جاوید نامے کے "آنسوئے افلاک" نظم کے بہت سے حصے کا ترجمہ کیا ہے۔ اس حصے میں کشمیر کے حال زار پر آنسو بہائے گئے ہیں۔ اقبالؔ کا کشمیر کے ساتھ تعلق روحانی تھا۔ اس کی گرہ کشائی بھی کی گئی ہے۔ اس لیے سب سے پہلے نٹشے کا ذکر کرتے ہیں جس کے بارے میں علامہ کا خیال تھا کہ اس کا دل مومن ہے اور دماغ کافر، اور جو باغِ بہشت میں فردوس کے حدود سے سے باہر ہی رہا۔ اس کے بعد رومیؒ کا ذکر ہے۔ آزاد کے نزدیک اقبالؔ نے رومیؒ اور نٹشے دونوں کو مخاطب کر کے مسئلۂ کشمیر کے لیے فضا ہموار کیے ہیں اس کے بعد اصل مسئلہ پیش کیا ہے۔ چنانچہ وہ پوری نظم کا ترجمہ اور تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"گویا اب اقبالؔ قاری کو مسئلۂ کشمیر کی روحانی تفسیر کے لیے تیار کر رہے ہیں جس کی مادی تعبیر اقبالؔ ہی کے الفاظ میں ان کے مکاتیب میں بیان کی جا چکی ہے۔" [2]

---

[1] آزاد۔ اقبال اور کشمیر، ص ۱۶۲، ۱۶۳۔ [2] ایضاً، ص ۱۶۸۔

رومی نے اقبال کو پنجاب کے حالات سے واقف کرایا۔ اقبال کہتے ہیں کہ رومی کی اس گفتگو نے میرے دل میں ایک سوز پیدا کر دیا۔ میں بہشت میں ہونے کے باوجود اپنے رفیقوں کے غم میں تڑپ اٹھا اور میرے دل میں پرانے غم تازہ ہو گئے۔ حوضِ کوثر کے کنارے سے ایک آواز بلند ہوئی۔ یہ کشمیر کے شہرۂ آفاق شاعر غنی کی آواز ہے اور یہیں سے اس موضوع کی ابتدا ہوتی ہے۔

اس مضمون کے بعد آزاد نے "امیر کبیر" حضرت سیّد علی ہمدانی، شاہ ہمدانی کے حضور میں" عنوانات کے تحت اپنے مضمون کو وسعت دی ہے۔ اقبال نے مسئلۂ کشمیر کے تعلق سے اپنے فلسفۂ حیات کی ابتدا غنی کے شعر سے کی ہے۔ غنی کا شعر سنتے ہی رومی اقبال کو مشورہ دیتے ہیں کہ اے پسر! جو کچھ ہونے والا ہے اسے دیکھ اور جو کچھ گزر گیا اس کا غم نہ کر۔ دیکھ شاعر رنگین نوا جس کا نام ہے ظاہر غنی ہے اس کا فقر باطن میں بھی غنی ہے۔ وہ مست مدام شاعر سیّد والا مقام حضرت علی ہمدانی رح کے حضور میں اپنا کلام سنا رہا ہے[1]

اس کے بعد آزاد مختصر طور پر حضرت سیّد علی ہمدانی کا تعارف کراتے ہیں جو سیّد السادات ہیں۔ غزالی ایسے مفکر نے جب اللہ ہو کا درس لیا تو ذکر و فکر انھوں نے سیّد علی ہمدانی کے بزرگوں سے حاصل کیا۔ کشمیر کو کشمیر بنانے میں حضرت شاہ علی ہمدانی کا بہت ہاتھ تھا۔ انہی کی بدولت کشمیر نے ایرانِ صغیر کا نام پایا۔ شاہ ہمدانی کشمیر کے محسنِ اعظم ہیں۔ رومی زندہ رود کو یہ مشورہ دیتے ہیں کہ تم اپنے مسائل شاہ ہمدانی کے حضور میں پیش کرو۔ دوسرا یہ کہ روحانی دنیا میں شاہ ہمدانی بہت بڑے مرتبے کے حامل ہیں۔

رومی کی بات اقبال کے دل میں اتر گئی اور وہ اسی لمحے شاہ ہمدان کے حضور میں حاضر ہو گئے۔ مسئلہ خیر و شر اور مسئلہ روح و بدن کو ان کے سامنے پیش کیا۔ اقبال یہاں تمام سوالات کے جوابات پا لیتے ہیں اور پھر مسئلہ کشمیر کے متعلق سوالات کرتے ہیں جہاں انسان انسان کا خون بہا رہا ہے یہاں کے لوگوں کو خودی نصیب نہیں۔

---

[1] آزاد۔ اقبال اور کشمیر، ص ۱۷۳۔

اقبالؔ کشمیر کے ماضی کی طرف بھی لوٹ جاتے ہیں۔ آزادؔ لکھتے ہیں:

"اس مرغ سحر کے نالۂ پُرسوز نے بقول اقبالؔ ان کی روح میں ایک نئی تب وتاب پیدا کر دی اور تھوڑی دیر میں وہ کیا دیکھتے ہیں کہ ایک دیوانہ جوش وخروش کے عالم میں ایک نغمہ گا رہا ہے اور یہ نغمہ شاعری کا وہ شاہکار ہے جو آج بھی ہر اہلِ ذوق کی زبان پر ہے۔ یہ نغمہ دراصل انگریزوں اور مہاراجہ گلاب سنگھ کے درمیان اس معاہدے پر ایک شدید طنز ہے جس کی رُو سے جموں وکشمیر کا علاقہ انگریزوں نے مہاراجہ کے ہاتھ پچھتر لاکھ روپے میں فروخت کر دیا تھا۔" [1]

شاہ ہمدان کی گفتگو سے مسئلہ خیر وشر آئینے کی طرح روشن ہو جاتا ہے اس طرح دوسرے مسائل بھی حل ہو جاتے ہیں۔ اس مضمون کے آخر میں ضمیمہ ہے جس میں چند اعتراضات کے جوابات آزادؔ نے دیے ہیں۔ یہ اعتراضات شیخ محمد عبداللہ اور چند اشعار کے بارے میں ہے۔ ان اعتراضات کا جواب آزادؔ نے مدلل طور پر پیش کیا ہے۔

پہلا سوال اور اعتراض یہ ہے کہ علامہ اقبالؔ نے اپنی نظم میں کون سے ملا زادہ ضیغم لولابی کا ذکر کیا ہے، اس بارے میں اختلاف ہے۔ آزادؔ لکھتے ہیں:

"ارمغانِ حجاز میں اس حصے کا عنوان جس میں چھوٹی بڑی اُنتیس نظمیں ہیں "ملا زادہ ضیغم لولابی" کا بیاض ہے۔ ان اُنتیس نظموں میں سے آٹھ تو ایسی ہیں جن کا موضوع بلا واسطہ کشمیر ہی ہے اور باقی گیارہ بالواسطہ طور پر مذکورہ موضوع سے ہم آہنگ ہیں یعنی ان میں براہِ راست کشمیر کا ذکر تو نہیں لیکن سلسلۂ فکر وہی ہے۔" [2]

---

[1] جگن ناتھ آزاد۔ اقبال اور کشمیر، ص ۱۸۰۔

[2] جگن ناتھ آزاد۔ اقبال اور کشمیر، ص ۲۰۳۔

ملازادہ لولابی کے بارے میں سب سے پہلے آزاد سید عابد علی عابد کا قول نقل کرتے ہیں کہ "ملازادہ ضیغم لولابی ایک فرضی کردار ہے"۔ آزاد کی اس سلسلے میں تحقیق یہ ہے کہ ملازادہ ضیغم لولابی ایک استعارہ ہے جس سے اقبال بہ یک وقت تین مفہوم پیدا کر رہے ہیں۔ ایک تو رعنائی و دلآویزی کے اعتبار سے لولاب کو وہ سارے کشمیر کی علامت کے طور پر پیش کر رہے ہیں جس طرح جاوید نامہ میں ایک جگہ وہ وُلر کو سارے کشمیر کی علامت کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ دوسرا چوں کہ وادیِ لولاب نے اکثر علما، اور بالخصوص مولانا سیّد نور شاہ صاحب مرحوم ایسی شخصیت کو جنم دیا ہے اس لیے اس سرزمین کے ساتھ ایک جذباتی ہم آہنگی پیدا کر کے اقبال اسے کشمیر کے تعلقات سے اپنی فکر کا موضوع بناتے ہیں اور لفظ 'ضیغم' کے استعمال سے وہ اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ اہلِ کشمیر کو جہاں علمی اعتبار سے علمائے لولاب بالخصوص مولانا سیّد انور شاہ کا تتبع کرنا چاہیے، وہاں ساتھ ہی ساتھ اپنے اندر انھیں شیر کی سی خاصیتیں بھی پیدا کرنا چاہئیں[1]۔

مقالے کے آخر میں اقبال کے ان خطوط کو شامل کیا گیا ہے جن میں اقبال نے کشمیر دوبارہ تشریف لانے کی خواہش ظاہر کی ہے۔ یہ خطوط مخدوم الملک سیّد غلام میراں شاہ کے نام لکھے گئے ہیں۔ جن میں کشمیر آنے کی خواہش اور اپنی مجبوری کا ذکر کیا گیا ہے۔ مجموعی اعتبار سے کتاب بہت مفید ہے۔ چند نئے گوشے واضح ہوئے ہیں، جو اب تک پردۂ سیمیں میں موہوم تھے۔

"اقبال مائنڈ اور آرٹ" اور "اقبال، ہز پوئٹری اینڈ فلاسفی" جگن ناتھ آزاد کے انگریزی مضامین کے مجموعے ہیں۔ پہلی کتاب کو ڈاکٹر محمد معروف نے مرتّب کیا ہے جب کہ دوسری کتاب کو میسور یونیورسٹی نے شائع کی ہے۔ "اقبال ہز پوئٹری اینڈ فلاسفی" میں تین خطبات ہیں۔ یہ خطبات اسی یونیورسٹی میں دیے گئے تھے۔ "اقبال مائنڈ اینڈ آرٹ" کا تعارف جو ڈاکٹر محمد معروف نے لکھا ہے، تقریباً تیس (۳۰) صفحات پر مشتمل

---

[1] استفادہ اقبال اور کشمیر سے۔

یہ تعارف کتاب کی گہرائی میں اُترنے کے لیے انتہائی مفید ہے۔ یہ کتاب چھ ابواب پر مشتمل ہے:

(۱) اقبالؔ کب پیدا ہوئے؟
(۲) اقبالؔ کی شاعری کا ہندی پس منظر
(۳) اقبالؔ شاعر اور سیاست داں
(۴) اقبالؔ: اس کی شاعری اور فلسفہ
(۵) اقبالؔ: شوپنہار اور قرآن
(۶) اقبالؔ: اسلام اور عہدِ جدید

دیباچے میں ڈاکٹر محمد معروف لکھتے ہیں:

"جگن ناتھ آزاد کے یہ سات مقالے، خطوط، تبصرے اور "لالۂ طور" کا پیش لفظ سب مل کر علامہ اقبالؔ کی زندگی، فن اور فکر پر صرف بھرپور روشنی ہی نہیں ڈالتے بلکہ بالکل ایک نئی روشنی ڈالتے ہیں۔ آزاد جو نہ پاکستانی ہیں اور نہ مسلمان لیکن جس نے اسلام کو اقبالؔ کی آنکھوں سے دیکھا ہے اور جس نے اسلام کے متعلق جو کچھ لکھا ہے وہ ہمارے لیے قابلِ اعتماد ہے کیوں کہ اس کی بنیاد لکھنے والے کا خلوص ہے"۔[1]

آزاد نے یہ مقالات ہندوستان اور پاکستان سے باہر کی یونیورسٹیوں اور علمی و ادبی اداروں کی دعوت پر مرتّب کیے ہیں۔ ان میں ماسکو یونیورسٹی، لینن گراڈ یونیورسٹی تاجکستان یونیورسٹی، ریگا یونیورسٹی، الیسٹ ویسٹ یونیورسٹی شکاگو، نارتھ ایسٹرن یونیورسٹی شکاگو (امریکہ) اور ٹورنٹو، رنگون، دوبئی، ابوظہبی، کاٹھمنڈو، لندن، واشنگٹن اور لاس اینجلس وغیرہ کے علمی و ادبی ادارے خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔

---

[1] ظفر معراج۔ "اقبال مائنڈ اینڈ آرٹ" (مشمولہ) "ارمغانِ آزاد" مرتبہ ڈاکٹر ظہور الدین، ص ۱۷۰۔

کتاب کے ابواب سے ہی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ یہ مضامین کس طرح کے ہوں گے۔ اقبال کی تاریخِ پیدائش میں اختلاف تھا۔ جگن ناتھ آزاد کا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے اپنے مقالے میں ۹ نومبر ۱۸۷۷ء اقبال کی تاریخِ پیدائش قرار دی جسے بعد میں حکومتِ پاکستان کی کمیٹی نے بھی منظوری دی۔ پہلے حصے میں انہی اختلافات کا ذکر ہے۔ آزاد نے اپنے دلائل و شواہد بیان کیے ہیں۔ دوسرے حصے میں اقبال کے کلام کا شعری پس منظر بیان کیا گیا ہے۔ یہ پس منظر خالص ہندوستانی ہے۔

کتاب کے تیسرے حصے میں جگن ناتھ آزاد کے تین خطوط ہیں جو اقبال پر بحث مباحثے کے سلسلے میں اسٹریٹ ویکلی آف انڈیا، بمبئی اور ہندوستان ٹائمز نئی دہلی میں شائع ہوئے تھے۔ چوتھے حصے میں جگن ناتھ آزاد کا "پیش لفظ" ہے۔ یہ پیش لفظ پنڈت آنند نرائن مُلّا کے انگریزی ترجمہ "لالۂ طور" کے لیے لکھا گیا تھا۔ آزاد کا یہ پیش لفظ دراصل صرف پنڈت آنند نرائن مُلّا کی کتاب کا پیش لفظ ہی نہیں بلکہ ترجمے کے فن پر ایک عالمانہ تحریر بھی ہے۔ اس میں آزاد نے اقبال کے ان ترجموں کا ایک تقابلی جائزہ بھی پیش کیا ہے۔

ساتواں مقالہ THUS SPAKE IQBAL کتاب کے دوسرے حصے میں ہے اور یہ دراصل جگن ناتھ آزاد کا انفرادی کارنامہ ہے۔ انتقال سے کچھ قبل علامہ اقبال THE BOOK OF FORGOTTEN PROPHET کے زیرِ عنوان انگریزی میں ایک نظم لکھنے کا ارادہ کر رہے تھے۔ اس نظم کے لیے اقبال مرحوم نطشے کی کتاب "بقول زرتشت" تو خاکے کے طور پر اپنے سامنے رکھنا چاہتے تھے۔ لیکن موت کے ہاتھوں نے انھیں اتنی مہلت نہ دی کہ اپنے اس کام کو شروع کر سکیں اس کتاب کے بارے میں مسعود خالد لکھتے ہیں:

> "فلسفہ، مذہب، سیاست اور شاعری یہ وہ چار موضوعات ہیں جن کے حوالے سے جگن ناتھ آزاد نے فکر و فن اقبال کا مطالعہ پیش کیا ہے۔ ان کی کتاب علامہ اقبال کی زندگی اور آرٹ کے

علاوہ فلسفے پر ایک نئے انداز سے روشنی ڈالتی ہے جیسا کہ توقع کی جاسکتی ہے۔ جگن ناتھ آزاد کے طرزِ فکر پر بھارتی چھاپ موجود ہے لیکن اس کا رنگ بہت ہلکا ہے۔ وہ متعصّب قوم پرست نہیں ہیں۔ ان کا نقطۂ نظر آفاقی ہے۔ اس لیے وہ بڑی حد تک غیر جانبدارانہ اور معروضی اسلوب میں اپنے موضوع کے مختلف پہلوؤں کا علمی مہارت کے ساتھ ساتھ احاطہ کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ ان کی تحریروں سے اس امر کی نشان دہی بھی ہوتی ہے کہ انھوں نے علّامہ اقبالؔ کے حوالے اسلام کو بھی سمجھا ہے بلا شبہ انھیں اسلامی تاریخ کا گہرا فہم حاصل ہے۔ کتاب میں اس علم کی نمائش نہیں کی گئی لیکن اسے محسوس ضرور کیا جاسکتا ہے۔"[1]

اقبال نمائش: جگن ناتھ آزاد کی مقبولیت اور ان کے اہم کارناموں میں "اقبال نمائش" کا انعقاد بھی بہت اہمیت رکھتا ہے۔ یہ نمائش ۲۷ر اکتوبر ۱۹۷۳ء میں منعقد ہوئی۔ اس کی تمام تر ذمہ داری آزاد پر ہی تھی اور اس نمائش کی کامیابی کا سہرا بھی آزاد ہی کے سر جاتا ہے۔ اس نمائش کا افتتاح اندر کمار گجرال سابق مرکزی وزیر اطلاعات و نشریات نے کیا تھا۔ سیّد میر قاسم سابق وزیر اعلا جموں و کشمیر نے صدارت کی۔ شیخ محمد عبداللہ مہمانِ خصوصی تھے۔ یہ نمائش ۲۷ر اکتوبر تا ۳ر نومبر ۱۹۷۳ء جاری رہی۔ ہر روز کوئی ایک ہزار لوگ اس نمائش کو دیکھنے آتے۔

نمائش کا انعقاد اور اس کی تفصیلات سب سے پہلے سہ ماہی "لمحے لمحے" بدایوں کے جگن ناتھ آزاد نمبر میں ۱۹۸۸ء میں شائع ہوئے۔ اس کے بعد یعنی کچھ عرصہ قبل خلیق انجم نے اس پوری رپورٹ کو "لمحے لمحے" (سہ ماہی) بدایوں سے اخذ کر کے مکمل طور پر شائع کی ہے۔

---

[1] مسعود خالد (لاہور) "اقبال مائنڈ اینڈ آرٹ" (مشمولہ) "جگن ناتھ آزاد۔ حیات اور ادبی خدمات" مرتبہ خلیق انجم، ص ۱۸۴۔

اس نمائش سے قبل بھی جگن ناتھ آزاد ۱۹۶۱ء میں "اردو نمائش" پریس انفارمیشن بیورو کے لیے مرتب کر چکے تھے۔ اقبال نمائش کے لیے آزاد نے بہت ہی کم دنوں میں اس کام کو انجام دیا۔ آزاد نے ملک کے مختلف حصے سے اقبال کے تصاویر جمع کیں اور بہت محنت و مشقت کے بعد "اقبال نمائش" کا انعقاد عمل میں آیا۔ بعض نادر تصاویر کو آزاد نے سید خلیل اللہ حسینی اور عابد علی خاں مرحوم کے توسط سے حاصل کیں۔ اسی طرح خدا بخش لائبریری پٹنہ سے بھی آزاد نے کچھ مواد و تصاویر حاصل کیے۔ اس نمائش کے انعقاد میں آل احمد سرور، مولانا امتیاز علی اور ان کے فرزند عرشی زادہ نے بھی آزاد کا ساتھ دیا۔ اسی طرح عبدالرشید کے نام علامہ اقبال کے مکتوب کا نگیٹو زاہد علی خاں موجودہ چیف اڈیٹر اردو روزنامہ "سیاست" نے پیش کیا۔

نمائش کے تقریباً تیس (۳۰) اکتیس (۳۱) گوشے تھے۔ یہ گوشے اسی طرح بنائے گئے مثلاً پہلا گوشہ "اقبال کی کہانی تصویروں کی زبانی"۔ اسی طرح دوسرا گوشہ "اقبال اور ان کا خاندان" وغیرہ اس نمائش کے بہت سے گوشے ایسے ہیں جو بہت ہی اہم اور نادر ہیں مثلاً اقبال کا شجرۂ نسب، اقبال کے اساتذہ کی فہرست اور اقبال کا مسجد قرطبہ میں نماز پڑھنا وغیرہ۔ ان مقامات کی بھی نشان دہی کی گئی ہے جہاں اقبال نے سکونت اختیار کی یا تعلیم حاصل کیا یا جہاں انھوں نے قیام کیا۔ اس طرح اقبال کے نادر خطوط، اقبال کی مرتب کی ہوئی درسی کتب، علامہ اقبال کی تصانیف، ان کی فہرست، اقبال نے جو انعامات و اعزازات حاصل کیے ان کی فہرست، امتحانات کے سرٹیفکٹس اور اقبال کے انگریزی خطوط وغیرہ جمع کیے گئے ہیں۔ ۲۷ واں گوشہ کلامِ اقبال کو مصوروں کی نظر میں دکھایا گیا ہے۔

علامہ اقبال کے اشعار کے خطاطی نمونے بھی پیش کیے گئے۔ اس نمائش کے ذریعے سے علامہ اقبال کے متعلق بہت سی معلومات ہو سکتی تھیں۔ اس نمائش کے سلسلے میں جگن ناتھ آزاد کی کامیابی کو کئی اہم شخصیتوں نے خراجِ عقیدت پیش کیا ہے ان میں سے چند اقتباسات یہاں پیش کیے جاتے ہیں۔ سابق صدر شعبۂ اردو کشمیر یونیورسٹی

ڈاکٹر شکیل الرحمن نے خطبۂ استقبالیہ تحریر فرمایا، خطبۂ استقبالیہ میں لکھتے ہیں :

"اس تاریخی نمائش کی تشکیل و ترتیب میں جگن ناتھ آزاد کے خونِ جگر کی پہچان ہر جگہ ہوگی۔ حقیقت یہ ہے کہ آزاد اس نمائش کے خالق ہیں۔ جگن ناتھ آزاد اردو کے ایک جانے پہچانے اور معروف شاعر ہیں اور اس حیثیت سے انھیں سب جانتے ہیں لیکن ان کی شخصیت کا یہ پہلو ابھی تک نگاہوں سے چھپا ہوا تھا۔ آزاد علامہ اقبالؔ کے عاشق ہیں۔ اس بڑے حکیم نکتہ داں پر انھوں نے بہت کام کیا ہے۔"[1]

سکریٹری کلچرل اکیڈمی سری نگر محمد یوسف ٹینگ نے اپنی تقریر میں کہا:

"نمائش میں اقبالؔ کی بھرپور، بالیدہ، بار آور اور بامراد زندگی کے دھڑکتے اور گنگناتے ہوئے لمحے ہماری نگاہوں کے سامنے حرکت کرنے لگتے ہیں اور اقبالؔ اپنے تاریخی، تہذیبی اور سماجی پس منظر کے سارے کیف و کم کے ساتھ ابھرتے ہیں۔ ہمارے ملک کے مایۂ ناز اقبال شناس جگن ناتھ آزاد اس نمائش کے خالق ہیں اور انھیں اقبالؔ اور کلامِ اقبالؔ سے جو شیفتگی ہے یہ نمائش اسی کا ایک خوب صورت اظہار ہے۔"[2]

ان اہم اقتباسات سے نمائش کی کامیابی اور آزاد کی مقبولیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اس نمائش کے انعقاد میں نامور شعرا و ادیبوں نے آزاد کا ساتھ دیا۔ ان کی اعانت کی۔ اسی طرح کئی عظیم شخصیتوں نے اس نمائش کو بہ نظرِ تحسین دیکھا اور سراہا ان

---

[1] ڈاکٹر شکیل الرحمن۔ استقبالیہ (مشمولہ) جگن ناتھ آزاد۔ حیات اور ادبی خدمات "مرتبہ خلیق انجم، ص ۱۵۲، ۱۵۳۔

[2] محمد یوسف ٹینگ۔ خطبۂ استقبالیہ (مشمولہ) جگن ناتھ آزاد۔ حیات اور ادبی خدمات" مرتبہ خلیق انجم، ص ۱۴۹۔

میں ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی، ڈاکٹر قمر رئیس، ڈاکٹر عبد الحق، اور ڈاکٹر فضل الحق کے نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ جناب مالک رام، عابد علی خاں، شہباز حسین، ڈاکٹر گیان چند جین، سیّد حامد، سیّد مظفر حسین برنی، قرۃ العین حیدر اور بیگم حامدہ حبیب اللہ وغیرہ نے بھی ایڈیٹنگ روم میں اس نمائش کو دیکھا اور گراں قدر مشورے دیے۔ آزاد نے اس نمائش کے تصاویر میں سے انتخاب کر کے ایک البم بنایا اور اس البم کو پبلی کیشنز ڈویژن حکومتِ ہند نے "مرقعِ اقبال" کے نام سے شائع کر دیا۔ "مرقعِ اقبال" میں نہایت ہی نفاست کے ساتھ اقبال کی مستند کہانی تصویروں کی زبانی بیان ہوئی ہے۔

"نذرِ اقبال" جگن ناتھ آزاد کا ایک مجموعۂ کلام تھا جس کا دیباچہ سر عبد القادر نے لکھا تھا۔ دیباچہ حمیدہ سلطان احمد کی مرتب کردہ کتاب "جگن ناتھ آزاد اور اس کی شاعری" میں موجود ہے۔ مجموعۂ کلام اور دیباچے کے بارے میں حمیدہ سلطان احمد لکھتی ہیں:

> "ذیل کے چند سطور ایک مختصر سے مجموعۂ کلام "نذرِ اقبال" کے تمہیدی الفاظ ہیں جو قبلہ شیخ سر عبد القادر (مرحوم) نے تحریر فرمائے تھے۔ یہ مجموعۂ کلام ۱۹۴۷ء کے ہنگاموں کے باعث شائع نہ ہو سکا۔ لیکن اس کی بعض نظمیں "بیکراں" میں شامل کر لی گئی ہیں۔"[۱]

اس دیباچے میں شیخ سر عبد القادر مرحوم مجموعۂ کلام کے بارے میں لکھتے ہیں:

> "اب جناب آزاد چند نظمیں لکھ کر شائع کر رہے ہیں جن کا موضوع خود اقبال اور کلامِ اقبال ہے۔ یہ گویا عقیدت کے چند پھول ہیں۔ جو انھوں نے اقبال پر نچھاور کیے ہیں۔ اس لحاظ سے اس مجموعہ کو اقبال کی نذر کیا گیا ہے۔ جو بے ساختہ تعریفیں ان

---

[۱] حمیدہ سلطان احمد۔ "نذرِ اقبال" (مشمولہ) "جگن ناتھ آزاد اور اس کی شاعری" مرتبہ حمیدہ سلطان احمد، ص ۱۹۲۔

اشعار میں آزاد کے قلم سے نکلی ہیں ان میں ان کا دلی جذبہ محبت
نظر آرہا ہے اور ان میں یہ خوبی ہے کہ مبالغہ سے کام نہیں لیا گیا
ہے، محض اظہارِ عقیدت ہے ..... اس مجموعے میں چند تضمین بھی
ہیں جن میں آزاد نے اپنے معنوی استاد کے مصرعوں پر مصرعے
لگائے ہیں۔" [۱]

فکرِ اقبال کے بعض اہم پہلو : جگن ناتھ آزاد کی مرتّب کردہ یہ کتاب پہلی بار ۱۹۸۲ء میں شاہین بک اسٹال اینڈ پبلیشرز بڈشاہ چوک سری نگر کشمیر کی طرف سے شائع ہوئی۔ اس کتاب میں کُل ۲۱۲ صفحات ہیں۔ ۲۴ مقالے ہیں۔ تین مقالے اقبال کی "خودی" پر ہیں، دو "مسجد قرطبہ" پر اور دوسرے تمام مقالے اقبال کے افکار کے مختلف پہلوؤں سے متعلق ہیں۔

کتاب کی ابتدا میں ایک دیباچہ اور پانچ مضامین ہیں جو اقبال صدی تقاریب یا اقبال بین الاقوامی کانگریس کے متعلق ہیں۔ اس کتاب کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس کے تمام مقالات پاکستانی اہلِ قلم حضرات کے لکھے ہوئے ہیں ہندوستانی مصنفین میں خود مرتّب (جگن ناتھ آزاد) جن کا دیباچہ اور ایک ریڈیائی تقریر اور ایک انٹرویو کتاب میں شامل ہے۔

جگن ناتھ آزاد کے علاوہ اقبال عالمی کانگریس میں آل احمد سرور، علی سردار جعفری اور صباح الدین عبدالرحمٰن نے شرکت کی تھی۔ اس کتاب میں علی سردار جعفری کا مضمون "ہندوستان میں صد سالہ جشن ولادت کی روداد" ہے، دوسرا مضمون علی سردار جعفری کے تاثرات ہیں جسے احسن علی مرزا نے مضمون کی شکل میں پیش کیا ہے۔ یہ دراصل ایک انٹرویو ہے۔ پاکستان سے واپس ہونے کے بعد علی سردار جعفری کو حیدرآباد نظام

---

[۱] (سر) عبدالقادر۔ "نذرِ اقبال" (مشمولہ) "جگن ناتھ آزاد اور اس کی شاعری" حمیدہ سلطان احمد، ص ۱۹۳، ۱۹۴۔

کلب کے گیسٹ ہاؤس میں ٹھہرنے کا اتفاق ہوا۔ اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے احسن علی مرزا نے چند سوالات کیے جو زیادہ تر پاکستان، اقبال اور اقبال عالمی کانگریس کی روداد سے متعلّق تھے۔

تیسرے ہندوستانی مقالہ نگار سیّد صباح الدین عبدالرحمٰن ہیں جنھوں نے اقبال عالمی کانگریس میں شرکت کی۔ آزاد ان کی شرکت کے متعلق لکھتے ہیں:

"سیّد صباح الدین عبدالرحمٰن کی حیثیت لاہور، سیالکوٹ اور کراچی میں ایک فرد کی نہیں، ایک ادارے کی ہے۔ "معارف" کا مدیر، دارالمصنفین اعظم گڑھ کا نمائندہ، سیّد سلیمان ندوی مرحوم کی یادگار اور اقبالیات پر گہری نظر رکھنے والا عالم، پاکستان میں سیّد صاحب کی موجودگی ایک نعمت غیر مترقبہ کی حیثیت رکھتی ہے۔"[۱]

سیّد صباح الدین عبدالرحمٰن کا مضمون کیا ہے، ایک مکمل روئیداد ہے جو سفر کے متعلق بھی ہے اور کانگریس کے متعلّق بھی۔ ان کا مضمون خاصا طویل اور ضخیم ہے۔ انھوں نے معمولی معمولی باتوں کو بھی خاصی تفصیل سے پیش کیا ہے۔ راستے کے حالات، دوست احباب سے ملاقات، مقالے کا پہلا حصّہ سفرنامہ ہے۔ ہر صفحہ پُر مغز معلومات پر مبنی ہے۔ درمیانِ گفتگو وہ کئی اہلِ قلم حضرات کے بارے میں مختصراً مگر جامع انداز میں تعارف کراتے ہوئے گزر جاتے ہیں۔ دوسرے حصّے میں عالمی کانگریس کا ذکر کیا گیا ہے۔

اس عالمی کانگریس میں جگن ناتھ آزاد نے سیالکوٹ میں قلعے سے علّامہ اقبال کے مکان تک ایسے جلوس کی رہنمائی کی جس میں ایک سو اَسّی (۱۸۰) مندوبین دنیا کے مختلف حصّوں سے تشریف لائے تھے۔ ان میں ایک سے بڑھ کر ایک ماہرِ اقبالیات موجود تھے۔ ان سب میں اس اعزاز کا حاصل ہونا واقعی فخر اور عزت کی بات ہے۔ کتاب میں مندرجہ ذیل مقالے ہیں:

---

۱ جگن ناتھ آزاد۔ فکرِ اقبال کے بعض اہم پہلو، ص ۴۲۔

(۱)	فکرِ اقبال کے بنیادی عناصر	جسٹس قدیر الدین احمد
(۲)	اقبال اور نسخۂ کیمیا	پروفیسر کفیل احمد فائزادہ
(۳)	اقبال کی اجتہادی کاوشں	محمود رضوی
(۴)	اقبال اور عشقِ حسین	شاہد انیس خاں

اس کے بعد ایک مقالہ علّامہ اقبالؔ کی کتب سے متعلق ہے۔ مقالہ نگار ہیں بشیر حسین ناظم۔ اس مقالے کے بارے میں جگن ناتھ آزاد لکھتے ہیں:

"میری گزارش ہے کہ فکرِ اقبالؔ کے مختلف پہلوؤں کو صحیح طور پر سمجھنے اور ان پر بحث کرنے کے لیے ضروری ہے کہ علّامہ مرحوم کی کتب کے صحیح متن ہمارے سامنے ہوں۔ اگر کتاب اغلاط سے پُر ہے تو اس غلط سلط متن کی موجودگی میں اقبالؔ کے افکار پر بحث و تحیص کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس صورت میں تو کتاب ہمیں کعبے کے عوض ترکستان کی طرف لے جائے گی۔ اس نکتے کی اہمیت کے پیشِ نظر بشیر حسین ناظم کا یہ مقالہ شاملِ کتاب کیا جا رہا ہے۔" [۱]

دیگر مقالے یہ ہیں:

علّامہ اقبالؔ کے کلام میں نظریۂ تعلیم	محمد حنیف اعوان
اقبالؔ کا سیاسی فلسفہ	پروفیسر محمد مظہر الدین صدیقی
جاوید نامہ کے معارف و بصائر	عبد اللطیف سیٹھی
تصوّرِ ریاست اقبالؔ کی نظر میں	رحیم بخش شاہین
اقبالؔ حرکت و عمل کا پیامبر	محمد نواز خاں سیّال
اقبالؔ اور جمہوریت	عثمان علی خاں

---

[۱] جگن ناتھ آزاد۔ فکرِ اقبال کے بعض اہم پہلو، ص ۱۶۔

اقبال کا تصوّرِ عشق	عبد الغفار نظمی
علامہ اقبال کا نظریۂ قانون	غبار یاور
فکرِ اقبال کی روشنی میں	حسین کاظمی
اقبال اور عقلیت پسندی	حکیم محمود رضوی
اقبال کا فلسفۂ خودی	سردار محمد حیات خاں
علّامہ اقبال اور خودی	سیّد قدرت نقوی
اقبال کا نظریۂ خودی	پروفیسر بشیر قریشی
مسجد قرطبہ	میاں عبد الرشید
اقبال کی ایک نظم	ریاض صدیقی
امیر خسرو اور اقبال کی ہم زمین غزلیں	مرزا محمد سوز
اقبال کا فلسفۂ دید و نظر	نصیر احمد ناصر
نقد اقبال کا تجزیاتی مطالعہ	سلیم اختر
مسجد قرطبہ	پروفیسر رفیع الدین ہاشمی

ان مقالات کے عنوانات سے ہی کتاب کی اہمیت و افادیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے گو کہ بعض موضوع پر کئی مقالے لکھے گئے ہیں مگر ہر مقالے میں انفرادیت موجود ہے۔ پروفیسر رفیع الدین ہاشمی نے مسجد قرطبہ کا بہت ہی اچھے انداز میں تجزیاتی مطالعہ کیا ہے۔

ڈاکٹر تہمینہ اختر کے مطابق اس کتاب کا پہلا حصّہ جو چھ مقالات پر مشتمل ہے۔ ایک طرح سے تمہید یا ابتدائیہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ چھ مقالات اپنے اندر ایک جہان معنی لیے ہوئے ہیں اور ان کی بدولت اقبالیات کے بعض ایسے پہلو اور مباحث ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو گئے ہیں جو اس کتاب کے علاوہ شاید اور کہیں نظر نہ آئیں[1]

یہ کتاب علمی مباحث سے بھرپور ہے۔ یہ کتاب جہاں اردو کے ایک عام قاری کے

---

[1] ڈاکٹر تہمینہ اختر۔ فکر اقبال کے بعض اہم پہلو، (مشمولہ) ارمغانِ آزاد، مرتبہ ڈاکٹر ظہور الدین، ص ۱۷۶-۱۷۸۔

لیے دل چسپی کا باعث ہے وہیں فکرِ اقبال کے مطالعے سے دلچسپی رکھنے والے اسکالرس، اساتذہ کے لیے بھی اہم اور مفید ہے۔

اقبالیات کے سلسلے میں آزاد کی مندرجہ ذیل کتابیں سوانح نگاری کے زمرے میں آتی ہیں:

(۱) اقبال کی کہانی
(۲) اقبال زندگی، شخصیت اور شاعری
(۳) اقبال ایک ادبی سوانح حیات
(۴) رودادِ اقبال (زیرِ طبع)

سوانح عمری کے ضمن میں ان کتابوں کا تفصیلی جائزہ لیا جا چکا ہے۔ یہاں سرسری طور پر ان کا اس زاویۂ نظر سے مطالعہ کیا گیا ہے کہ جگن ناتھ آزاد کی ان مساعی پر روشنی ڈالی جائے جو اقبالیات سے متعلق ہیں۔

اقبال سے جگن ناتھ آزاد کو نہ صرف دلی لگاؤ ہے بلکہ عشق ہے ایسا عشق جس میں عقیدت و احترام کو ہمیشہ ملحوظ رکھا گیا ہے۔ "اقبال کی کہانی" نو سے چودہ سال تک کے طلبہ و طالبات کے لیے، جب کہ دوسری کتاب "اقبال زندگی، شخصیت اور شاعری" چودہ سے اٹھارہ سال تک کی عمر کے طلبہ و طالبات کے لیے لکھی گئی ہیں۔ دونوں کتابیں بچوں کی عمر کے پیش نظر آسان زبان میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

اس سلسلے میں ان کی تیسری کتاب "اقبال ایک ادبی سوانح حیات" ہے جن کے بارے میں آزاد لکھتے ہیں:

"مذکورہ کتابیں لکھنے کے بعد مجھے خیال آیا کہ اقبال کی ایک مختصر سی سوانح حیات مجھے اس قاری کے لیے بھی لکھنا چاہیے جو اٹھارہ سال کی عمر سے آگے نکل چکا ہے یعنی ایک عام قاری کے لیے۔ چنانچہ زیرِ نظر کتاب میں نے اپنی اس خواہش کے پیش نظر لکھی ہے۔"[1]

---

[1] جگن ناتھ آزاد۔ محمد اقبال ایک ادبی سوانح حیات، ص ۱۳۔

آزاد نے مذکورہ تینوں کتابوں میں اقبال کی پیدائش، ان کے عادات و اطوار، تعلیم و تربیت اور ان کی شاعری کا سرسری ذکر کیا ہے۔ البتہ ان کی تیسری کتاب میں سوانح حیات کسی قدر مفصّل ہے۔ اس کتاب کے پانچ حصّے ہیں۔ پہلے حصّے میں بچپن، تعلیم و تربیت، خاندان اور لڑکپن وغیرہ کا ذکر ہے۔ دوسرے حصّے میں جوانی، لاہور کی زندگی، شاعری کی ابتدا اور مختصراً کالج کی تعلیم کا ذکر ہے۔ تیسرے حصّے ہیں یوروپ کی زندگی، انگلستان اور جرمنی کے واقعات بھی بیان کیے گئے ہیں۔ چوتھے حصّے میں انگلستان سے واپسی کا ذکر ہے۔ یہ حصّہ اقبال کی زندگی کے بیس سالہ دور پر محیط ہے۔ دوسری اور تیسری شادی کا ذکر، پھر ملازمت کا بیان ہے۔ ۱۹۱۴ء سے ۱۹۳۰ء تک کی شاعری پر تبصرہ کیا گیا ہے۔ پانچویں حصّے میں اقبال کی زندگی کے آخری آٹھ برس کا ذکر قلمبند کیا گیا ہے۔ علامہ اقبال کا سیاست سے دلچسپی لینا، سفرِ افغانستان کے لیے علالت اور ان کے انتقال کے ساتھ یہ کتاب اختتام کو پہنچی۔

آزاد نے آسان زبان میں اقبال کی شخصیت اور شاعری کو مختصراً لیکن جامع انداز میں بیان کیا ہے۔ جس سے عام قاری بلا کسی تردّد و پریشانی کے استفادہ کر سکتا ہے۔ اقبالیات کے سلسلے میں جگن ناتھ آزاد کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے اقبال کی تاریخ پیدائش کے اختلافات کی گتھی کو سلجھایا۔ کسی نے علامہ اقبال کی تاریخ پیدائش ۲۲ فروری ۱۸۷۳ء بتایا جب کہ عبدالسلام ندوی اور محمد طاہر فاروقی نے ۱۸۷۶ء کو تاریخِ پیدائش تحریر فرمایا ہے۔ مولوی احمد دین اور رام بابو سکسینہ نے ۱۸۷۵ء لکھا۔ اس امر میں محققین میں بہت زیادہ اختلافات پائے جاتے ہیں۔ پاکستان میں سابق وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو (مرحوم) نے اس سلسلے میں ایک کمیٹی تشکیل دی تھی۔ "ہندوستان ٹائمز" نئی دہلی نے ۱۸ فروری ۱۹۷۳ء کو آزاد کا ایک مقالہ شائع کیا جس میں آزاد نے اپنی تحقیق اور دلائل کے ذریعے علامہ کی تاریخِ پیدائش ۹ نومبر ۱۸۷۷ء قرار دیا اور یہی صحیح تاریخِ پیدائش مانی گئی۔ پاکستان میں جو کمیٹی تشکیل دی گئی تھی، اُس نے اپنی رپورٹ میں ۴ فروری ۱۹۷۴ء کو پیش کی۔ کمیٹی کی

رپورٹ کے مطابق صحیح تاریخِ پیدائش ۹ر نومبر ۱۸۷۷ء ہی تھی۔ چنانچہ اسی تاریخ کو دنیا بھر میں صحیح تسلیم کر لیا گیا اور جہاں جہاں اقبال صدی تقاریب کی تیاریاں چل رہی تھیں وہاں ۹ر نومبر ۱۹۷۷ء کو ہی تسلیم کر کے یہ تقاریب منائی گئیں۔ ہندوستان میں بھی ۹ر نومبر ۱۹۷۷ء کو اقبال صدی تقاریب منائی گئیں۔

ان تینوں کتابوں کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ ان کی زبان عام فہم ہے۔ سیدھے سادے الفاظ میں، بلا کسی بناوٹ اور تکلف کے اپنی بات کو قاری تک پہنچانا یہ آزادؔ کی کا کرشمہ ہے۔ ڈاکٹر مظفر حنفی اس کتاب کے بارے میں لکھتے ہیں:

"بہ حیثیت مجموعی یہ کتاب ایک اوسط تعلیم یافتہ قاری کے لیے اقبالؔ کے بارے میں زیادہ سے زیادہ دلچسپ اور ایسی معلومات فراہم کرتی ہے جس سے لاعلم رہ کر اقبالؔ کی شاعری اور ان کے پیغام کو سمجھنا ناممکن نہیں تو دشوار ضرور ہے۔"[۱]

اس کتاب کی اہمیت اور افادیت کے متعلق ڈاکٹر راج بہادر گوڑ لکھتے ہیں:

"اس کتاب میں جگن ناتھ آزادؔ نے اقبالؔ کی زندگی کے بعض ایسے گوشوں پر سے پردہ اٹھایا ہے جو اقبالؔ کے عام اور اوسط طالب علم کے علم میں نہیں تھے اور یہ کچھ ایسے عوامل ہیں جو اقبالؔ کی انسان، مفکر اور شاعر کی حیثیت سے تشکیل و تعمیر پر اثر انداز ہوتے ہیں۔"[۲]

"نشانِ منزل" کے مقالات میں دو[۲] مقالے ایسے ہیں جو اقبالیات کے زمرے میں آتے ہیں۔ پہلا "حسرت موہانی اور اقبال"، "اقبال صرف مسلمانوں کے شاعر؟" ان دونوں مقالوں کے ذریعے سے آزادؔ نے اقبالیات کے بعض ان مخفی گوشوں کی نقاب کشائی کی ہے جن سے اب تک عام اردو داں طبقہ ناواقف تھا۔ آزادؔ کے یہ دو[۲] مقالے

۱۔ ہفتہ وار "ہماری زبان"، نئی دہلی، مورخہ ۱۵ر مارچ ۱۹۸۴ء۔

۲۔ ڈاکٹر راج بہادر گوڑ۔ "محمد اقبال ایک ادبی سوانح حیات" (مشمولہ) ماہنامہ "العطش" جگن ناتھ آزاد نمبر ۱۹۸۶ء، ص ۶۹۔

تحقیقی و تنقیدی حیثیت رکھتے ہیں۔

آزاد نے "حسرت اور اقبال" کے مقالے میں جن باتوں کی نشان دہی کی ہے ان میں دونوں کا سیاسی مسلک، تصورِ تصوّف اور اشتراکیت پر علمی بحث موجود ہے۔

اقبال تصوّف کے خلاف کبھی نہیں تھے۔ مگر تصوّف کے پردے میں رہبانیت اور خانقاہیت کو انھوں نے غیر اسلامی قرار دیا۔ حسرت کے یہاں جو تصوّف کا تصوّر ہے وہ روایتی انداز کا ہے۔ حالاں کہ حسرت اور اقبال دونوں ہم عصر شاعر ہیں۔ اقبال اور حسرت دونوں کے یہاں عشق ایک متحرک اور فعّال کیفیت میں موجود ہے۔ آزاد نے حسرت اور اقبال کے تصوّف و عشق میں واضح لکیر کھینچی ہے۔ ۱۹۱۷ء کے انقلاب کا ذکر کرتے ہوئے آزاد لکھتے ہیں:

> "بہ حیثیت مجموعی اشتراکیت کے متعلق اقبال کی لَے خاصی مدھم رہی۔ حسرت کے یہاں یہ لَے بہت بلند تھی۔ شاید اس کا سبب یہ ہو کہ اقبال ادب اور زندگی دونوں میں توازن کے قائل تھے۔ حسرت غزل میں توازن کے قائل تھے۔ لیکن وہ زندگی میں اہنسا پسند تھے۔ اکسٹریمسٹ تھے۔ انھوں نے گوکھلے کو نہیں بلکہ تلک کو اپنا رہنما بنایا۔ گاندھی سے ایک بار نہیں بلکہ کئی بار ٹکر لی۔" ؎۱

آزاد کے مطابق اقبال مسلم سوشلسٹ تھے ہی نہیں۔ انھوں نے اشتراکیت کو محض اس لیے پسند کیا کہ اسلام میں بھی مساوات کا حکم ہے۔ آزاد لکھتے ہیں:

> "اقبال کا سیاسی شعور حسرت کے مقابلے میں بہت گہرا تھا۔ انھوں نے غلبہ آئین سوویت یونین کی بات کبھی نہیں کی۔ انھوں نے مطالعے کے ذریعے سے سوشلزم اور کمیونزم کو دیکھا تھا اور اس کی خوبیوں اور خامیوں پر نظر ڈالی تھی۔ اس کے خلاف حسرت کا لگاؤ کمیونزم کے ساتھ جذباتی نوعیت کا تھا۔" ؎۲

؎۱ جگن ناتھ آزاد۔ نشانِ منزل، ص ۱۹۔ ؎۲ ایضاً، ص ۲۲۔

دوسرے مضمون کا عنوان ہے "اقبال صرف مسلمانوں کے شاعر؟"۔ دو بنیادی سوالوں کے درمیان اس موضوع کو زیرِ بحث لایا گیا ہے۔ پہلا اقبال کا بنیادی سرچشمۂ افکار کیا ہے؟ دوسرا اقبال کے مخاطب کون ہیں؟ جہاں تک پہلے سوال کا تعلق ہے اس میں کوئی اختلافِ رائے نہیں ہے کہ اقبال کا بنیادی سرچشمۂ افکار قرآن اور حدیث ہی ہیں۔ مگر ایسا بھی نہیں ہے کہ انھوں نے دوسرے علوم و فنون کی طرف توجہ نہ کی ہو۔ ان کی شخصیت کی تعمیر و تشکیل میں اسلامی فکر کے علاوہ قدیم ہندوستانی فلسفہ، مغربی فلسفہ اور جدید مادیاتی نظامِ فکر بھی شامل ہے۔ ایک جماعت کا خیال ہے کہ اقبال نے قدم قدم پر مختلف فلسفیانہ نظریات کی تردید کی ہے جب کہ دوسری جماعت ان حضرات پر مشتمل ہے جن کے نزدیک علامہ اقبال کے افکار مغربی مفکرین کے افکار کے پرتو نہیں۔ آزاد نے درمیانی راستہ اختیار کیا ہے۔ آزاد ڈاکٹر تاثیر مرحوم کے انگریزی اقتباسات اور اقبال کے اشعار کے ذریعے سے یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ اقبال ساری دنیا کے شاعر ہیں۔ وہ مسلمانوں کے شاعر بھی ہیں۔ ایشیا کی بیداری کے شاعر بھی ہیں اور عالم انسانیت کے شاعر بھی ہیں۔ ان کی شاعری کو محدود نہیں کیا جاسکتا۔ آزاد لکھتے ہیں :

> "اس حقیقت کو کہ اقبال کا سرچشمۂ افکار بنیادی طور پر قرآن اور حدیث ہیں۔ اس طرح پیش کرنا کہ اقبال ہندو اور مسلمان کے تنگ دائروں سے باہر نہ نکل سکیں۔ کلامِ اقبال اور فکرِ اقبال کے انتہائی بے احتیاط اور غیر ذمہ دارانہ مطالعے کا نتیجہ ہے۔ اقبال کو اس طرح محدود کر دینے سے اقبال اور اسلام دونوں کے ساتھ انصاف نہیں ہو سکے گا۔"[1]

آزاد نے بڑے ہی علمی اور تحقیقی انداز میں اقبال کے افکار کو پیش کیا ہے۔ دوسرے سوال کے بارے میں بھی آزاد یہی بات دہراتے ہیں۔ کلامِ اقبال کے اوّلین مخاطب

---

[1] آزاد۔ نشانِ منزل، ص ۱۸۱۔

مسلمان ہی ہیں لیکن بسا اوقات اسی مخاطب میں انھوں نے ساری انسانیت کی بات کہی ہے۔ اس سلسلے میں آزاد بہت سے اشعار مثال کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ خاص طور پر "حضور ملت" حضور عالم انسانی اور جاوید نامے کے بہت سے اشعار میں ان باتوں کی نشاندہی موجود ہے۔ اقبال کے افکار کے مخاطب کون ہیں۔ اس سلسلے میں آزاد مثال دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

"سورج اگر مشرق سے طلوع ہوتا ہے اور مشرق سے اس کی مناسبت ازلی اور ابدی ہے لیکن اس کے باوجود خورشید کی روشنی صرف مشرق تک محدود نہیں ہے۔ وہ اپنے انداز سے مشرق، مغرب، شمال، جنوب، افلاک زمین ہر ایک کو منور کرتا ہے اور اس مثال کی روشنی میں اس سوال کا جواب کہ اقبال مسلمانوں کے شاعر ہی ہیں؟ میرے نزدیک یہ ہے کہ اقبال مسلمانوں کے شاعر بھی ہیں۔ ہندوستان بلکہ ہندوستان کی بیداری کے شاعر بھی ہیں۔ ایشیا کی بیداری کے شاعر بھی ہیں اور عالم انسانیت کی بیداری کے شاعر بھی ہیں۔"[1]

آزاد کے مضامین سے اقبالیات کو الگ کرنا انتہائی مشکل کام ہے۔ آزاد کہیں بھی کسی مقام پر اقبال کا ذکر چھیڑ دیتے ہیں۔ انھوں نے ناسازگار زمانے میں اقبال کی حمایت کی ہے۔ "نشانِ منزل" میں دو ریڈیائی نشریات بھی ہیں جن میں اقبال کا تقابلی مطالعہ غالب سے کیا گیا ہے۔ اور ایک مضمون میں عالمی کانگریس کا ذکر کیا گیا ہے۔ غالب، اقبال کے پیش رو تھے مگر دونوں میں خاصی مماثلت موجود ہے۔ غالب نے ۱۸۵۷ء کا دور دیکھا۔ یعنی اگر غالب نے ہندوستان کے زوال کی ابتدا دیکھی تو اقبال اس کی انتہا سے واقف ہوئے۔ اردو شاعری میں تعلّی کا رواج ہے مگر غالب اور اقبال نے تعلّی کی آن کو کچھ الگ طریقے سے برقرار رکھا۔ غالب اور اقبال دونوں کے

---

[1] آزاد۔ نشانِ منزل، ص ۱۸۹۔

یہاں یہ تعلّی نسبی نہیں ہے۔ غالبؔ کے یہاں جو اظہار تفاخر ہے وہ نسبی تفاخر ہے۔ اقبالؔ کے یہاں یہ بات نہیں پائی جاتی۔ اقبالؔ کے یہاں دوسرا نقطۂ نظر ہے یعنی اسلامی اخوت کا نظریہ۔

اسی طرح غالبؔ نے اپنی فارسی دانی پر ناز کیا ہے مگر اقبالؔ نے کبھی فخر کو روا نہیں رکھا۔ غالبؔ اور اقبالؔ کے کلام میں مشابہت بھی ہیں اور نمایاں فرق بھی۔ ان دونوں کی شاعری نے قاری کو استغنا اور خودداری جیسی لذّتوں سے آشنا کیا۔ غالبؔ اور اقبالؔ دونوں فلسفی شاعر ہیں۔ اقبالؔ کے یہاں مربوط نظامِ فکر ہے۔ غالبؔ نے فلسفیانہ اندازِ بیان اختیار کیا مگر ان کا کلام کوئی نظامِ فکر پیش نہیں کرتا۔ جہاں تک صوفیانہ اشعار کا تعلق ہے، آزادؔ لکھتے ہیں:

> "دونوں عملی اعتبار سے تصوّف کی گلی کوچوں سے ناآشنا تھے۔ اور ان کی صوفیانہ شاعری محض ان کی فکر اور ذہانت ہی کا ایک کرشمہ ہے اس لیے ان کے صوفیانہ کلام میں خواجہ میر دردؔ اور بیدلؔ کی بات تلاش کرنا لاحاصل ہے"۔[1]

غالبؔ اور اقبالؔ دونوں کے یہاں وطن سے محبّت کرنے کا جذبہ موجود ہے۔
"اقبال اور عالمی کانگریس" اس موضوع پر آزادؔ کے کئی اور مقالے ہیں۔ "فکرِ اقبالؔ کے بعض اہم پہلو" میں بھی آزادؔ کا ایک مضمون اور تعارف شامل کیا گیا ہے۔ "اقبالؔ اور عالمی کانگریس میں آزادؔ پاکستان مدعو کیے گیے۔ وہاں کمیٹیاں تشکیل دی گئی تھیں۔ پاکستان سمیت دنیا کے تیس[30] ملکوں سے ایک سو اسّی کے قریب مندوبین نے شرکت کی۔ ان سب کی قیادت کا شرف (لاہور قلعے سے اقبالؔ کے کلام تک) حاصل ہوا۔ جشنِ اقبالؔ کے متعلّق آزادؔ لکھتے ہیں:

> "یہ جشنِ اقبالؔ، علمی اور ادبی اہمیت کے علاوہ ایک اور اہمیت کا حامل بھی تھا اور وہ یہ کہ اس نے ہندوستان اور پاکستان

---

[1] آزادؔ۔ نشانِ منزل، ص ۳۴-۲۳۳۔

کے ادیبوں کو اتنی مدت کے بعد ایک دوسرے سے ملنے کا موقع فراہم کیا۔"[1]

جگن ناتھ آزاد آج کل "روداد اقبال" کے نام سے اقبال کے حالاتِ زندگی لکھ رہے ہیں جس کی تین جلدیں اب تک تیار ہو چکی ہیں۔ یہ سوانح حیات جب مکمل ہو جائے گی تو یقیناً آزاد کا یہ ایک وقیع اور منفرد کارنامہ ہوگا۔ اقبالیات میں قابلِ قدر اضافہ بھی ہوگا۔ جناب مالک رام اس سلسلے میں لکھتے ہیں:

"انھوں نے مختلف پہلوؤں سے اقبال کی سوانح عمری لکھی۔ مضامین اور کتابیں شائع کیں۔ اقبال کی زندگی اور کلام کے غیر واضح گوشوں کو روشن کرنے کے لیے اندرون و بیرونِ ملک کی مختلف یونیورسٹیوں اور اداروں میں اقبال پر لکچر دیے۔ غرض کہ اقبال کے پیغام اور فکر و فن پر تقریروں اور مقالوں کے ذریعے مشرق کے اس مایۂ ناز مفکر کو متعارف کرانے اور مقبول بنانے میں انھوں نے جو جہاد کیا ہے اس کا ذکر تحصیل حاصل سے زیادہ نہیں۔ بلا مبالغہ آج ملک بھر میں اقبالیات کے موضوع پر ان کا کوئی حریف نہیں ہے۔"[2]

"روداد اقبال" کے بعض حصے شائع ہوئے جن سے اس کتاب کی اہمیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ آزاد نے اقبال کے ان نادر اور متروک اشعار کا ذکر کیا ہے جو اب نایاب ہیں جن سے اقبال کی شخصیت کے مزید گوشے روشن ہوتے ہیں۔ خاص طور پر آزاد نے ان نظریات کی نشان دہی کی ہے جن سے اقبال کے کلام (متروک کلام میں زیادہ) میں ہندوستانی عناصر کی موجودگی ظاہر ہو۔ چنانچہ اس مضمون میں ایک مقام پر آزاد لکھتے ہیں:

---

[1] آزاد۔ نشانِ منزل، ص ۲۴۰۔

[2] جناب مالک رام۔ "آزاد مشاہیر کی نظر میں" (مشمولہ) کتاب نما کا خصوصی شمارہ، اپریل ۱۹۹۳ء۔ ص ۹۱-۹۰۔

"اس زمانے کی ایک بہت ہی اہم نظم "ابر گہر بار" ہے جس کا دوسرا نام ہے "فریادِ امّت"۔ جیسا کہ اس نظم کا ذکر کرتے ہوئے پہلے ہی کہا جا چکا ہے، ہے۔ اس کا صرف ایک ہی بند "دل" کے عنوان سے "بانگِ درا" میں شامل ہے اور وہ بھی نامکمل صورت میں۔ کچھ مدت کے بعد آپ نے وید بھگوان کے مشہور منتر "گائتری" کا "آفتاب" کے عنوان سے اردو نظم میں ترجمہ کیا۔ یہ نظم (آفتاب) "بانگ درا" میں موجود ہے لیکن اس کی نثر کی تمہید میں اقبال نے جو کچھ ۱۹۰۲ء میں لکھا تھا وہ اب نظم کے ساتھ شامل نہیں ہے"۔ [1]

آزاد کے مقالے اور مضامین کی تعداد بہت زیادہ ہے ان میں بیشتر مضامین کتابوں میں شامل کر لیے گئے ہیں۔ بعض ترمیم و اضافے کے ساتھ کئی موقعوں پر شائع ہو چکے ہیں۔ آزاد نے بعض مقالے انگریزی میں لکھے۔ جو ان کی دو کتابوں میں شامل ہیں IQBAL AND THE TRUTH انگریزی مقالہ ہے۔ اقبال اور انسان سے متعلق ان کے مقالے اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں ہیں۔ "کلامِ اقبال کا لسانی پہلو" اقبال اور پریم چند، اقبال کا فلسفہ اور شاعری، اقبال اور اردو زبان، اقبال اور فنونِ لطیفہ، اقبال اور فکر و فن کا امتزاج، اقبال کے محاسن، اقبال کی معنویت، ترمیمات اقبال، عالمی ادب اور اقبال، اقبال کا نظامِ فن، اقبال فکر و فن اور اقبال کا فلسفۂ تعلیم وغیرہ بہت اہم مضامین ہیں۔ اقبال اور غالب اور اقبال اور حسرت کا ذکر پہلے ہی کیا جا چکا ہے۔ اقبال کی فارسی شاعری اور اقبال کی غزل کا ابتدائی دور کے موضوع پر بھی آزاد کے مقالے موجود ہیں۔ اردو اکیڈمی دہلی کی دعوت پر آزاد نے اقبال کی غزل کا ابتدائی دور مقالہ تحریر کیا۔ اقبال نے غزل کب کہنا شروع کیا۔ ان کی غزلوں

---

[1] آزاد۔ روداد اقبال کا ایک غیر مطبوعہ باب۔ توازن مالیگاؤں سہ ماہی سلسلہ ۶ ص ۲۶۔

پر کون سے شاعروں کی چھاپ یا اثر موجود ہے۔ ایک مقام پر آزاد لکھتے ہیں :

"یہ بات یقینی ہے کہ لاہور آنے سے دو برس قبل یعنی ۱۸۹۳ء میں ان کا کلام رسائل میں چھپنا شروع ہو گیا تھا اور اس وقت وہ نظمیں بھی کہہ رہے تھے اور غزلیں بھی، نظمیں تو انھوں نے اس لیے کہیں کہ ان کا رجحان طبع نظم کی جانب تھا اور غزلیں اس لیے کہ اس وقت فضا پر داغ اور امیر کی شاعری چھائی ہوئی تھی۔ اقبال نے داغ کا تلمذ اختیار کیا اور انہی کے انداز میں غزل کہنے کی کوشش کی"۔ [1]

آزاد نے "اقبال کی معنویت" اور کلامِ اقبال کو سمجھنے کے لیے MODERN MIND اور MODERN THOUGHT کو اہمیت دی ہے۔ اسی طرح آزاد کا خیال ہے کہ "تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ" کی تعلیم کے بغیر علامہ اقبال کے کلام کی معنویت سمجھنا ناممکن ہے، چنانچہ لکھتے ہیں :

"اقبال کی فکر کی گہرائی میں اترنے کے لیے "تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ" کا مطالعہ ناگزیر ہے اس کا مختصر سا دیباچہ ہمارے فکری ادب میں بہ قامت کہتر بہ قیمت بہتر کی ایک خوبصورت مثال ہے"۔ [2]

اقبال نے اپنے میں جا بجا ترمیم و تبدیلی کی ہے جس کا آزاد نے بغور جائزہ لیا ہے۔ پروفیسر گیان چند جین صاحب نے بھی اس موضوع پر کتاب مرتب کی ہے۔ آزاد کے خیال میں اقبال نے نہ صرف اپنی شاعری میں ترمیم و اضافہ کیا بلکہ سخن شناسوں کے مشورے بھی لیے ہیں۔ چنانچہ آزاد نے دلیل کے طور پر دوست احباب کے خطوط

---

[1] جگن ناتھ آزاد۔ "اقبال کی غزل کا ابتدائی دور" (مشمولہ) "اردو غزل" مرتبہ ڈاکٹر کامل قریشی، ص ۲۴۳۔

[2] جگن ناتھ آزاد۔ "اقبال کی معنویت" (مشمولہ) "اقبال کا فن" مرتبہ گوپی چند نارنگ، ص ۲۹۔

کو پیش کیا ہے۔ خاص طور پر سید سلیمان ندوی کے خطوط جن میں اقبال کے کلام پر تنقید و تبصرہ موجود ہے۔ آزاد لکھتے ہیں:

"شروع میں اقبال فن کی باریکی کے معاملے میں اپنے اکثر معترضین کے ساتھ بحث میں الجھ جایا کرتے تھے۔ بعد میں ایک مقام ایسا بھی آیا کہ اس قسم کے بحث و مباحثے کو محض تضیعِ اوقات سمجھ کر وہ نظر انداز کر دیا کرتے تھے۔ لیکن شروع میں یہ صورت نہیں تھی۔ اور غالباً انھی مباحثوں کا نتیجہ ہے کہ اقبال کے اندر خود انتقادی کی ایک ایسی کیفیت پیدا ہو گئی تھی کہ وہ اپنے اشعار کو اکثر نقد و نظر کی کسوٹی پر پرکھتے رہتے تھے۔ اور یہ عمل اتنی شدّت اور اتنی مدّت تک جاری رہا کہ آج اقبال کے قریب قریب سارے متروک کلام اور ترمیم یافتہ مصرعوں اور اشعار پر مشتمل چھوٹی بڑی کئی کتابیں معرضِ وجود میں آ چکی ہیں۔"[1]

"اقبال کی شاعری میں ہندوستانی عناصر و تمدّن" وغیرہ موضوع پر جب آزاد کے مضامین چھپے تو کئی گوشوں سے مختلف اعتراضات سامنے آئے۔ ان سب اعتراضات کا جواب آزاد نے "اقبال کی شاعری میں اختلافی پہلو" مقالے میں دیا ہے۔ ایک مقام پر لکھتے ہیں:

"اقبال کا کلام اوّل سے آخر تک بہ آوازِ بلند کہہ رہا ہے کہ میرے مصنّف کے نظریات کو سمجھنے کے لیے اس ژرف نگاہی سے کام نہیں لیا گیا ہے جس کا مستحق تھا۔ اقبال نے وطنیت کو کبھی اسلام کی ضد قرار نہیں دیا بلکہ وطنیت کے اس سیاسی اقتدار کے نظریات کو اسلام کو ضد قرار دیا ہے جس ہمارے دل میں

---

[1] جگن ناتھ آزاد — ترمیمات اقبال (مشمولہ) "اقبال کا فن"، از گوپی چند نارنگ، ص ۱۴۴۔

مذکورہ خرابیوں کے لیے راستہ کھلتا ہے"۔ [۱]

جگن ناتھ آزاد فارسی اور عربی زبانوں سے بھی واقف ہیں۔ فارسی میں انھوں نے ایم۔ اے کیا۔ علامہ اقبال کے فارسی اشعار بہت زیادہ ہیں۔ ان کا مقالہ اقبال کی فارسی شاعری سے متعلق ہے۔ اقبال کی فارسی شاعری کس مرتبے کی ہے! انھوں نے فارسی شاعری کی ابتدا کب کی؟ فارسی شاعری میں ان کا مرتبہ کیا ہے؟ اس طرح کے سوالات کے جوابات کو آزاد نے اپنے مقالے میں جگہ دی ہے۔ آزاد لکھتے ہیں:

"اقبال نے اپنی شاعری کی ابتدا اردو سے کی۔ لیکن جب انھوں نے اول اول اپنے کلام کو مرتب کر کے کتابی صورت میں شائع کیا تو یکے بعد دیگرے انھوں نے تین مجموعے فارسی میں ہی اہلِ ملک کے سامنے پیش کیے۔ سب سے پہلے ۱۹۱۴ء میں "اسرارِ خودی" شائع ہوئی۔ اس کے بعد ۱۹۱۸ء میں "رموزِ بے خودی" اور ۱۹۲۲ء میں "پیامِ مشرق"۔ اقبال نے جس طرح اردو شاعری کو خرافات سے پاک کر کے اسے ایک پاکیزگی اور طہارت عطا کی۔ اس طرح انھوں نے فارسی شاعری کی بھی کایا پلٹ دی۔ اقبال کے فکر نے فارسی شاعری کی اس رو کو جو رندی اور ہوسناکی اور ناشائستگی کو اپنے جلو میں لیے بڑھی چلی آرہی تھی، سدِّ باب کیا اور عشق، شوق، خودی اور بے خودی کو نیا مفہوم عطا کر کے فارسی شاعری کو ایک صحت مندانہ ادبی رجحان سے آشنا کیا"۔ [۲]

---

[۱] آزاد۔ "اقبال کی شاعری میں اختلافی پہلو" (مشمولہ) "اقبال۔ کچھ مضامین" انجمن ترقی اردو (ہند)، نئی دہلی، ص ۹۸۔

[۲] آزاد۔ "اقبال کی فارسی شاعری" (مشمولہ) "اقبال پر ہمہ جہتی مذاکرہ" اقبال صدی سیمپوزیم جواہر لعل نہرو یونیورسٹی، ص ۱۸، ۲۴۔

اقبالؔ کی شاعری سمجھنے، پرکھنے اور اس کی قدر و قیمت کو جاننے کے لیے جگن ناتھ آزادؔ کی تصانیف خصوصاً اقبالیات سے متعلق ان کی تمام کتابوں کا مطالعہ بہت ضروری ہے۔ آزادؔ نے کلامِ اقبالؔ کے اس پہلو کو واضح کیا جو اب تک ظلمت و تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا اور جن پر ماہرینِ اقبالیات نے اس طرح نگاہ نہیں ڈالیں جس طرح کہ آزادؔ نے مفصّل طور پر اور تحقیقی طور پر جائزہ لیا ہے۔ آزادؔ کو اقبالؔ اور کلامِ اقبالؔ سے عشق ہے۔ جہاں کہیں بھی اردو کا ذکر کیا جائے وہ اقبالؔ کا ضرور نام لیتے ہیں۔ ان کا کوئی مضمون اقبالؔ کے بغیر پورا نہیں ہوتا۔ کلامِ اقبالؔ پڑھ کر اکثر وہ جھوم اٹھتے ہیں۔ آزادؔ کی تصانیف یا اقبالیات کو پڑھ کر ہم کلامِ اقبالؔ کا مزہ لے سکتے ہیں۔ آزادؔ اپنے کارناموں پر کبھی فخر نہیں کرتے بلکہ اپنے آپ کو ایک طالب علم کہتے اور تصوّر کرتے ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ اس دور کے وہ صفِ اوّل کے ماہرِ اقبالیات ہیں۔ اردو ادب میں آزادؔ بحیثیت ماہرِ اقبالیات ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے۔

پانچواں باب

جگن ناتھ آزاد بحیثیت محقق و نقاد

دنیائے ادب میں جگن ناتھ آزاد جہاں شاعر کی حیثیت سے مقبول و معروف ہیں وہیں وہ ماہرِ اقبالیات، نقاد، خاکہ نگار اور سوانح نگار کی حیثیت سے بھی پہچانے جاتے ہیں۔ ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ ایک شخص کو ایک سے زیادہ حیثیتوں سے تسلیم کیا گیا۔ آزاد پہلو دار شخصیت کے مالک ہیں۔ ہر پہلو سے وہ خاصے مقبول ہیں ___ ایک اچھے شاعر بھی ہیں اور اقبالیات کے ماہر بھی۔ بہ حیثیت محقق و نقاد بھی۔ آزاد کی تنقید نگاری کا اس باب میں جائزہ لیا جائے گا۔

آزاد نے اقبال ہی سے اپنی تنقید نگاری کی ابتدا کی۔ ان کے تنقیدی مقالات کا مجموعہ "اقبال اور اس کا عہد" ہے مگر یہ کتاب اقبالیات سے متعلق ہے۔ اس لیے اس باب میں اس کا مفصل جائزہ لیا جا چکا ہے۔ یہاں صرف ان کے تحقیقی کاموں اور تنقیدی بصیرتوں کی نشان دہی کی جائے گی۔

اقبال ایک عظیم شاعر ہیں، ان کی شاعری عالمگیر حیثیت رکھتی ہے۔ یہ کہنا کہ اقبال صرف اسلامی شاعر ہیں، آزاد کے خیال میں اقبال اور کلامِ اقبال کے ساتھ ناانصافی ہے۔

تحقیق

آزاد نے اقبالیات کے مختلف گوشوں کی نقاب کشائی کی ہے۔ ان میں ان کی سب سے پہلی تحقیق اقبال کی تاریخِ پیدائش کے متعلق

ہے۔ پاکستان کے سابق وزیرِ اعظم جناب ذوالفقار علی بھٹو نے جو کمیٹی تشکیل دی تھی اس کمیٹی کی رپورٹ میں بھی یہی تاریخ صحیح ہے۔ اسی طرح دیگر محققین نے بھی اس تاریخ کو تسلیم کیا۔ اس سلسلے میں آزاد کا مقالہ ۱۸ فروری ۱۹۷۳ء کو "ہندوستان ٹائمز" نئی دہلی میں شائع ہوا۔

آزاد نے اقبال کے متعلق بہت سی غلط فہمیوں کا ازالہ کیا۔ بعض حضرات اقبال کو پاکستان کا بانی سمجھتے تھے اور بعض اقبال کو صرف مسلمانوں کا شاعر تصور کرتے ہیں۔ آزاد نے اپنے تنقیدی و تحقیقی مقالات کے ذریعے ان غلط فہمیوں کو دور کیا۔ اس طرح آزاد نے اپنی تحقیق کے ذریعے کلامِ اقبال کے ایک خاص پہلو کو اجاگر کیا ہے۔ انھوں نے اپنی تحقیق کے ذریعے کلامِ اقبال میں ہندوستانی تہذیب و تمدن کے عناصر پیش کیے۔ اقبال نے کسی متعین مدت تک ہندوستانیت یا وطنیت کے گیت نہیں گائے بلکہ شروع سے آخر تک ان کے کلام میں وطنیت کا جذبہ موجود ہے۔ اس بات کو بھی آزاد نے اپنی تحقیق کے ذریعے ثابت کیا۔ آزادی کے بعد ہندوستان میں کلامِ اقبال کے ساتھ کس طرح کا سلوک برتا گیا اور کس طرح کے کام انجام دیے گئے۔ آزاد نے اپنی کتاب "ہندوستان میں اقبالیات اور دوسرے توسیعی لکچر" میں یہ کارنامہ انجام دیا ہے۔ آزاد نے اپنے اساتذہ کا مختلف رسائل و جرائد کے ذریعے کلامِ اقبال کے متروک اشعار ڈھونڈ نکالا اور انھیں یکجا کیا۔ استادِ محترم ڈاکٹر گیان چند جین جیسی شخصیت نے بھی ان مضامین اور کتابوں سے استفادہ کیا۔ چنانچہ انھوں نے اپنی کتاب "اقبال کا ابتدائی کلام بہ ترتیب مہ و سال" میں بہت سے حوالے دیے ہیں۔ اقبال نے اپنے کلام میں کس طرح کی ترمیم و اضافے کیے۔ کن اشعار کو متروک قرار دیا۔ ان سب کا احاطہ اور تحقیق کرنا آزاد ہی کا کام تھا۔ انھوں نے بڑی جانفشانی اور اپنی کاوشوں کے ذریعے اس طرح کے کارنامے انجام دیے۔ "اقبال اور کشمیر" کتاب میں آزاد نے یہ تحقیق کی کہ علامہ اقبال صرف ایک بار کشمیر تشریف لائے۔ اقبال پر سب سے پہلے لکھنے والے جوہر شناس کون تھے۔ آزاد نے

اس سلسلے میں کشمیر کے بڑے بزرگوں سے ملاقاتیں کیں اور ان کی آراء سے بھی استفادہ کیا۔ ملا زادہ ضیغم لولابی کے تعلق سے بھی آزاد نے تحقیق کی۔ ان سب تحقیقات کا ذکر اقبالیات کے ضمن میں تفصیل سے کیا گیا ہے۔ "فکرِ اقبال کے بعض اہم پہلو" اس کتاب کو آزاد نے مرتب کی ہے۔ آزاد نے جو مضامین و مقالات شامل کیے ہیں اس سے کتاب کی اہمیت و افادیت کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے۔ انگریزی میں ان کی کتابیں "اقبال مائنڈ اینڈ آرٹ، اقبال اس کی شاعری اور فلسفہ" دونوں کتابوں میں آزاد نے اقبال کے کلام کا تنقیدی جائزہ لیا ہے۔" اقبال اور مغربی مفکرین" اقبالیات کے ضمن میں آزاد کی سب سے عمدہ کتاب ہے۔ علامہ اقبال ایک فلسفی شاعر تھے۔ اس لیے ان کے کلام کو فلسفے کے بغیر نہیں سمجھا جا سکتا۔ آزاد نے مغربی مفکرین اور فلسفیوں کے خیالات کا تجزیہ کیا ہے۔ اقبال اگرچہ بہت سارے مغربی مفکرین سے متاثر ہوئے مثلاً بیکن، لاک، کانٹ، شوپن ہائر، کارل مارکس، نطشے، برگساں، دانتے، ملٹن اور گوئٹے وغیرہ مگر انھوں نے ان کے فلسفوں کو من و عن قبول نہیں کیا۔ آزاد نے اقبال اور مغربی مفکرین کے فلسفوں اور خیالات کا تجزیہ و موازنہ کیا ہے کہ کہاں ان میں مماثلت ہے اور کہاں اقبال نے ان سے اتفاق نہیں کیا ہے۔ بلکہ ایک الگ راستہ اختیار کیا ہے۔ آزاد کی یہ کتاب شاہکار کا درجہ رکھتی ہے۔

آزاد نے اپنی تحریر و تقریر کے ذریعے اقبال کے فکر و فن کو عام کرنے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے یوروپی ممالک کی سیر کی اور اب بھی کر رہے ہیں مگر سیر و تفریح کی غرض سے نہیں بلکہ ہر مرتبہ وہ اقبال کے پیغام کو لے کر یوروپ پہنچے ہیں۔ انگریزی، اردو، ہندی غرض جس طرح ہو سکا آزاد نے اقبال کے پیغام کو عام کیا ہے۔ "کولمبس کے دیس میں" اور "پشکن کے دیس میں" آزاد کے ان دونوں سفرناموں کو پڑھ کر یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ عاشقِ اقبال رنگینیٔ دنیا میں رہ کر بھی اپنے محبوب سے غافل نہیں ہوا۔ وہی تعلیمی سلسلہ، اقبال کے پیغام کو عام کرنے کی فکر، ملک اور بیرونِ ملک کی تقریباً ۶۵ یونیورسٹیوں میں ۱۰۵ توسیعی لیکچرس اور دو سو کے

قریب سیناروں میں وہ شرکت کر چکے ہیں، جس کی تعداد میں ابھی اضافہ ہو رہا ہے۔

تنقید

آزاد کے تنقیدی مقالات کا مجموعہ "نشانِ منزل" چودہ تنقیدی مقالات اور نو نثری تقریروں پر مشتمل ہے۔ ان میں دو مقالے (۱) حسرت موہانی اور اقبال (۲) اقبال صرف مسلمانوں کے شاعر؟ اقبالیات سے متعلق ہیں جن کا ذکر کیا جا چکا ہے۔

"ہندوستان کے تہذیبی عناصر اور اردو" علمی و تحقیقی مقالہ ہے۔ اردو کو عام طور پر مسلمانوں سے مربوط کرنے کی کوشش کی گئی ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ محمد قلی قطب شاہ، نصرتی، غواصی، نظیر اکبر آبادی، میراجی اور ظفر علی خاں نے ہندو دھرم کی روایات و قومی تہذیب کی جھلکیاں اپنی نظموں میں پیش کی ہیں۔ اقبال کے یہاں بھی ہندو دیو مالائی تصور موجود ہے۔ ہندوستان کے قدیم مذہب ویدو دھرم، بدھ دھرم، عیسائیت اور اسلام کی تواریخ سے اقبال نے استفادہ کیا ہے۔ خاص طور پر تین مذاہب ہندو دھرم، عیسائی اور اسلام ایک دوسرے سے ضرور متاثر ہوئے ہیں، آزاد لکھتے ہیں:

> "یہ تینوں مذاہب ہندو دھرم، اسلام اور عیسائیت ایک دوسرے میں مدغم تو نہ ہوئے جیسے مرورِ ایام کے ساتھ بدھ دھرم ہندو دھرم میں مدغم ہو گیا لیکن آپس میں قریب آکر ایک دوسرے کو اس طرح سے متاثر کرتے رہے کہ ان کے باہمی اتصال نے ہندوستان میں رواداری اور بُردباری کی ایک فضا پیدا کر دی اور یہ وہ فضا تھی کہ جس میں مشترکہ ہندوستانی تہذیب کو پروان چڑھنے کا بھرپور موقع ملا۔"[۱]

مسلم شعراء میں بیشتر ایسے ہیں جنھوں نے ہندوستان کی رنگا رنگ تہذیب کو پیش کیا۔ اسی طرح ہندو شعراء نے عمدہ نعتیں کہی ہیں۔ کربلا کے واقعاتِ شہادت

---

[۱] آزاد۔ "نشانِ منزل" ص ۲۸۔

عید اور محرم وغیرہ پر عمدہ نظمیں ان کے یہاں موجود ہیں۔ مالک رام نے "اسلام اور عورت" پر ایک عمدہ اور باضابطہ کتاب لکھی جو قرآنی آیتوں سے لبریز ہے۔ غرض اردو زبان کا صرف مسلمانوں سے رشتہ جوڑنا ناانصافی ہے۔ آزاد نے اپنے مقالے میں ہندوستانی کلچر کے اہم خدوخال کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ آزاد اردو زبان کے بارے میں لکھتے ہیں:

"اردو ادب کی حریم میں ہندوستانی ثقافت کا یہ چراغ آج بھی روشن ہے اگرچہ کبھی کبھار بادِ مخالف کے جھونکے اسے بجھانے کی کوشش میں بھی مصروف نظر آتے ہیں لیکن مقامِ مسرت یہ ہے کہ اس چراغ کی روشنی پہلے سے زیادہ تیز ہوتی چلی جا رہی ہے"۔ [۱]

اس کتاب کا ایک مقالہ "جوش ملیح آبادی کی دو نظمیں" ہیں۔ اس مضمون میں کوئی نئی بات نہیں ہے۔ آزاد اور جوش کا ستّرہ برس کا ساتھ تھا۔ دونوں میں ایک طرح کے دوستانہ تعلقات تھے۔ آزاد نے اپنی دیگر کتابوں اور مقالوں میں ان کے مرقعے کھینچے تھے۔ جوش کی کمزوریوں کا ذکر کیا ہے۔ جوش اپنی محفل میں اقبال کے ذکر کو ناپسند کرتے تھے۔ آزاد کے خیال میں جوش کے یہاں فلسفیانہ مضامین ضرور ہیں مگر فکر و نظر کے اعتبار سے ان میں بہت کمی ہے۔ آزاد لکھتے ہیں:

"لیکن یہ خلش ہمیشہ میرے دل میں رہی کہ اگر جوش اپنی شاعری پر ہم ایسے نیازمندوں کو کھل کر بات کرنے دیں اور ہماری بات چیت پر غور کرنے کی زحمت کریں تو ان کی شاعری اپنا یہی آہنگ اور کیف برقرار رکھتے ہوئے فکر و نظر کے اعتبار سے زیادہ قابلِ قبول بن سکتی ہے"۔ [۲]

---

[۱] جگن ناتھ آزاد۔ "نشانِ منزل"، ص ۳۷۔ [۲] ایضاً، ص ۴۲۔

آزاد جوشؔ کے اندازِ بیان اور آہنگ سے زیادہ متاثر ہیں۔ ان کے خیال میں جوشؔ کا اندازِ بیان اور آہنگ فلسفیانہ و دقیق مضامین کے لیے مناسب ثابت ہو سکتا تھا جب کہ اس میں غور و فکر، سوچ بچار پیدا کی جاتی۔ انھیں اتنی فرصت ہی نہیں ملتی تھی کہ کتابوں کے مطالعہ میں اپنا وقت صرف کر سکیں۔ آزادؔ لکھتے ہیں :

"ہر روز وزراء کی باقاعدہ دربار داری اور ہر شام ان کے اپنے اپنے دربار میں خوشامدی شعراء اور مصاحبین کی حاضری اور اس کے ساتھ ہی ساتھ ناؤ نوش کے بلا ناغہ شغل نے کتاب کے ساتھ انھیں وہ ربط پیدا ہونے نہیں دیا جو ایک فلسفی شاعر کا ہونا چاہیے۔"[1]

آزادؔ نے اپنے اس مقالے میں جوشؔ کی دو نظموں کا ذکر کیا ہے جن میں نقائص ہیں۔ فلسفہ سوچ بچار کی کمی ہے۔ آزادؔ جوشؔ کے یہاں غور و فکر کی کمی محسوس کرتے ہیں۔ اقبالؔ کا تقابلی مطالعہ کرتے ہوئے آزادؔ یہ بتلاتے ہیں کہ جوشؔ کی نظموں میں طوالت ہونے کے باوجود اتنی گیرائی اور گہرائی نہیں ہے جو اقبالؔ کی ایک چھوٹی سی نظم میں موجود ہے۔

اس کتاب کا اور ایک مقالہ "جواہر لال نہرو کا ادبی مرتبہ" ہے۔ جواہر لال نہرو ایک عظیم رہنما، سیاست داں، مورخ، مفکر، دانش ور اور بہترین ادیب تھے۔ بہ حیثیت ادیب انھیں بہت کم لوگ جانتے ہیں۔ آزادؔ نے اس تنقیدی مضمون کے ذریعے نہروؔ کے علمی و ادبی مرتبے کو پیش کیا ہے۔ آزادؔ لکھتے ہیں :

"یہ الگ بات ہے کہ سیاسی ہنگامہ آرائیوں اور نظامِ مملکت کی ذمہ داریوں کے باعث وہ ادبی زندگی کی طرف پوری طرح توجہ نہ دے سکے لیکن اس کے باوجود ان کے اندر جو ایک ادیب پنہاں تھا اس کا پرتو جواہر لال کی شخصیت اور تحریروں پر پوری طرح نمایاں رہا۔"[2]

---

[1] جگن ناتھ آزادؔ۔ نشانِ منزل، ص ۴۲۔ [2] ایضاً، ص ۴۶۔

عین موت کے وقت یا ایک روز قبل رابرٹ فراسٹ کے مصرعے اور تین صفحات پر مشتمل وصیت انگریزی نثر ادب کی ایک شاہکار حیثیت رکھتی ہے۔ بقول آزادؔ: "اس تحریر میں سیاست داں جواہر لال کے اندر کا سویا ہوا فنکار صرف جاگ ہی نہیں اٹھا بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ چند صفحات لکھتے وقت اس کی تمام تخلیقی قوتیں شدت کے ساتھ مصروفِ عمل ہو گئی ہیں۔"[1]

جواہر لال نہرو نے اپنی تحریر میں گنگا کو ایک عظیم روپ میں دیکھا اور دکھایا ہے جس میں اہلِ ہند کے لیے ایک اہم پیغام ہے۔ آزادؔ کے خیال میں یہ ہندوستانی تمدن ہے جسے نہرو نے سنبھال کر رکھا۔ وہ ترقی پسند ہوتے ہوئے بھی اپنی ثقافتی اور تاریخی ورثے سے کبھی غافل نہیں ہوئے۔ انھوں نے اپنے نثر پارے میں ہندوستان کو گنگا سے جو تشبیہ دی ہے وہ ایک ایسی اور اچھوتی تشبیہ ہے کہ کسی بھی ادب کے لیے باعثِ فخر ہو سکتی ہے۔

اقبالؔ کا ذکر چھیڑتے ہوئے لکھتے ہیں کہ جس طرح گنگا میں جواہر لال کو ہندوستانی عظمت کی تصویر جھلکتی نظر آتی ہے اسی طرح علامہ اقبالؔ نے "مسجد قرطبہ" میں عظمتِ اسلام کی تصویر دیکھی تھی۔ یہاں ایک بنیادی فرق موجود ہے۔ اقبالؔ نے "مسجد قرطبہ کی تعمیر میں عشق کا جذبہ کارفرما دیکھا اور اسی وجہ سے انھیں اسلام کی عظمت کا احساس ہوا۔ انھوں نے جب قرونِ اولیٰ کے مجاہدین پر نظر ڈالی تو ان میں عشق کے جذبے کارفرما نظر آئے۔ جب کہ جواہر لال نہرو نے گنگا کو ایک عظیم روپ میں اس لیے دیکھا کہ یہ گنگا شیو جی کی جٹاؤں سے نکلی ہے۔ کئی ندیوں کی صورت میں گنگا کا شیو جی کی جٹاؤں سے نکلنا استعارہ ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک دیومالائی تصور ہے جسے نہرو نے تشبیہ و استعارے کے روپ میں پیش کیا ہے۔ یہاں عشق کا جذبہ کارفرما نہیں ہے۔ ایک اور مقام پر آزادؔ اقبالؔ کا مقابلہ جواہر لال نہرو سے کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

---

[1] جگن ناتھ آزادؔ۔ نشانِ منزل، ص ۴۶۔

"اس مقام پر اس فرق کو سمجھنا بہت ضروری ہے جو جواہر لال نہرو
اور اقبالؔ کے نظریۂ حیات میں تھا۔ اقبال مذہب اور مذہبی زندگی
کو اہمیت دیتے تھے۔ نہرو اس سے بیگانہ تھے۔ اقبالؔ ؏
دوڑ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایام تو
کے قائل تھے۔ نہرو ہندوستان میں ایٹمی دور لانے کے لیے
بے تاب تھے" [1]

جہاں تک پیچھے کی طرف پلٹنے کا سوال ہے اقبال صرف یہ چاہتے ہیں کہ ہم اپنی تہذیب و تمدّن کو نہ بھولیں، مذہب سے بیگانہ نہ ہوں۔ اپنی وراثت کی حفاظت کریں۔ اقبالؔ ایٹمی دور لانے کے کبھی خلاف نہیں تھے۔ وہ ترقی زمانہ کے خلاف بھی نہیں تھے۔ اُن کا سارا کلام آنے والے کل کے لیے ہی ہے۔ انھوں نے یورپ کی ترقی کو سر آنکھوں پر لیا ہے مگر اپنی روایت، اور اپنی شناخت کے ساتھ۔

جواہر لال نہرو نے اپنی سوانح حیات میں جو نظریے قائم کیے وہ ہمیشہ ہی اس پر اٹل رہے۔ ہندوستان کو انھوں نے باقی دنیا سے کبھی الگ تھلگ نہیں سمجھا۔ اقتصادی آزادی کے بغیر ملک کی آزادی کو نامکمل سمجھا۔ شہنشاہیت کے وہ ہمیشہ مخالف رہے۔ فاشزم اور تشدد کی انھوں نے ہمیشہ مذمت کی۔ ایک ایسے ادیب کے لیے جو سیاست داں بھی ہے، کسی ایک بات پر قائم رہنا بڑی بات ہے۔ یہ خوبی نہرو کی تحریروں میں موجود ہے۔ دنیا کے دانشوروں میں نہرو کا مرتبہ بہت اونچا ہے۔ انھیں کتابوں کے مطالعے کا بے حد شوق تھا۔ کتابیں ان کا اوڑھنا بچھونا تھیں۔ جیل کی زندگی میں انھوں نے "سوانح حیات" مرتب کی۔ قریب قریب دو سو خطوط لکھے جو ان کی اہم تصانیف ہیں۔ آزاد لکھتے ہیں:

"ان کی تحریریں خواہ کتابیں ہوں خواہ مقالات و خطبات فولادی
قلعے ہیں جنھیں وقت کی دستبرد سے کوئی اندیشہ نہیں۔" [2]

---

[1] آزاد ــ نشانِ منزل۔ ص ۴۹۔ [2] ایضاً۔ ص ۵۳۔

سوانح حیات، خطوط اور متعدد مقالات کے علاوہ نہرو نے "تاریخ عالم کی جھلکیاں" (مع باپ کے خطوط بیٹی کے نام)، "ہندوستان میں اٹھارہ مہینے"، "نئے مضامین اور تحریریں"، "ہم کہاں ہیں" چین، ہسپانیہ اور جنگ اور دریافت ہند وغیرہ ان کی اہم تصانیف ہیں۔ آزاد نے ان کتابوں سے اہم اقتباسات پیش کیے ہیں جو اردو کے قاری کے لیے ایک بیش بہا تحفہ ہیں۔ جواہر لال کی منظر نگاری، قادر الکلامی، انداز بیان، لب و لہجہ، موضوع، سادگی، سلاست، شگفتگی اور لطافت پر آزاد نے خاصی روشنی ڈالی ہے۔ ایک مقام پر آزاد لکھتے ہیں:

"جواہر لال کی کوئی بھی تصنیف آپ دیکھیں، کسی بھی تحریر پر نگاہ ڈالیں ایک بات روز روشن کی طرح واضح نظر آئے گی کہ ان کے نگارشات صرف "نتیجۂ فکر" ہی نہیں ہیں بلکہ ان کے پیچھے جوش کردار کی ایک ایسی قوت بھی موجود ہے جسے علامہ اقبال نے لفظ "عشق" سے تعبیر کیا ہے۔ محبّ وطن جواہر لال کو ہندوستان کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔ لیکن یوروپ، امریکہ اور روس کے اہلِ فکر و نظر جس نہرو سے بدرجۂ اتم متاثر ہوئے ہیں اور جس نہرو نے ان کے دل و دماغ پر ایک جاودانی نقش چھوڑا ہے وہ اہلِ قلم نہرو ہے۔ وہ اہلِ قلم جس نے دنیا کو "دریافت ہند" سوانح حیات اور تاریخ عالم کی جھلکیاں" جیسے زندۂ جاوید کارنامے عطا کیے ہیں۔"[۱]

جگن ناتھ آزاد کے مقالے ترقی پسند شاعری اور فرحت کی رامائن جیسے موضوع پر بھی ہیں۔ ترقی پسند شاعری کے بارے میں آزاد کا خیال ہے کہ آج جبکہ قریب بیس برس بعد یہ زیر ترتیب مقالہ "نشانِ منزل" کے مسودے میں شامل کیا جا رہا ہے اس کے اکثر حصے ترمیم اور تبدیلی کے محتاج ہیں۔"[۲]

---

[۱] آزاد۔ نشانِ منزل، ص ۵۸، ۵۹۔ [۲] ایضاً، ص ۱۱۔

جگن ناتھ آزاد کے اس مضمون کو لکھے ہوئے پچاس سال کا عرصہ گزر گیا۔ ظاہر ہے کہ اب اس میں ترمیم و تبدیلی کی اشد ضرورت ہے۔ یہ مقالہ محکمۃ السنہ پنجاب کی مجلس مصنفین کے سالانہ جلسے کے لیے ۱۹۶۲ء میں لکھا گیا تھا۔ ان تیس[۳۰] برسوں میں ان گنت شعراء ترقی پسند تحریک سے متاثر ہوئے انھیں شامل کرنے کی ضرورت ہے۔ ترقی پسند شعراء و ادباء کے افکار و خیالات میں نمایاں تبدیلی بھی ہوئی ہے۔ ان تمام باتوں کا احاطہ ضروری ہے مگر موجودہ صورت میں بھی مقالہ اہمیت کا حامل ہے۔ تقریباً تیس صفحات پر مشتمل یہ مقالہ خاصا طویل ہے۔ آزاد نے ہندوستان کے سیاسی و سماجی پس منظر کا جائزہ لیا ہے۔ اردو ادب کے ۱۸۵۷ء سے قبل اور مابعد کے اردو ادب کا مفصل حال لکھا گیا ہے۔ آزاد غالب اور بہادر شاہ ظفر کی شاعری کو ترقی پسند تحریک کی کڑی سے ملاتے ہیں۔ حالی کے علاوہ سرسید، اکبر، چکبست اور اقبال نے بھی ادب کو سماجی رشتے سے جوڑا ہے۔ اردو شاعری کو محدود دائرے سے نکال کر جامعیت اور ہمہ گیری عطا کی ہے آزاد نے ان سب کے کارناموں کو سراہا ہے۔ ان اعلان ناموں کا بھی غائر نظر سے تجزیہ کیا گیا ہے جو ترقی پسند مصنفین کے اجلاس میں پڑھے گئے تھے اور جن پر مولانا عبدالحق، پریم چند، جوش ملیح آبادی، نیاز فتحپوری، سجاد ظہیر اور ڈاکٹر ملک راج آنند جیسی شخصیتوں کے دستخط ہوتے تھے۔ انہیں اعلان ناموں کی روشنی میں آزاد نے ترقی پسند شعراء کے کلام کا جائزہ لیا ہے۔ ان کے شعری افکار میں جو تبدیلی رونما ہوئی یا جو رونما ہونی چاہیے ان سب کا احاطہ کیا گیا ہے۔ ان شعراء کا بھی ذکر ہے جو ترقی پسند شاعری سے براہِ راست متاثر نہیں ہوئے مگر ان کے کلام میں ترقی پسندی موجود ہے۔ آزاد ایک جگہ لکھتے ہیں:

> "حیرت کی بات ہے کہ جس ترقی پسند تحریک کے اعلان نامے
> میں ہندوستانی ادیبوں کی توجہ اس فرض کی طرف دلائی گئی
> کہ وہ ہندوستانی زندگی میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کا

بھرپور اظہار کریں اور جس میں یہ کہا گیا کہ ہم ادب کو عوام کے
قریب لانا چاہتے ہیں اور اسے زندگی کی عکاسی اور مستقبل کی
تعمیر کا موثر ذریعہ بنانا چاہتے ہیں اس سے وابستہ شعراء اور ادبا
کی تخلیقات میں نئے ہندوستان کی زندگی کے کسی تعمیری پہلو کی
جھلک نظر نہیں آتی"۔[۱]

ترقی پسند تحریک کے کارناموں کا احاطہ کرتے ہوئے آزاد یہ مشورہ دیتے ہیں:

"ترقی پسند شعراء کو یہ دیکھنے کے لیے اپنی شاعری پر ایک نظر
ڈالنی چاہیے کہ انھوں نے کہاں تک اپنی تخلیقات میں ہندوستانی
زندگی میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کا بھرپور اظہار کیا ہے
اور وہ کس حد تک ہندوستانی تہذیب کی بہترین روایات
کے وارث کہلانے کے حق دار ہیں"۔[۲]

دوسرا مضمون "فرحت کی رامائن" کے بارے میں ہے۔ رامائن عقیدت و احترام
کی کتاب ہے۔ منشی شنکر دیال فرحت نے اسے اردو میں مثنوی کی شکل میں پیش کیا ہے۔
اردو میں کئی بار چھپنے کے باوجود یہ مثنوی گمنام تھی۔ آزاد نے اس مثنوی کو گمنامی سے
منظر عام پر لانے کی کوشش کی ہے۔ اس مثنوی کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے۔
رام اور سیتا کی زندگی کے واقعات کو عقیدت و احترام کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔
مقالے کے متعلق آزاد لکھتے ہیں:

"اس مقالے کو زیرِ نظر کتاب میں شامل کرتے ہوئے مجھے خاصی
ہچکچاہٹ ہو رہی ہے اس لیے کہ اگر اس موضوع پر لکھنا پڑے
تو میں شاید بالکل مختلف انداز کا مقالہ لکھوں لیکن اس مقالے
کے ساتھ ۱۹۴۲ء کے لاہور کی یادیں وابستہ ہیں"۔[۳]

---

[۱] آزاد۔ نشانِ منزل۔ ص ۸۴۔ [۲] ایضاً۔ ص ۸۸۔ [۳] ایضاً، ص ۱۰۔

چالیس پچاس برس کے بعد اگر آزاد کوئی مضمون لکھیں گے تو ظاہر ہے کہ وہ مضمون بالکل ہی الگ ہوگا۔ مگر اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہم اپنی پرانی تخلیق کو رد کرتے رہیں۔ راقم الحروف کے خیال میں اس مقالے سے جہاں آزاد کے تنقیدی ارتقا کا اندازہ ہوتا ہے وہیں ہم ان یادوں کو بھی سمیٹ لیتے ہیں جو آزاد سے وابستہ ہیں۔ ایک شاعر سے وابستہ ہیں۔ آج بھی اس مضمون کی اہمیت اپنی جگہ مسلّم ہے۔ مثنوی "سحر البیان" اور نسیم کی مثنوی "گلزارِ نسیم" کا ذکر کرتے ہوئے آزاد لکھتے ہیں:

"فرحت اس میدان میں میر حسن کے ہمرکاب ہیں لیکن رامائن کے واقعہ کی طوالت نے انھیں اختصار سے کام لینے پر مجبور کر دیا ہے۔"[1]

مگر اختصار کے باوجود نظم کی دل کشی اور روانی میں کوئی فرق نہیں آتا۔ شبلی کے قائم کردہ اصول و نظریات پر آزاد فرحت کی مثنوی کا جائزہ لیتے ہیں۔ آزاد نے اس مثنوی کا پورا خاکہ ہمارے سامنے پیش کر دیا ہے کہ اگر کسی کی نظر سے مثنوی نہ بھی گزری ہو تو وہ مثنوی کا لطف مقالے کے ذریعے سے لے سکتا ہے۔ آزاد لکھتے ہیں:

"میں نے رامائن فرحت کا ایک دھندلا سا خاکہ پیش کرنے کی کوشش کی ہے لیکن اس بلند مرتبہ مثنوی کے محاسن سے صحیح طور پر آگاہ ہونے کے لیے مکمل مثنوی کا مطالعہ ضروری ہے۔ دو چار پھولوں سے گلشن کی خوبصورتی، دل فریبی اور اس کی فرحت انگیز فضا کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔"[2]

مقالے میں دھندلا سا خاکہ ہے اور نہ ہی دو چار پھولوں کی خوشبو ہے بلکہ مکمل خاکہ ہے اور پورے گلشن کی خوشبو اس میں موجود ہے۔ ملک زادہ منظور احمد اس مقالے کے متعلق لکھتے ہیں:

"فرحت کی رامائن اپنے اندر فکر و فن کی وہ چنگاریاں چھپائے ہوئے ہے جو تنقید کی ہوائے خوشگوار پا کر شعلۂ جوالہ بن سکتی

---

[1] آزاد۔ نشانِ منزل، ص۔ ۱۰۲۔ [2] ایضاً، ص ۱۲۸۔

ہے اور ہمارے ادبی نگار خانے کو منور کر سکتی ہے"۔[1]

آزاد کے دیگر دو[2] مضامین، خورشید احمد جامی اور امر سنگھ منصور کے بارے میں ہیں۔ خورشید احمد جامی کے کلام کے دو مجموعے "رخسار سحر" اور "برگ آوارہ" پر آزاد نے تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ امر سنگھ منصور کی شاعری کے بارے میں آزاد لکھتے ہیں:

> "امر سنگھ منصور کی شاعری وہ شاعری ہے جو جنگِ آزادی کے لیے کی گئی۔ سردار امر سنگھ کے نام سے سیاسی اور صحافتی کارناموں کی وجہ سے پنجاب کا ہر شخص واقف ہے مگر انھوں نے شاعری بھی کی، اس سے بہت کم لوگ واقف ہیں۔ سردار امر سنگھ منصور کے کلام کا ایک بڑا حصّہ یا تو ناپید ہو چکا ہے یا تقسیمِ ہند کے دوران ضائع ہو گیا"۔

"جدید اردو شاعری" یہ مقالہ بھی ۱۹۵۲ء میں لکھا گیا۔ یہ مقالہ بھی ترمیم و تبدیلی کی گنجائش رکھتا ہے۔ جدید شاعری کیا ہے؟ جدید شاعری کی نوبت کیوں پیش آئی؟ جدید شاعری کس قسم کی ہونی چاہیے؟ آزاد نے انھیں سوالات کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس مقالے کو مرتّب کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

> "بنیادی طور پر نئی شاعری ہر اس موزوں کلام کو کہا جا سکتا ہے جس میں وقتی، ہنگامی اور عارضی اثر سے ہٹ کر کسی بات کو محسوس کرنے، سوچنے اور بیان کرنے کا نیا انداز موجود ہو یعنی کوئی شاعر فرسودہ قسم کے روایتی بندھنوں سے الگ رہ کر کسی احساس، جذبے یا خیال کے اظہار میں اپنی انفرادیت کو نمایاں کرتا ہے۔ تو وہ نیا شاعر ہے اور اس کی شاعری نئی شاعری ہے اور جس دور میں یہ خوبی بدرجۂ اتم موجود ہو۔ وہ یقیناً شاعری کا نیا دور کہلایا جا سکتا ہے"۔[2]

---

[1] ملک زادہ منظور احمد۔ "نشانِ منزل" (مشمولہ) جگن ناتھ آزاد۔ حیات اور ادبی خدمات۔ مرتبہ ڈاکٹر خلیق انجم، ص ۲۴۔ [2] آزاد۔ نشانِ منزل، ص ۱۴۱۔

اس طرح ہر دور میں نئی شاعری ہوتی چلی آرہی ہے۔ جدید شاعری کے متعلق حالی کے نظریات کو مدِ نظر رکھ کر اردو شاعری کا جائزہ لیا گیا ہے۔

"ہندوستان میں اردو کا مسئلہ آزادی کے بعد" یہ ایک تقریر ہے جو ۱۹۸۰ء میں ہمدرد نیشنل فاؤنڈیشن، پاکستان کی طرف سے راولپنڈی میں آزاد کے اعزاز میں دیے ہوئے ایک استقبالیے میں کی گئی۔ اس کے عنوان سے ہی مضمون کی قدر و قیمت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ آزادی کے بعد ہندوستان میں اردو کی بقا کے لیے جدوجہد کی جارہی تھی۔ حکومت کی طرف سے جو ادارے قائم کیے گئے ہیں جو کچھ امداد دی جارہی ہیں، آزاد نے ان کا احاطہ کیا ہے۔ بقول ملک زادہ منظور احمد:

> "ہندوستان میں اردو کا مسئلہ آزادی کے بعد' اس عنوان پر آزاد کا مقالہ حکومت کے مثبت اقدامات کا احاطہ ضرور کرتا ہے مگر ان موانع و مزاحم کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ جو اردو کی راہ میں دانستہ یا غیر دانستہ طور پر حالات نے کھڑے کر دیے ہیں"۔ [۱]

"ایک خط اور اس کا جواب" یہ بھی ایک مضمون کی شکل میں موجود ہے۔ یہ خط "نقوش" کے اڈیٹر محمد طفیل کے نام ہے۔ اڈیٹر موصوف نے اپنے خط میں اردو کے متعلق دو سوالات کیے ہیں۔ (۱) اگر موجودہ اردو ادب روبہ تنزل ہے تو اس کے اسباب کیا ہیں؟ (۲) اگر موجودہ اردو ادب روبہ تنزل نہیں ہے تو اس کے دلائل کیا ہیں؟ آزاد نے ان دو سوالوں کے جواب میں اردو کے ماضی، حال اور مستقبل کا نقشہ کھینچا ہے۔ اپنے دلائل و شواہد کو آزاد نے بڑے دل کش انداز میں پیش کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

> "آپ نے دو ٹوک جواب مانگا ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ کسی ادبی مسئلے پر دو ٹوک بات کرنا مجھے ادبی مزاج کے خلاف نظر آتا ہے۔

---

[۱] ملک زادہ منظور احمد۔ "نشانِ منزل" (مشمولہ) "جگن ناتھ آزاد۔ حیات اور ادبی خدمات" مرتبہ خلیق انجم، ص ۲۵۔

ادب دو اور دو چار سے عبارت نہیں ہے لیکن اگر دو ٹوک جواب دینا ضروری ہے تو میرا جواب یہ ہے کہ موجودہ اردو شاعری روبہ تنزل نہیں ہے۔ اب رہے دلائل تو وہ اس مصرع میں پیش کرتا ہوں ع

"آفتاب آمد دلیل آفتاب" [۱]

آزاد کے خیال میں ہمارے سوچنے سمجھنے کا ڈھنگ غلط ہے۔ ہم نے اپنی سوچ بچار کو اچھے برے، بلند و پست، روبہ ترقی اور روبہ زوال کی حد تک محدود کر لیا ہے۔ آزاد اس سلسلے میں مثالیں دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اقبال کی شاعری کے بعد اتنی عظیم اور اتنی بلند شاعری واقعی نظر نہیں آرہی ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہمالہ کی بلند ترین چوٹی ماؤنٹ ایورسیٹ پر جاکر ہمالہ کا سارا حسن ہی ختم ہوگیا ہے اور شملہ، نینی تال اور مری میں جو بلندی ہیں ایورسیٹ سے کہیں کم ہیں کوئی حسن ہی نہیں۔ کوئی جاذبیت ہی نہیں۔ شاعری ایک جلوۂ صد رنگ بلکہ جلوۂ ہزار رنگ ہے اس میں عظمت اور حسن کے کئی پہلو ہیں"۔ [۲]

آزاد نے مختلف دلائل کے ذریعے اس بات کو ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ہر دور کی شاعری اپنی جگہ پر اہم ہے۔ میر کے بعد غالب اور غالب کے بعد اقبال عظیم گزرے ہیں مگر اس کا مطلب ہرگز نہیں ہے کہ درمیانی دور میں اردو شاعری کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ آزاد لکھتے ہیں:

"ایک نابغہ کے بعد دوسرے نابغہ کے آنے میں ہمیشہ وقت صرف ہوتا ہے اور درمیانی وقفہ ضروری نہیں کہ ادب یا شاعری کے تنزل کا زمانہ ہو۔ دریاؤں اور سمندروں میں ہمیشہ رو کے اندر ایک

۱؎ آزاد۔ نشانِ منزل، ص ۱۶۱۔ ۲؎ ایضاً، ص ۱۶۲۔

> رو چلتی ہے۔ بعض دفعہ چھوٹی رو مخالف سمت کو بھی چلتی ہے لیکن اس سے بڑی رو کی سمت یا رفتار متاثر نہیں ہوتی۔ انگریزی ادب ایک شیکسپیئر کے بعد آج تک دوسرا شیکسپیئر پیدا نہ کرسکا تو کیا ہم یہ کہنے میں حق بہ جانب ہیں کہ شیکسپیئر کے بعد انگریزی ادب روبہ تنزل رہا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ہمارے یہاں اقبال کے بعد عظیم شاعری کی تخلیق نہیں ہوئی لیکن حسین اور بہت اچھی شاعری کی تخلیق کا عمل بدستور جاری ہے"۔[۱]

آزاد کے ان مقالات کے مطالعے سے ان کی اہمیت و افادیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ وہ جو کچھ کہنا چاہتے ہیں بڑے وثوق اور دلائل کے ساتھ کہتے ہیں۔ ان کے دلائل میں جان ہے۔ اپنی بات کو تسلیم کرانے کے لیے وہ مختلف دلائل و شواہد کا سہارا لیتے ہیں جن سے ان کی تنقیدی بصیرت و فہم کا اندازہ ہوتا ہے۔

"عالمی معیار اردو" ان کا دوسرا اہم مقالہ ہے۔ یہ مقالہ کلچرل اکیڈمی جموں و کشمیر کی آل انڈیا اردو کانفرنس میں پڑھا گیا تھا۔ عالمی ادب سے کیا مراد ہے؟ عالمی ادب کا معیار کیا ہے اور کیا ہونا چاہیے؟ اردو شاعری و ادب، عالمی ادب کے معیار پر پورا اُترتا ہے یا نہیں؟ ان سب سوالوں کا جواب اس مقالے میں موجود ہے۔ آزاد کا خیال ہے کہ ہم سب سے پہلے دیکھیں کہ اہلِ مغرب کسی اردو شاعر یا افسانہ نگار یا نقاد کے فکر و فن کی طرف متوجہ ہوئے ہیں یا نہیں۔ ان کی نظم و نثر کے ترجمے مغربی ادیبوں نے اپنی زبانوں میں کیے ہیں یا نہیں؟ اگر ان سب سوالوں کے جوابات مثبت میں ہیں تو کم از کم ہم اتنا کہہ سکتے ہیں کہ اردو دنیا کا ادب، عالمی ادب میں بے وقعت نہیں ہے۔

آزاد اپنے اس مقالے میں فراق گورکھپوری اور کلیم الدین احمد کے اقوال نقل کرتے ہیں جن کے نزدیک اردو دنیائے ادب کا عالمی ادب میں کوئی مقام نہیں۔ آزاد ان دونوں نقادوں کے خیالات سے اختلاف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

۱۔ آزاد۔ نشانِ منزل، ص ۱۶۳۔

"اردو کے ان دو نامور نقاد پروفیسر کلیم الدین احمد اور فراقؔ گورکھپوری کی مذکورہ آراء اس حقیقت کو روشن کر رہی ہیں کہ اقبالؔ جو اردو ہی کے شاعر ہیں، عالمی ادب میں ایک بلند مرتبے کے حامل ہیں۔ میری ناقص رائے ہیں کلیم الدین احمد نے کہنے کو تو کہہ دیا کہ اقبالؔ کا عالمی ادب میں کوئی مقام نہیں لیکن ان کی شاعری کا تجزیہ کرتے وقت ایسی باتیں ان کے قلم سے نکل گئی ہیں جو کلامِ اقبال کو عالمی ادب کی سطح پر لے آتی ہیں"۔ [1]

آزادؔ پریم چند کو پہلا اور آخری فکشن نگار مانتے ہیں جن کے یہاں فن انتہائی بلندیوں کو چھوتا ہوا نظر آتا ہے اور جو ایک قاری کو گورکی اور ٹالسٹائی کی یاد دلاتا ہے۔

"نشانِ منزل" میں نو نشریات ہیں۔ ان میں دو اقبالیات سے متعلق ہیں جن کا ذکر اقبالیات کے ضمن میں کیا جا چکا ہے۔ ایک مضمون "کچھ یادیں دوسرے ملکوں کی" یہ دراصل سفرنامہ کا حصّہ ہے جسے سفرنامے کے تحت بیان کیا گیا ہے۔ بقیہ چھ نشریات مندرجہ ذیل ہیں:

(۱) ادیب اور ادبی تخلیق

(۲) انشاپردازی

(۳) فکر اور جذبہ

(۴) اردو زبان اور اس کا صحیح استعمال

(۵) اردو شاعری میں جدید رجحانات

(۶) محرومؔ کا فی البدیہہ کلام

یہ تمام نشریات ریڈیو کشمیر، سری نگر یا جموں ریڈیو اسٹیشن سے نشر ہوئی ہیں۔ ریڈیو کے اوقات کا لحاظ رکھتے ہوئے آزادؔ نے ان مقالوں میں اختصار سے کام لیا ہے۔

---

[1] آزادؔ۔ نشانِ منزل، ص ۱۷۵۔

ان نشریات کی اہمیت و افادیت سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ آزاد کی تنقید نگاری میں تحقیق کا عنصر بھی شامل ہے۔ وہ تنقید جیسے خشک موضوع کو اپنے اندازِ بیان سے دل کش بنا دیتے ہیں۔ اس لیے عبارتوں میں دل کشی ہر جگہ موجود ہے۔ "نشانِ منزل" کے متعلق ملک زادہ منظور احمد لکھتے ہیں:

> "مجموعی طور پر یہ کتاب ہمارے لیے فکر و نظر کی بہت سی راہیں ہموار کرتی ہے اور مفید اور معلوماتی ہونے کے ساتھ ساتھ بہ حیثیت تنقید نگار جگن ناتھ آزاد کی شخصیت کو ادبی حلقوں میں معتبر اور مستند بنانے میں ممد و معاون ثابت ہوتی ہے۔"[1]

"نشانِ منزل" کے مضامین کے علاوہ آزاد نے اور بہت سے مضامین لکھے ہیں۔ آزاد کے اکثر مضامین اور مقالے کتابوں میں شامل ہو چکے ہیں۔ بعض رسائل و جرائد میں لکچرس کی صورت میں موجود ہیں۔ اقبال کی معنویت، اقبال کا فکر و فن، اقبال کی شاعری اور فلسفہ وغیرہ پر آزاد کے مضامین آزاد کا خاص موضوع ہے جن کا احاطہ اقبالیات کے سلسلے میں پہلے ہی کیا جا چکا ہے۔ "اردو غزل۔ ابتدا و ارتقا" اردو ناول، ترقی پسند تحریک، آغا حشر کاشمیری، رام لال اور نیا افسانہ، حسرت موہانی، منشی پریم چند اور اردو ادب حال اور مستقبل وغیرہ عنوانات پر ان کے مقالے بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ آزاد کثرت سے لکھتے ہیں اور کثرت سے چھپتے ہیں جو کچھ لکھتے ہیں حقیقت میں ڈوب کر لکھتے ہیں۔ ان کی تحریر و تقریر میں علمیت اور ادبیت کی کوئی کمی نہیں۔ خاصی تحقیق اور چھان بین کے بعد آزاد کسی موضوع پر قلم اٹھاتے ہیں۔ جوش ملسیانی، خلیق انجم اور فراق گورکھپوری پر بھی آزاد نے مضامین و مقالے لکھے ہیں۔ خلیق انجم کی زندگی کے کئی واقعات انھوں نے اپنے مضمون میں تحریر کیے ہیں۔

---

[1] ملک زادہ منظور احمد۔ نشانِ منزل، (مشمولہ) جگن ناتھ آزاد۔ حیات اور ادبی خدمات مرتبہ خلیق انجم، ص ۲۵، ۲۶۔

آزاد کے مضامین میں سادگی اور اخلاص ہر جگہ موجود ہے۔

آزاد کی تنقید نگاری میں صرف مثبت پہلو ہے۔ وہ منفی حیثیت سے بہت کم سوچتے ہیں۔ وہ بے لاگ تنقید کرتے ہیں۔ آزاد کی تنقید نگاری میں تقابلی مطالعہ کا زیادہ عمل دخل ہوتا ہے۔ آزاد نے صرف جوش کے کلام پر اپنا دو ٹوک فیصلہ سنایا ہے۔ تنقید کا یہ رجحان ان کے یہاں بہت کم ہے۔

"آنکھیں ترستیاں ہیں" میں آزاد نے جہاں خاکے کھینچے ہیں وہیں کہیں کہیں تنقید و تبصرہ کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ آزاد نے بہت سی اہم شخصیتوں کی حیات اور کارناموں کا ذکر کیا ہے۔ سروجنی نائیڈو کا ذکر کرتے ہوئے نہ صرف ان کی کتابوں کا ذکر کرتے ہیں۔ بلکہ ان پر تنقید و تبصرہ بھی کرتے ہیں۔ اسی طرح جاں نثار اختر کے جہاں حالاتِ زندگی کا ذکر ہے وہیں ان کے فن پر بھی تبصرہ کیا گیا ہے۔ بہر حال یہ بات مسلّم ہے کہ ان اہم شخصیتوں پر تحقیق کرنے کے لیے یہ کتاب یقیناً اہم ہے جن کا ذکر "آنکھیں ترستیاں ہیں" میں موجود ہے۔

"حیاتِ محروم" میں جگن ناتھ آزاد نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ "تنقید و تبصرہ اس کتاب کے اسکوپ میں شامل نہیں تھا۔ یہ کام میرا نہیں ہے اردو کے دوسرے طالب علموں اور معلموں اور نقادوں کا ہے"[۱] مگر اس کے باوجود آزاد نے اپنے والد کے بہت سے نادر اشعار، خطوط اور دستاویز کو اپنی کتاب میں جگہ دی ہے محروم کے کلام پر اپنی رائے بھی لکھی ہے جو کسی تنقید یا تبصرے سے کم نہیں۔

جگن ناتھ آزاد کا اندازِ بیان سادہ اور دل کش ہوتا ہے۔ اسلوب دل فریب ہے کہ اس میں سادگی اور خلوص کا پرتو ہر جگہ برقرار ہے۔ تصنع اور بناوٹ سے کہیں کام نہیں لیتے گفتگو کا سا انداز چاہے وہ تنقیدی مضامین ہوں یا ریڈیائی نشریات یا پھر خاکے یا اقبالیات کا فلسفہ۔ ہر جگہ اندازِ بیان یکساں ہے اور ان کا یہی اسلوب قاری کو تمام کتاب ختم کرنے پر مجبور کرتا ہے۔

○

---

[۱] جگن ناتھ آزاد۔ حیاتِ محروم، ۲۲۹۔

چھٹا باب

جگن ناتھ آزاد بہ حیثیت خاکہ نگار

خاکہ نگاری بھی سوانح نگاری کی طرح شخصیت کی تصویر کشی کرتی ہے۔ عام طور پر خاکہ نگار اپنے ذاتی مشاہدے، تجربات اور تعلقات کی بنیاد پر ہی کسی شخصیت کی سیرت یا کردار کو پیش کرتا ہے۔ مرزا فرحت اللہ بیگ، مولوی عبدالحق اور رشید احمد صدیقی کے خاکے اردو میں بے حد مقبول ہیں۔ بعد کے خاکہ نگاروں میں خواجہ حیدر، شوکت تھانوی، خواجہ حسن نظامی، عبدالماجد دریا بادی، عصمت چغتائی، منٹو اور مالک رام نے بھی بہت اچھے خاکے لکھے ہیں۔ موجودہ میں بھی خاکے لکھے جارہے ہیں۔ مجتبیٰ حسین، شمیم حنفی اور جگن ناتھ آزاد کے خاکے بھی اسی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔ خاکہ نگاری ایک مشکل فن ہے کیونکہ کسی انسان کی سیرت یا کردار کو دیکھنے یا پرکھنے کا معاملہ خاکہ نگار کے صوابدید پر ہی منحصر ہوتا ہے۔ گویا خاکہ نگاری کا آرٹ بصیرت اور بصارت دونوں کا متقاضی ہے۔

جگن ناتھ آزاد کی تصنیف "آنکھیں ترستیاں ہیں" خاکہ نگاری کی ایک عمدہ مثال ہے۔ بقول آزاد "یہ کتاب یادوں کی داستان اور داستانِ حیات ہے"۔ اس کتاب میں بائیس اہم اور عظیم ہستیوں کے خاکے ہیں۔

مولانا تاجور نجیب آبادی، صلاح الدین احمد، ابوالکلام آزاد، عبدالمجید سالک،

صوفی غلام مصطفیٰ تبسم، مولوی عبدالحق، شیخ سر عبدالقادر، سروجنی نائیڈو، عبدالقادر سروری، مہندر ناتھ، سلیمان اریب، محمد دین تاثیر، درگا پرساد دھر، سجاد ظہیر (بنے بھائی)، کرشن چندر، جاں نثار اختر، نریش کمار شاد، حسرت موہانی، پریم ناتھ در، رشید احمد صدیقی اور تلوک چند محروم۔ ان بائیس شخصیتوں کے علاوہ ضمناً کئی اور اہم شخصیتیں بھی متعارف ہوئی ہیں۔ ان کی زندگی کے مختلف پہلو پیش کیے گئے ہیں۔ ان مضامین کا زیادہ تر تعلق خراجِ عقیدت سے ہے اس لیے ان میں عقیدت و احترام ہر جگہ موجود ہے۔

آزاد نے اپنی تصنیف کا نام مصحفی کے اس شعر پر رکھا ہے ؎

وہ صورتیں الٰہی کس دیس بستیاں ہیں
اب جن کو دیکھنے کو آنکھیں ترستیاں ہیں

چنانچہ ایک ملاقات میں راقم الحروف سے آزاد نے اس بات کا ذکر کیا اور کتاب کے نام کے بارے میں مندرجہ بالا شعر پڑھا۔

فنِ خاکہ نگاری میں بہترین خاکے وہ تصور کیے جائیں گے جو خود بھی روشن ہوں اور دوسروں کو بھی روشنی دیں۔ دوسری خوبی خاکوں کی جامعیت ہے۔ آزاد نے جن شخصیتوں کا ذکر کیا ہے وہ یا تو اساتذہ ہیں یا پھر بزرگ ہستیاں اور دوست احباب۔

مولانا تاجور نجیب آبادی، عبدالمجید سالک اور صوفی غلام مصطفیٰ تبسم ان عظیم ہستیوں کا شمار اساتذہ میں ہے۔ مولانا تاجور نجیب آبادی کے بارے میں آزاد کا قول ہے کہ "بالِ جبریل میں نے مولانا سے سبقاً سبقاً پڑھی ہے"۔ اسی طرح صوفی غلام مصطفیٰ تبسم آزاد کو ایم۔ اے میں فارسی پڑھاتے تھے۔ آزاد نے ان سے فارسی اشعار کی تفہیم سیکھی۔ عبدالمجید سالک کے بارے میں آزاد ایک جگہ لکھتے ہیں :

"کراچی کی ملاقاتوں میں علامہ اقبال کا ذکر اکثر سالک صاحب کے ساتھ بات چیت کے دوران میں آیا اور انھوں نے مجھے اقبال کے وہ نادر اور غیر مطبوعہ اشعار سنائے جو اقبال کی مطبوعہ تصانیف

---

[1] آزاد ــ آنکھیں ترستیاں ہیں، ص ۲۰۔

میں موجود نہیں ہیں۔ میں ان نوادرِ اقبال کو جو قبلہ سالک صاحب
کے ذریعے سے مجھ تک پہنچے ہیں آج بھی اپنے سینے سے لگائے
پھرتا ہوں۔ جہاں میں اس بات پر نازاں ہوں کہ آج میری
بیاضیں اقبال کی ان نظموں اور غزلوں سے مملو ہیں جو اقبال
کی مطبوعہ کتابوں میں نہیں ہیں وہاں اس بات پر میری حیرانی
اپنی جگہ بدستور ہے کہ سالک صاحب کو اقبال کا کتنا کلام
زبانی یاد تھا"۔ [1]

"آنکھیں ترستیاں ہیں" کے تقریباً تمام مضامین ان عظیم ہستیوں کی موت کے بعد لکھے گئے ہیں جن کی تصویریں اس کتاب میں پیش کی گئی ہیں اس لیے تمام مضامین میں عقیدت و احترام موجود ہے۔ بقول خواجہ احمد عباس "یہ کتاب آنسوؤں اور قہقہوں کی کتاب ہے"۔ آزاد نے اپنی آہوں اور آنسوؤں کو پی کر اور اپنے انسان دوستی کے جوہر کو کام میں لا کر لکھی ہے"۔ [2]

آزاد ان عظیم ہستیوں کی یاد میں ڈوب جاتے ہیں اور ان کی نیکیوں کو یاد کرتے ہیں۔ مولانا تاجور نجیب آبادی سے آزاد کا رشتہ اُستادی اور شاگردی کا سینتیس ۳۷ سالہ پُرانا ہے۔ اسی طرح مولانا صلاح الدین احمد سے تقریباً ستائیس سالہ رشتہ ہے۔ آزاد نے ان کی غیر موجودگی میں چھ ماہ کے لیے ماہنامہ "ادبی دنیا" کی ادارت کی تھی اور مولانا نے اس کے عوض میں ایک سرٹیفکٹ عطا کیا تھا۔ غرض آزاد نے ان مضامین میں اپنے تعلقات کی یاد کو تازہ کیا ہے اور ساتھ ہی ساتھ ان عظیم ہستیوں کے خاکے بھی کھینچے ہیں۔ مولانا تاجور نجیب آبادی کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"مولانا مرحوم اپنی ذات میں ایک انجمن تھے۔ وہ ایک کثیر الجہت
شخصیت تھے۔ ان کی علمیت، ان کی زباندانی، ان کی اصلاح

---

[1] آزاد ۔ آنکھیں ترستیاں ہیں، ص ۵۷۔
[2] خواجہ احمد عباس ۔ آنسوؤں اور قہقہوں کی کتاب (مشمولہ) سہ ماہی "لمحے لمحے" بدایوں، مرتبہ حبیب سوز، ص ۲۲۷۔

سخن، اصلاحِ نثر، ان کا طنز و مزاح، ان کی کردار نگاری، شاعری، بدیہہ گوئی، نثر نگاری، مکاتیب ان تمام باتوں کا مختصر ذکر کے لیے دفتر درکار ہے"۔ [1]

مولانا عبدالمجید سالک کے بارے میں جو مضمون سپردِ قلم کیا گیا ہے وہ دراصل ایک خط اور تعزیت نامہ ہے جو "بیسویں صدی" (نئی دہلی) کے اڈیٹر خوشتر گرامی کے نام سے لکھا گیا ہے۔ بائیس۲۲ سالہ تعلقات کو آزاد نے چند صفحات میں قید کر لیے ہیں۔ سالک مرحوم کو آزاد نے علامہ اقبال کے جن اشعار سے خراجِ عقیدت پیش کیا ہے اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ آزاد کے یہاں سالک مرحوم کا مرتبہ کیا تھا۔ آزاد نے سالک صاحب کی موت پر "ماتم سالک" مرثیہ بھی لکھا جس میں سالک صاحب کی خوبیوں اور کارناموں کا ذکر کیا گیا ہے۔ آزاد کے مجموعۂ کلام "وطن میں اجنبی"، کا دیباچہ عبدالمجید سالک نے لکھا ہے۔ آزاد اس دیباچہ کو اپنی زندگی کا گراں مایہ تحریر بتاتے ہیں۔

صوفی غلام مصطفیٰ تبسم آزاد کے والد تلوک چند محروم کے دوست تھے اور خود آزاد کے استاد بھی۔ دوسرے اساتذہ کی طرح ان کی بھی بے حد عزت و احترام کرتے۔ آزاد نے ان سے ہی فارسی سیکھی تھی۔ آزاد لکھتے ہیں:

"چند غزلیں انھوں نے اس طرح پڑھائیں کہ فارسی شعر و ادب کا مذاق ہم طالب علموں کے رگ و پے میں رچ بس گیا۔ بعض دفعہ ایک شعر کی تشریح میں سارا پیریڈ صرف ہو جاتا تھا"۔ [2]

"آنکھیں ترستیاں ہیں" میں ایک مقالہ مولوی عبدالحق کے بارے میں بھی ہے آزاد نے اس مضمون کو ان کی زندگی ہی میں لکھا تھا۔ مولوی عبدالحق سے ملاقات کے واقعے کو آزاد نے تفصیل سے بیان کیا ہے۔ عبدالحق کے عادات و اطوار، کام کرنے کے طریقے اور علمی و ادبی کام میں ان کے انہماک جیسے زندگی کے مختلف اور

---

[1] آزاد۔ آنکھیں ترستیاں ہیں، ص ۱۹۔ [2] ایضاً، ص ۶۳۔

متنوع پہلوؤں کو آزاد نے پیش کیا ہے۔ ایک مقام پر لکھتے ہیں :

"ان کی پابندیِ اوقات، ان کی مسلسل محنت، ان کا علی الصباح بیدار ہو کر سمندر کی سیر کو جانا، ان کی کم خوری، یہ تمام باتیں میرے لیے بڑی حیرت کا باعث تھیں"۔ لے

آزاد کی یہ خوش قسمتی ہے کہ انھوں نے عظیم ہستیوں سے نہ صرف ملاقاتیں کیں بلکہ ان سے بہت کچھ اکتسابِ فیض کیا۔ مولوی عبدالحق، سروجنی نائیڈو، ابوالکلام آزاد، گاندھی جی، اندرا گاندھی، راجیو گاندھی جیسی عظیم سیاسی اور ادبی شخصیتوں سے بھی آزاد کو ملنے کا شرف حاصل رہا ہے۔ آزاد کی اس کتاب کا ایک مضمون "سروجنی نائیڈو" ہے۔ سروجنی نائیڈو کی شخصیت سے آزاد بے حد متاثر تھے۔ آزاد نے نائیڈو کے مختصر حالات، عادات و اطوار اور اخلاق ادب بیان کیے ہیں ان کی شاعری کا تنقیدی جائزہ بھی لیا ہے۔

سروجنی نائیڈو اردو ادب سے دل چسپی رکھتی تھیں۔ وہ شاعروں کی سرپرستی اور حوصلہ افزائی کرتی تھیں۔ ان کے کلام کے تین مجموعے ہیں۔ (۱) THE GOLDEN THRESGOLD (سنہری دہلیز)، (۲) THE BERD OF THE TIME (طائرِ وقت)، (۳) THE BROKEN WING (بالِ شکستہ)۔ آزاد کے مضمون میں ان کتابوں پر سیر حاصل تبصرہ موجود ہے۔

مہندر ناتھ اور سلیمان اریب دونوں آزاد کے دوست ہیں اور یہ دونوں کم عمری میں انتقال کر گئے۔ مہندر ناتھ کرشن چندر کے بھائی اور ایک اچھے افسانہ نگار تھے۔ ان دونوں کے خاکے انتہائی مختصر ہیں۔ آزاد کے خاکوں کے متعلق ولی احمد ولی لکھتے ہیں :

"آزاد کے تجربات و مشاہدات میں جو قلمونی اور رنگارنگی ہے وہ خاکہ نگاری کے تمام نشیب و فراز سے بہ خوبی واقف اور آگاہ ہیں ان کا سب سے بڑا وصف یہ ہے کہ انھوں نے جس طرح اور جیسا دیکھا

لے آزاد۔ آنکھیں ترستیاں ہیں، ص ۷۵۔

اور محسوس کیا ہے اسی طرح برتا اور پیش کیا ہے۔ ان کے تمام خاکوں
میں ان کا خلوص، جذبے کی طہارت و پاکیزگی، احساسات کی شگفتگی
اور بے پناہ عقیدت و شیفتگی کی آئینہ سامانی موجود و موجزن ہے
جانبداری کا کہیں ہلکا سا شائبہ بھی نہیں دکھائی دیتا۔"[۱]

مقالہ "جاں نثار اختر" اختر کی زندگی میں لکھا گیا۔ یہ مقالہ فن اور شخصیت کے جاں نثار اختر نمبر میں بھی شائع ہوا ہے۔ اس کا تیسرا حصّہ دو یا تین منٹ کی تقریر ہے۔ اس مقالے کے پہلے حصّے میں اختر کے حالاتِ زندگی اور دوسرے حصّے میں ان کے فن کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اس کتاب کا آخری مضمون "مرحوم میرے والد" ہے۔ اس کا ابتدائی حصّہ مرحوم کی زندگی میں ہی لکھا گیا تھا اور ایک مکمل مقالے کی صورت میں "نقوش" لاہور کے شخصیات نمبر میں شائع بھی ہوا۔ اس کا آخری حصّہ مرحوم کے انتقال کے بعد ماہنامہ "صبح" دہلی، کے لیے لکھا گیا۔ آزاد نے اپنے اس مقالے میں شروع سے آخر تک ترمیم و اضافہ کیا ہے۔

آزاد زبان و بیان کے معاملے میں بے حد محتاط ہیں ان کے ہاں طنز والی بات نہیں ہے ان کا مزاج سلجھا ہوا ہے۔ ان کے مزاج میں سنجیدگی ہے اور طرزِ تحریر میں بھی سنجیدگی کی جھلک موجود ہے۔ ان کے خاکوں میں لب و لہجہ تاثراتی ہو گیا ہے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ آزاد ان شخصیات سے کسی نہ کسی طور متاثر ضرور ہیں ان میں اساتذہ، بزرگ اور دوست احباب ہیں جب کہ آزاد کی فطرت یہ ہے کہ وہ اپنے دوست احباب کا ذکر بھی بڑی احتیاط سے کرتے ہیں۔ وہ ان باتوں کا ذکر زبان یا دماغ میں بھی لانا پسند نہیں کرتے جن سے بدمزگی پیدا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے خاکوں میں کہیں تلخی نہیں ہے۔ ڈاکٹر سلیم اختر لکھتے ہیں؛

"آنکھیں ترستیاں ہیں، کے بائیس سوانحی مضامین دراصل وہ آئینے
ہیں جن میں آزاد اپنی فطرت کے بہترین عناصر کی امداد سے اپنے

---

[۱] ولی احمد ولی۔ "جگن ناتھ آزاد۔ ایک خاکہ نگار" (مشمولہ) ماہنامہ "العطش" جگن ناتھ آزاد نمبر جنوری تا اپریل ۱۹۸۶ء، ص ۴۵، ۴۶۔

دوستوں اور بزرگوں کی یادوں کی محبت بھرے مرقعے سجائے ہیں۔"[1]

آزاد کے خاکوں میں صداقت اور سچائی ہے۔ انھوں نے کسی تصنع اور بناوٹ کے بغیر اپنی بات پیش کر دی ہے۔ آزاد کے خاکوں میں خود ان کی زندگی کے بہت سے پہلو عیاں ہے۔ ان خاکوں میں ادبی شخصیتوں کے علمی و ادبی زندگی کو بھی پیش کیا گیا ہے جس سے تحقیق کے دروازے کھلتے ہیں۔ آزاد کے خاکوں میں اسلوب اور بیان سیدھا سادا ہے۔ یہی سادگی خاکوں کی جان ہے۔ آزاد نے اپنے تاثرات و تجربات کو من و عن پیش کر دیا ہے۔ پروفیسر عبد المغنی آزاد کے خاکوں کے بارے میں لکھتے ہیں :

"ان خاکوں کی عمارت قیاسیات اور تصورات پر نہیں، تجربات و تاثرات پر مبنی ہیں اس لیے ان میں حقیقت کی جھلک ہے اور انھیں پڑھتے ہوئے ہم زندہ انسانوں سے ملتے ہیں مل کر خوش ہوتے ہیں۔ زندگی کا حوصلہ پاتے ہیں اور کچھ سیکھتے ہیں۔ پروفیسر جگن ناتھ آزاد کے لکھے ہوئے خاکے اردو خاکہ نگاری میں اضافہ کرتے ہیں اور خود مصنف کی ادبی شخصیت کا ایک نیا گوشہ پیش کرتے ہیں۔"[2]

آزاد نے بائیس ۲۲ ایسی شخصیتوں کا انتخاب کیا ہے جو ادبی و علمی دنیا میں زندہ جاوید ہو گئے ہیں۔ ایسی شخصیتوں پر قلم اٹھا کر آزاد نے ایک طرف اردو زبان پر احسان کیا ہے تو دوسری طرف خود ان کے خاکے اور ان کی شخصیت کو نئی زندگی عطا ہو گئی ہے۔

آزاد نے اپنے خاکوں میں جہاں دوسروں کی زندگی کے خاکے کھینچے ہیں وہیں ان کی شخصیت کے کئی پہلو کھل کر ہمارے سامنے آ گئے ہیں۔ اس طرح ان کی یادوں کی داستان میں آپ بیتی کی جھلک بھی موجود ہے۔ آزاد نے اپنی آٹھ پسلیوں کے ٹوٹ جانے کا ذکر اسی کتاب میں کیا ہے۔ ام الخبائث یعنی شراب نوشی کا ذکر کرتے ہوئے ایک جگہ لکھتے ہیں :

۱؎ ڈاکٹر سلیم اختر۔ "جگن ناتھ آزاد اور شخصیت نگاری" (مشمولہ) سہ ماہی "لمحے لمحے" بدایوں، ۱۹۸۸ء۔ ص ۳۳۷، مدیر حبیب سوز۔

۲؎ پروفیسر عبد المغنی۔ "آنکھیں ترستیاں ہیں" (مشمولہ) سہ ماہی "لمحے لمحے" بدایوں ۱۹۸۸ء، ص ۳۳۹۔

"اس سفر میں میں نے محسوس کیا کہ ادیب ام الخبائث کی جانب کچھ زیادہ ہی مائل ہیں۔ میں ۱۹۴۸ء تک جوش صاحب کی رفاقت میں آنے سے قبل اس شے سے نا آشنا تھا لیکن اس رفاقت کے بعد بھی ام الخبائث کے دام میں بہت زیادہ گرفتار ہونے کی نوبت نہ آئی"۔[۱]

کرشن چندر کے مضمون میں آزاد نے اس بات کا انکشاف کیا ہے کہ ایک زمانے میں اپنی نوکری سے بیزار ہو گئے تھے اور فلمی دنیا سے وابستہ ہو جانا چاہتے تھے مگر کرشن چندر کے مشورے سے باز آ گئے اور نوکری سے استعفیٰ پیش نہیں کیا۔ آزاد کا پہلا کلام "ادبی دنیا" لاہور میں شائع ہوا۔ آزاد کی یہ پہلی غزل تھی جو شائع ہوئی تھی۔ مولانا صلاح الدین احمد کی غیر موجودگی میں آزاد نے "ادبی دنیا" کی ادارت کی۔ جس کو صلاح الدین احمد صاحب نے کافی سراہا اور سند بھی پیش کی۔ اسی طرح آزاد کا "ترانۂ پاکستان" ۱۴ اگست کو بارہ بجے رات ریڈیو پاکستان سے نشر کیا گیا۔ یہ پاکستان کا پہلا ترانہ تھا۔ ان سب باتوں کا ذکر آزاد کی اس کتاب "آنکھیں ترستیاں ہیں" میں موجود ہے۔ آزاد کی زندگی کے واقعات ایسے ہیں جن کا ذکر آزاد نے اپنی "آپ بیتی" میں بھی نہیں کیا ہے۔ آزاد کی زندگی ان شخصیات کے ساتھ کچھ اس طرح شامل ہو گئی ہے کہ اس سے جہاں آزاد کی زندگی پر روشنی پڑتی ہے وہیں ان شخصیتوں کے خاکوں میں صداقت اور سچائی نمایاں نظر آنے لگتی ہے۔

شخصیت نگاری یا خاکہ نگاری کے فن میں آزاد کی اگرچہ ایک ہی تصنیف ہے مگر جب ہم مجموعی طور پر ان کی تمام کتابوں کا جائزہ لیتے ہیں تو ان کی تحریروں میں کئی مقام پر خاکہ نگاری کا عکس نظر آتا ہے۔ مثلاً "میرے گزشتہ روز و شب" اور بہ سلسلہ روز شب (غیر مطبوعہ وغیرہ) ان دونوں کتابوں میں جگہ جگہ خاکہ نگاری کی جھلک موجود ہے۔ اختر شیرانی کا ذکر کرتے ہوئے آزاد لکھتے ہیں:

---

[۱] آزاد۔ آنکھیں ترستیاں ہیں، ص ۱۱۷۔

"ایک دن کا ذکر ہے میں استاد محترم مولانا تاجور کی خدمت میں حاضر ہوا کیا دیکھتا ہوں مولانا اختر کو ڈانٹ رہے ہیں اور اختر رو رہے ہیں۔ اُس وقت تو میں نہ سمجھا لیکن بعد میں پتا چلا کہ یہ جھوٹ موٹ کا رونا تھا۔"[1]

اس کے بعد اختر صاحب کی زندگی کے کئی واقعے پوری تفصیل سے درج ہے۔ شراب کی عادت نے اس کو کس طرح مجبور اور بے بس بنا دیا تھا۔ وغیرہ۔

آزاد نے اپنی آپ بیتی میں جہاں کہیں مشاعروں کا ذکر کرتے ہیں وہیں جوش کے بارے میں ضرور لکھتے ہیں۔ آزاد کی جوش کے ساتھ رفاقت تقریباً دس سال پر مشتمل ہے اس لیے جوش کی زندگی کے کئی پہلو اجاگر ہوتے ہیں۔ اس طرح جگہ جگہ خاکوں کی جھلک نظر آتی ہے۔ آزاد کے دونوں خود نوشت سوانح میں عمدہ خاکوں کی جھلک موجود ہے جن میں چٹکلے اور لطیفے بھی شامل ہیں۔

آزاد کا ایک مضمون "خلیق انجم۔ ایک عملی انسان" بھی ہے۔ جس میں آزاد نے خلیق انجم کی بذلہ سنجی کا ذکر کیا ہے۔ آزاد اور خلیق انجم ایک دوسرے کے دوست اور ساتھی ہیں۔ اکثر و بیشتر ایک ساتھ سفر کرتے ہیں۔ دونوں کے مزاج میں کئی باتوں میں یکسانیت ہے۔ آزاد نے اپنے مضمون میں خلیق انجم صاحب کی زندگی کے کئی پہلو کو اجاگر کیا ہے خاص طور پر ان کی ظرافت اور بذلہ سنجی کا ذکر ہے۔ خلیق انجم صاحب نے کم ہی سہی اشعار کہے ہیں۔ اس تعلق سے آزاد لکھتے ہیں؛

"خلیق انجم کہتے ہیں کہ وہ شاعر نہیں لیکن ہزاروں خراب شعر کہنے والا کوئی شخص اگر شاعر کہلا سکتا ہے تو ایک شعر اچھا کہنے والا شاعر ہونے سے کیسے انکار کر سکتا ہے۔ بالخصوص جب اس نے دو چار ہی شعر کہے ہوں اس صورت میں اس پر خراب شعر کہنے کا الزام بھی تو

---

[1] جگن ناتھ آزاد۔ بہ سلسلہ روز و شب۔ غیر مطبوعہ، ص ۶۹۔

نہیں آسکتا"[۱]

پھر اس کے بعد آزاد نے خلیق انجم کے شعار نقل کیے ہیں۔

جامع مسجد پر مولانا سمیع اللہ کی دُکان پر کچھ ادیب اور شاعر بیٹھے تھے فراق کا ذکر ہو رہا تھا کسی نے کہا کہ فراق کا پورا نام رگھو پتی سہائے ہے۔ خلیق انجم نے فوراً چار مصرعے کہے ؎

کب وہ آنسو بہائے تھے یارو	کب وہ دل کو جلائے تھے یارو
ورنہ وہ تو سہائے تھے یارو[۱]	اس کو اردو نے کردیا ہے فراق

اسی طرح آزاد نے برج پریمی کی زندگی کا بھی ایک مختصر سا خاکہ پیش کیا ہے۔ جس میں علمی و ادبی صلاحیتوں کا ذکر کثرت سے ہے[۲]

جگن ناتھ آزاد کے تا حال تین سفرنامے منظرِ عام پر آچکے ہیں۔ ان سفرناموں میں بھی مرقع نگاری کی جھلک کہیں کہیں نظر آتی ہے جس کا ذکر آگے سفرناموں کے باب میں کیا گیا ہے۔

۱؎ جگن ناتھ آزاد۔ "ڈاکٹر خلیق انجم۔ ایک عملی انسان" (مشمولہ) "ڈاکٹر خلیق انجم شخصیت اور ادبی خدمات" ماہنامہ "کتاب نما" جون ۱۹۹۱ء، مرتبہ ایم۔ حبیب خاں، ص ۸، ۱۰۔

۲؎ آنند ڈائجسٹ، نومبر ۱۹۹۳ء، ص ۳۱۔

ساتواں باب

جگن ناتھ آزاد بہ حیثیت سوانح نگار

دیگر اصناف کی طرح سوانح نگاری بھی ادب کی ایک شاخ ہے۔ سوانح نگاری فرد کی پیدائش سے لے کر موت تک کے خارجی حالات کے ساتھ ساتھ داخلی کوائف کے بیان پر مشتمل ہوتی ہے۔ سوانح نگار حقائق کا ذکر دلکش پیرائے میں کرتا ہے۔ ایک طرف وہ موضوع، مواد اور اسلوب کی طرف توجہ دیتا ہے تو دوسری طرف شخصیت کے نہاں خانوں کی نقاب کشائی بھی کرتا ہے۔ سوانح نگار کو دانش مندی، دیانتداری اور غیر جانب داری سے کام لینا پڑتا ہے۔ سوانح نگار عام طور پر ایسی شخصیتوں کا انتخاب کرتا ہے جنھیں وہ پہچانتا ہے یا جن سے عقیدت رکھتا ہے۔ باپ، بیٹا، استاد، شاگرد، مذہبی یا روحانی تعلق کی بنا پر بھی سوانح نگار قلم اٹھانے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

اردو کے ممتاز شاعر تلوک چند محروم کے فرزند پروفیسر جگن ناتھ آزاد نے جو خود بھی ماہر اقبالیات، شاعر، نقاد اور ادیب ہیں، اپنے والد کی شخصیت اور فن پر ایک مبسوط اور جامع کتاب لکھی ہے۔ یہ کارنامہ ایک شاعر کے عظیم سپوت نے انجام دیا ہے۔ اس کتاب کی تصنیف و اشاعت کے متعلق خلیق انجم لکھتے ہیں:

"بہت عرصہ ہوا انجمن ترقی اردو (ہند) کے جنرل سکریٹری پروفیسر

آل احمد سرور نے پروفیسر جگن ناتھ آزاد سے فرمائش کی تھی کہ وہ محروم پر ایک ایسی جامع کتاب لکھ دیں جس میں محروم کے سوانح بھی ہوں اور ان کے علمی و ادبی کارناموں کا جائزہ بھی لیا گیا ہو۔ اس فرمائش کے دو پہلو تھے۔ ایک پہلو تو یہ تھا کہ بیٹے سے یہ درخواست کرنا کہ وہ اپنے باپ کے بارے میں لکھے، خطرے سے خالی نہیں ہوتا کیونکہ باپ کی محبّت اور عقیدت حق گوئی میں آڑے آجاتی ہے۔ عین ممکن ہے کہ بیٹا اپنے باپ کو ایک عظیم انسان اور عظیم فن کار ثابت کرنے کے لیے ایسے واقعات بیان کرے جن کا حقیقت سے کوئی تعلق نہ ہو۔ دوسرا پہلو یہ تھا کہ بیٹا باپ کے بارے میں جتنی واقفیت رکھتا ہے اتنا کسی دوسرے کو حاصل ہونا مشکل ہوتی ہے۔ پھر پروفیسر جگن ناتھ آزاد جیسا بیٹا جو ادیب بھی ہے، شاعر بھی ہے اور ہمارے عہد کے صفِ اوّل کے ماہرینِ اقبالیات میں شامل بھی ہیں تو اس سے زیادہ اور کوئی انصاف نہیں کر سکتا۔ میں سمجھتا ہوں کہ سُرور صاحب نے بہت صحیح فرمائش کی تھی"۔ [1]

آزاد کے لیے یقیناً یہ بڑا مشکل مرحلہ رہا ہوگا کیونکہ ایک طرف والد سے محبّت و عقیدت کا معاملہ ہے تو دوسری طرف حقائق اور فن کے تقاضے، خاص طور پر جگن ناتھ آزاد کے لیے جو اپنے والد کا ذکر تو کجا، دوست احباب کا نام بھی بہت اہتمام سے لیتے ہیں۔ آزاد کو اپنے والد سے بہت محبّت اور پیار ہے۔ وہ اپنے والد کے ذکر کو باعثِ فخر اور عزت سمجھتے ہیں۔ چنانچہ والد کی سوانح کی دشواریوں کے متعلق آزاد لکھتے ہیں:

---

[1] ڈاکٹر خلیق انجم۔ حرفِ آغاز (مشمولہ) "جگن ناتھ آزاد۔ حیاتِ محروم"، ص ۱۱۔

"سوانح حیات لکھنا بڑی ذمہ داری کا کام ہے۔ سوانح نگار کے لیے افراط و تفریط سے بچتے ہوئے ایک جچا تُلا اندازِ فکر اور متوازن بیان اختیار کرنا خاصا مشکل کام ہے۔ کیونکہ قدم قدم پر اپنی پسند ناپسند اور اپنے تعصّبات، مصنف کو صراطِ مستقیم سے ہٹانے کے لیے موجود رہتے ہیں۔ اور جب سوانح نگار اپنے کسی عزیز و اقارب یا بزرگ کے بارے میں لکھ رہا ہو تو اس مشکل میں اور اضافہ ہو جاتا ہے کیونکہ اسے پتا ہی نہیں چلتا کہ وہ اپنے بزرگ یا عزیز یا رشتہ دار کے متعلق تعریف و توصیف میں مبالغے اور غلط کے کس مقام تک پہنچ گیا ہے۔ اور جب بیٹا اپنے باپ کے بارے میں لکھ رہا ہو تو اس عدمِ توازن کا امکان اور زیادہ ہو سکتا ہے"[1]

سر سیّد سے قبل سوانح عمریاں عام طور پر ایک یادگار یا تاریخ کے طور پر لکھی جاتی تھیں۔ سر سیّد نے سوانح نگاری میں حقائق نگاری کو اپنا شعار بنایا۔ انھوں نے اپنے نانا فرید الدین کے حالاتِ زندگی کو "سیرتِ فریدیہ" کے نام سے پیش کیا۔ اس کتاب میں فرید الدین کے حالات کے علاوہ ان کی دختر عزیز النسا، یعنی سر سیّد کی والدہ محترمہ کے حالات بھی قلم بند ہیں۔

حالی نے پانچ سوانح عمریاں لکھیں جن میں تین زیادہ مشہور ہوئیں۔ یادگارِ غالب، حیاتِ جاوید اور حیاتِ سعدیؒ۔ حالی غالب کے شاگرد تھے۔ غالب سے خاصا عقیدہ بھی تھا۔ اسی طرح سر سیّد سے حالی کے ذاتی تعلقات تھے۔ وہ سر سیّد کے کارناموں سے بے حد متاثر تھے، جن کا ذکر انھوں نے "حیاتِ جاوید" میں کیا ہے۔ "حیاتِ سعدی" لکھنے کی وجہ حالی کا سعدیؒ سے روحانی قربت ہے۔ شبلی کی سب سے پہلی سوانحی تصنیف "المامون" ہے۔ یہ سوانح کم اور تاریخ زیادہ ہے۔ ان کی دوسری

---

[1] جگن ناتھ آزاد۔ حرفِ اول (مشمولہ) حیاتِ محروم، ص ۱۲۔

تصنیف "سیرۃ النعمان" ہے جس میں امام ابو حنیفہؒ کی زندگی کے حالات کے علاوہ اُن کے تصانیف نیز دینی و علمی مرتبے کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے۔

دورِ جدید میں سوانح عمریوں کی دو قسمیں ملتی ہیں۔ ایک کا رشتہ حالی اور شبلی اور ان کے شاگردوں سے جا ملتا ہے جبکہ دوسرے قاضی عبدالغفار، عبدالماجد دریابادی، ابوسعید قریشی، عبدالمجید سالک اور صالحہ عابد حسین کے نقشِ قدم پر چلتے ہیں۔

دوسری قسم کی سوانح عمریاں ہیرو کی زندگی کے حوادث و علائق کے پس منظر میں اس کے نفسیاتی اور ذہنی وجود کا سراغ لگانے کی کوشش کرتی ہیں۔ آزاد کی سوانح عمری دوسری قسم سے تعلق رکھتی ہے۔ انھوں نے حسب نسب آبا و اجداد گنانے کی بجائے سب سے پہلے تاریخی، سماجی اور سیاسی پس منظر کا جائزہ لیا ہے۔ محرومؔ کے علمی کارناموں کو صفحۂ قرطاس پر بکھیرنے کے لیے وہ زیادہ تر بیاضوں، خطوط، شاعری اور کتابوں کے اقتباسات کا سہارا لیتے ہیں۔ حالاں کہ آزاد اپنے والد سے ذاتی طور پر بھی اچھی طرح واقف ہیں۔ آزاد نے اپنے والد سے بہت کچھ سیکھا سمجھا۔ ان سب کے باوجود وہ بے حد محتاط ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ زبانی اقوال سے حد درجہ انھوں نے اجتناب کیا ہے۔

"حیاتِ محروم" میں اپنے والد کا ذکر کرتے ہوئے آزاد لکھتے ہیں: "والدِ محترم کی داستانِ حیات کوئی اَسّی برس کی مدّت پر پھیلی ہوئی ایک ادبی داستان ہے۔[1] محرومؔ نے اپنی پوری زندگی ادب کے لیے وقف کر دی تھی غالباً اس لیے آزاد نے ان کی زندگی "ادبی داستان" کہا ہے۔

"حیاتِ محروم" میں آزاد نے صداقت نگاری سے کام لیا ہے۔ کتاب میں محرومؔ کے حالاتِ زندگی اور علمی کارناموں کے علاوہ ان کی شاعری کے محاسن بتائے گئے ہیں۔ جہاں تک تنقید و تبصرہ کا تعلق ہے، آزاد لکھتے ہیں؛

"والدِ محترم کی داستانِ حیات میں بیان کر چکا۔ یہی اس کتاب کا مقصد تھا۔ تنقید و تبصرہ اس کتاب کے اسکوپ میں شامل ہی نہیں

---

[1] جگن ناتھ آزاد۔ "ابتدائیہ" (مشمولہ) حیاتِ محروم، ص ۱۳۔

تھا۔ یہ کام میرا نہیں ہے اردو کے دوسرے طالب علموں، معلّموں اور نقّادوں کا ہے"۔ [1]

سوانح حیات کی بنیاد احساسات اور جذبات پر ہوتی ہے۔ یہ احساسات اور جذبات اس کتاب میں ہر جگہ موجود ہیں۔ آزاد واقعات کے انتخابات میں انتہائی محتاط دکھائی دیتے ہیں۔ انھوں نے اس کتاب کی تصنیف میں خاصی محنت و جانفشانی سے کام لیا ہے۔

محروم یکم جولائی ۱۸۸۷ء کو عیسیٰ خیل کی تحصیل میں موضع نور زماں شاہ میں پیدا ہوئے۔ یہ گاؤں دریائے سیلاب کی وجہ سے بار بار اُجڑتا تھا اور بار بار آباد ہوتا تھا۔ شاعری میں محروم نے کسی کی شاگردی قبول نہیں کی۔ البتہ غالب اور ذوق کے دواوین کو خوب پڑھا اور بچپن ہی سے شاعری شروع کر دی تھی۔ دریائے سندھ سے خاص لگاؤ تھا۔ وہ ایک وطن پرست اور سیکولر انسان تھے۔ اقبال، اکبر اور سر عبدالقادر جیسی شخصیتوں نے محروم کی شاعری کو سراہا اور تعریف کی۔ آزاد لکھتے ہیں:

"۱۹۰۸ء میں جب اقبال یوروپ سے ہندوستان واپس آئے تو آپ نے اپنی نظم ؎

آنا ترا مبارک یوروپ سے آنے والے
احباب منتظر کو صورت دکھانے والے

کہہ کر ان کا استقبال کیا۔ محروم کی شاعری کے بارے میں اقبال ایک خط میں لکھتے ہیں:

"آپ کی نظمیں "مخزن" میں پڑھتا رہتا ہوں۔ ماشاءاللہ خوب طبیعت پائی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ تھوڑے عرصے میں تمام شعر کہنے والوں میں آپ کا نمبر اوّل ہوگا"۔ [2]

اکبر نے اپنی رباعی میں محروم کی شاعری کو داد و تحسین عطا کی ہے۔ سر عبدالقادر نے بھی محروم کی نظموں کو پسند کیا اور خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔ آزاد نے محروم کے حالات

---

[1] جگن ناتھ آزاد۔ حیاتِ محروم، ص ۲۲۹۔ [2] ایضاً، ص ۳۱۔

وشاعرانہ زندگی کو خاصی تفصیل کے ساتھ پیش کیا ہے۔ محروم کی شاعری کے ساتھ ساتھ ملک اور اس عہد کے سیاسی وسماجی حالات کا بھی ذکر کرتے ہیں۔

محروم کا پہلا مجموعۂ کلام "گنجِ معانی" ہے جس کو آزاد نے ہی مرتب کیا تھا۔ "گنجِ معانی" کا تیسرا ایڈیشن بھی شائع ہو چکا ہے۔ اس کے علاوہ "رباعیاتِ محروم"، "کاروانِ وطن"، "نیرنگِ معانی" اور "شعلہ نوا" محروم کے کلام کے دیگر مجموعے ہیں۔ آزاد نے ان میں سے بیشتر کا دیباچہ اور تعارف تحریر کیا ہے۔ "بہارِ طفلی" بچوں کی نظموں کا مجموعہ ہے۔ ان مجموعوں کے علاوہ انھوں نے بہت سی نظموں کا ترجمہ بھی کیا ہے۔

بیوی کی موت، پھر اس کے بعد جوان بیٹی ودیا کی خودکشی اور پھر دو برس کی بیٹی شکنتلا کی موت نے محروم کی شاعری میں رنج وغم کے عناصر شامل کر دیے۔ انھوں نے بہت سے شخصی مرثیے لکھے۔ "کلامِ محروم" کے دیباچے میں محروم لکھتے ہیں:

"اس مجموعہ (حصۂ سوم) کے آخری حصّے کو میں نے "طوفانِ غم" کے نام سے موسوم کیا ہے اور اس سے موزوں تر نام میرے خیال میں نہیں آسکتا کیونکہ یہ تمام نظمیں بحالت اشک ریزی میرے دل سے نالۂ موزوں بن کر نکلیں اور اس سانحۂ تاب شکن کی یادگار ہیں جسے میں صفحۂ دل سے محو کرنا نہیں چاہتا۔" [۱]

محروم کی رفیقۂ حیات اور ودیاوتی کی موت پر لکھے گئے دونوں مرثیے انتہائی دل گداز اور درد انگیز ہیں۔ ودیاوتی کی موت پر محروم لکھتے ہیں:

اے قتیلِ خنجرِ رنج وملال   تھا اگر تیرے لیے جینا محال
کیوں نہ لکھا مجھ کو اپنے دل کا حال   کیوں نہ آیا دل میں تیرے یہ خیال

تیرے دل سے آہ اے جانِ پدر
مٹ گیا میری محبت کا اثر

---

[۱] جگن ناتھ آزاد - حیاتِ محروم، ص ۵۸۔

ودیا نے خودکشی سے پہلے اپنے والد کو اپنے دکھ درد کے بارے میں کچھ نہیں لکھا اور نہ ہی کسی اور کو کچھ بتایا۔ آزاد کہتے ہیں: ”سسرال میں ایک جھگڑے کی بنا پر کپڑوں پر تیل چھڑک کر اپنے آپ کو آگ لگادی“۔ نہ جانے وہ کون سی مجبوری تھی جس نے اپنی بپتا اور مصیبت اپنے باپ کو بھی سنانے پر آمادہ نہ کیا۔ محرومؔ نے دوسری شادی کی تھی۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ ودیا نے اپنے والد کو اپنی مشکلات سے آگاہ نہ کیا۔

آزاد اپنے والد کے حالاتِ زندگی سے ہر طرح واقف ہیں۔ وہ خود بھی شاعر، ادیب اور نقّاد ہیں اس لیے ان سے بہتر محرومؔ کے حالاتِ زندگی کے بارے میں کوئی اور کیا لکھ سکتا ہے۔ مگر آزادؔ نے گھریلو زندگی کے حالات کو تفصیل سے نہیں پیش کیا۔ ہر جگہ عقیدت و احترام کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔

کسی بھی بڑے انسان کی سوانح عمری تنہا اس کی سوانح عمری نہیں ہوتی اس سے وابستہ بہت سے افراد اور اشخاص بھی اپنے ذہن اور زندگی کے اعتبار سے اس میں شریک ہوتے ہیں۔ چنانچہ ”حیاتِ محروم“ میں بھی اکبر الہ آبادی، شیخ سر عبدالقادر اور اقبالؔ کے علاوہ پیارے لال شاکر میرٹھی، محمد جان بیرسٹر، سرور جہان آبادی، دیا نرائن نگم، نادر کاکوی، اور منشی ونایک پرشاد، طالب بنارسی وغیرہ کے کلام و حالات کا بھی پتا چلتا ہے۔ مولانا حسرتؔ موہانی، گرامی، چکبست اور حفیظ کی شاعری کے علاوہ ان کی محرومؔ سے وابستگی کا بھی ذکر اس کتاب میں کیا گیا ہے۔

”حیاتِ محروم“ کے علاوہ آزاد کی یہ تین سوانح عمریاں اقبالؔ کے متعلق ہیں۔ (۱) اقبال کی کہانی (۲) اقبال زندگی شخصیت اور شاعری (۳) محمد اقبال ایک ادبی سوانح حیات۔ یہ تینوں کتابیں ایک سلسلے کی تین کڑیاں ہیں۔ مذکورہ کتابوں کے بارے میں آزادؔ لکھتے ہیں:

> ”اقبال کی کہانی‘ اور ’اقبال: زندگی شخصیت اور شاعری‘ کے بارے میں مجھے یہ کہنا ہے کہ یہ کتابیں بالترتیب ترقی اردو بورڈ (منسٹری آف ایجوکیشن) این سی آر ٹی کی فرمائش پر مخصوص

عمر کے طالب علموں کے لیے لکھی گئی ہیں۔ اول الذکر کتاب نو سے
چودہ سال کے طلبہ کے لیے ہیں اور ثانی الذکر چودہ سے اٹھارہ
سال کی عمر کے طلبہ کے لیے۔ ان دو کتابوں کا اصل موضوع اقبال
کی زندگی ہے جسے میں نے ان بچوں کی عمر کو پیش نظر رکھتے ہوئے
آسان زبان میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے"۔ [1]

"محمد اقبال ایک ادبی سوانح حیات" کے بارے میں آزاد لکھتے ہیں:

"مذکورہ کتابیں لکھنے کے بعد مجھے خیال آیا کہ اقبال کی ایک مختصر
سی سوانح حیات مجھے اس قاری کے لیے بھی لکھنا چاہیے جو اٹھارہ
سال کی عمر سے آگے نکل چکا ہے یعنی ایک عام قاری کے لیے۔
چنانچہ زیر نظر کتاب میں نے اپنی اس خواہش کے پیش نظر
لکھی ہے"۔ [2]

آزاد نے "اقبال کی کہانی" کو انتہائی مختصر طور پر اور کہانی کے انداز میں پیش
کیا ہے۔ بچوں کے مزاج کے اعتبار سے اقبال کی نظمیں بھی شامل ہیں۔ یہ کتاب
طلبہ کے لیے بہت مفید ہے۔ اقبال کے آبا و اجداد، تعلیم و تربیت، یورپ کا
سفر، شاعری، شگفتہ مزاجی، خودداری اور دیانت داری غرض مختلف پہلوؤں
سے اقبال کے بارے میں سیدھی سادی زبان میں مفید معلومات فراہم کی گئی ہیں۔
غیر مطبوعہ کلام سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔ بچوں کے لیے آزاد نے جو نظمیں منتخب
کی ہیں۔ وہ بھی انتہائی اہم ہیں۔ مثلاً "بچے کی دعا، ہمدردی، ماں کا خواب' ایک
گائے اور بکری، ایک مکڑا اور مکھی' اور ایک پہاڑ اور گلہری' وغیرہ۔

آزاد کی دوسری کتاب "اقبال: زندگی شخصیت اور شاعری" بھی سیدھی
سادی اور عام فہم زبان میں ہے۔ طلبہ و طالبات کی عمر کا لحاظ رکھتے ہوئے اقبال کی

---

[1] جگن ناتھ آزاد۔ محمد اقبال ایک ادبی سوانح حیات، ص ۱۳۔ [2] ایضاً، ص ۱۳۔

شخصیت عادات واطوار، تعلیم اور ان کی شاعری کا طالب علموں کے لیے سرسری مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ "اقبال کی کہانی" سے زیادہ تفصیل اس کتاب میں موجود ہے۔

آزاد کی تیسری تصنیف "محمد اقبال ایک ادبی سوانح حیات مذکورہ" دونوں کتابوں سے زیادہ مفصل ہے۔ اس کتاب کے پانچ حصے ہیں۔ پہلے حصے میں بچپن، تعلیم و تربیت، خاندان اور لڑکپن وغیرہ کا ذکر ہے۔ دوسرے حصے میں اقبال کی جوانی، لاہور کی زندگی، شاعری کی ابتدا اور مختصراً کالج کا ذکر کیا گیا ہے۔ تیسرے حصے میں یورپ کی زندگی، انگلستان اور جرمن کے واقعات بھی بیان کیے گئے ہیں۔ چوتھے حصے میں انگلستان سے واپسی کا ذکر ہے۔ یہ اقبال کی زندگی کے بیس سالہ دور پر محیط ہے۔ دوسری اور تیسری شادی کا ذکر اور ملازمتوں کا ذکر بھی موجود ہے۔ پانچویں حصے میں آخری آٹھ برس کا ذکر ہے۔ علامہ اقبال کا سیاست سے دل چسپی لینا، سفر افغانستان کے بعد علالت اور ان کے انتقال کے ساتھ کتاب ختم ہوتی ہے۔

اقبال کے پیغام کو عام کرنے میں آزاد کا بہت بڑا حصہ ہے۔ آزاد نے اقبال کی سوانح میں اس کی صحیح تاریخ پیدائش کا تعین کیا ہے۔ آزاد روایتی طرزِ فکر کے حامل اور لکیر کے فقیر نہیں ہیں۔ وہ اپنے انداز میں سوچتے اور تحقیق کرتے ہیں۔ ان کے سوچنے کا انداز معروضی ہے۔ راج بہادر گوڑ نے بھی آزاد کی تحقیق کی ستائش کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں: "آزاد نے اپنی ان کتابوں میں بہت سی باتوں پر سے پردہ اُٹھایا ہے جن سے عام قاری یا ہم جیسے قاری ناواقف تھے۔"[1] ڈاکٹر مظفر حنفی اس کتاب کے بارے میں لکھتے ہیں:

> "بہ حیثیت مجموعی یہ کتاب ایک اوسط تعلیم یافتہ قاری کے لیے
> اقبال کے بارے میں زیادہ سے زیادہ ایسی معلومات فراہم کرتی ہے
> جن سے لاعلم رہ کر وہ اقبال کی شاعری اور ان کے پیغام کو سمجھانا

---

[1] راج بہادر گوڑ۔ "محمد اقبال ایک ادبی سوانح حیات" (مشمولہ) ماہنامہ "العطش" جموں جگن ناتھ آزاد نمبر جنوری تا اپریل ۱۹۸۶ء، ص ۶۷۔

ناممکن نہیں تو دشوار ضرور ہے"۔[1]

خود نوشت سوانح نگاری

خود نوشت سوانح نگاری بھی فنِ سوانح نگاری سے ہی متعلق ہے۔ اس فن کے لیے بھی ضروری ہے کہ حقیقت نگاری سے کام لیا جائے۔ جو بات پیش کریں، دیانت داری سے پیش کریں کیوں کہ عام طور پر انسان کی فطرت یہ ہے کہ وہ اپنے عیوب کو چھپاتا ہے اور اپنی معمولی سی بات کو بھی بڑھا چڑھا کر پیش کرتا ہے۔ اس لیے سوانح نگاری یا آپ بیتی میں یہ اندیشہ رہتا ہے کہ سوانح نگار حقیقت بیانی سے کام نہیں لے گا۔ سوانح نگاری کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ صرف اپنی ذات تک محدود نہ ہو۔ ایسی آپ بیتیوں سے کچھ فائدہ نہیں۔

آزاد نے اب تک دو[2] خود نوشت سوانح عمریاں لکھی ہیں۔ "میرے گذشتہ روز و شب" اور "بہ سلسلہ روز و شب" (غیر مطبوعہ)۔ آزاد نے ان سوانح عمریوں میں اپنی پیدائش، تعلیم، بچپن، لڑکپن، اسکول کی تعلیم، کالج کا زمانہ، شاعری، اساتذہ کا ذکر، مشاعروں کا تذکرہ اور دوست احباب کے ذکر کو بغیر کسی تکلف اور تصنع کے پیش کیا ہے۔ ان سوانح عمریوں میں عمدہ منظر کشی کی گئی ہے۔ پہاڑ، دریا، اسکول، عمارت ہر جگہ سے لطف اندوز ہوتے ہیں اور ایک شاعرانہ ماحول پیدا کر دیتے ہیں۔ آزاد نے اپنی خود نوشت سوانح میں مبالغہ کی آمیزش نہیں کی ہے۔ "میرے گذشتہ روز و شب" آزاد کی یہ خود نوشت سوانح عمری ۱۹۶۵ء میں شائع ہوئی۔ اس وقت ان کے دوست احباب بہت سے دنیا میں موجود ہیں اور اب بھی موجود ہیں مگر کسی نے بھی اُن باتوں پر اعتراض نہیں کیا۔ نہ ان کی ذہانت پر اور نہ ہی علمی استعداد، لیاقت، قابلیت، شاعری یا مشاعروں کے ذکر میں۔ اور یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ آزاد نے حقیقت پسندی سے کام لیا ہے۔ آزاد کی یہ سوانح عمری بہت ہی مختصر ہے۔ آزاد اب اس وقت ستہتر (۷۷)

---

[1] ڈاکٹر مظفر حنفی۔ "محمد اقبال ایک ادبی سوانح حیات" (مشمولہ) "جگن ناتھ آزاد۔ حیات اور ادبی خدمات" مرتبہ ڈاکٹر خلیق انجم، ص ۱۷۷۔

برس کے ہو چکے ہیں۔ یعنی اس سوانح عمری کے لکھنے کے بعد آزاد اپنی زندگی کے مزید تیس برس گزار چکے ہیں۔ اس وقت وہ ایک اور خود نوشت سوانح لکھ رہے ہیں، جو غیر مطبوعہ ہے۔ اس سوانح عمری کے بھی ایک سو چونسٹھ صفحات دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ یہ ابھی نامکمل ہے۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ آزاد "میرے گزشتہ روز و شب" کا ہی تسلسل برقرار رکھتے ہوئے آگے کے واقعات لکھ جاتے مگر وہ ایسا نہیں کر رہے ہیں بلکہ ایک دوسری سوانح عمری نئے سرے سے لکھ رہے ہیں۔ اس غیر مطبوعہ سوانح عمری میں آزاد نے مشاعروں کے تذکروں کا اضافہ کیا ہے۔ آزاد کی یہ خود نوشت سوانح ان اشعار سے شروع ہوتی ہے ؎

میرے قلم سے میرا یہ افسانۂ حیات
ہے ان کی نذر جن کو ہے میرا بیاں پسند
اپنی زباں اور اپنی زمیں کی یہ بات ہے
ڈالی نہیں ہے میں نے مہ و نہر پر کمند

جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا ہے، آزاد نئے سرے سے اپنی سوانح لکھ رہے ہیں اس لیے حالاتِ زندگی کے کئی واقعات پھر سے دہرائے گئے ہیں۔ بعض نئے واقعات بھی اس سوانح عمری میں جگہ پاتے ہیں۔ اپنی زندگی کے ایک واقعے کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"میرے سفر ملتان کا ایک تاریخی واقعہ یہ ہے کہ میں نے سب سے پہلے سنیما یہیں ملتان میں دیکھا۔ میرے والد کے ایک شاگرد جے منی سرشار مجھے سنیما دکھانے لے گئے۔ خاموش تصویریں پردۂ سیمیں پر آ جا رہی تھیں۔ میرے علم میں تو اس سے کیا اضافہ ہوتا ہاں حیرت میں ہر لحظہ اضافہ ہوتا رہا۔" [1]

مشاعروں کے ذکر کے ساتھ آزاد نے بہت سے ادیبوں اور شاعروں کے حالاتِ زندگی کے خاکے بھی کھینچے ہیں۔ آزاد کی خود نوشت سوانح کا بہت کم صفحہ شخصیت نگاری

---

[1] جگن ناتھ آزاد — بہ سلسلہ روز و شب، غیر مطبوعہ، ص ۱۰، ۱۱۔

سے خالی ہے۔ عبدالعزیز فطرت اور صدیق حسن مینا کے عمدہ خاکے موجود ہیں۔ صدیق حسن مینا کے کا ذکر کرتے ہوئے آزاد لکھتے ہیں :

"زندگی میں مینا صاحب کی کوئی قدر نہ ہوئی لیکن جیسا کہ ہم مردہ پرستوں کا دستور ہے ان کی موت کے بعد ان کی یاد میں سالانہ جلسے منعقد ہونا شروع ہو گئے۔ اگر میں غلطی نہیں کرتا تو "مقامِ محمود" اور "ہبوطِ آدم" دونوں ان کی موت کے بعد شائع ہوئیں"۔ [1]

ان کے علاوہ فضل الرحمٰن اشک، مولانا تاجور نجیب آبادی، قتیل شفائی اور کرپال سنگھ بیدار وغیرہ کے بھی عمدہ خاکے موجود ہیں۔ فضل الرحمٰن اشک کے بارے میں ایک جگہ لکھتے ہیں :

"اشک صاحب مہینوں میں ایک آدھ غزل کہتے ہیں لیکن انتہائی پاکیزہ، شستہ اور بڑے رکھ رکھاؤ کے ساتھ۔ اپنا کلام رسالوں کو نہیں بھیجتے محض احباب ہی کو سناتے ہیں اور بڑی خوبی ان کی غزل کی یہ ہے کہ اس کے اکثر اشعار ان کے احباب کو زبانی یاد رہ جاتے ہیں"۔ [2]

مولانا تاجور نجیب آبادی کا ذکر "آنکھیں ترستیاں ہیں" میں خاصی تفصیل سے موجود ہے البتہ یہاں چند نئے واقعات کا ذکر کیا گیا ہے۔ کرپال سنگھ بیدار اور قتیل شفائی کا ذکر بھی خاصی تفصیل سے موجود ہے۔ قتیل شفائی کے بارے میں ایک جگہ لکھتے ہیں :

"وقت گزرنے کے ساتھ قتیل کے ساتھ میرا رشتۂ محبت استوار سے استوار تر ہوتا گیا۔ مجھے قتیل کی شاعری اور شخصیت دونوں ہی پسند آئیں اور یہ قرب و تعلق خاطر روز بروز بڑھتا ہی گیا۔

---

[1] جگن ناتھ آزاد۔ بسلسلۂ روز و شب (غیر مطبوعہ)، ص ۱۹۰۔ [2] ایضاً، ص ۳۲۔

آج ہم دونوں کے درمیان حدِ فاصل قائم ہونے کے باوجود قتیل میرا محبوب دوست ہے۔ ایسا دوست جس کی دوستی کو میں اپنے لیے ایک گراں بہا دولت سمجھتا ہوں۔"[1]

یہی انداز کرپال سنگھ بیدار کی شخصیت کی پیش کشی میں بھی اختیار کیا گیا ہے۔ آزاد نے اپنی زندگی کے واقعات کو دنیا بھر کے ادیبوں اور شاعروں کے ساتھ مربوط کر دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی سوانح میں ان کی اپنی ہی زندگی کے علاوہ دوسرے شاعروں اور ادیبوں کی زندگیاں موجود نظر آتی ہیں۔ ظفر علی خاں مرحوم کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"آج دنیائے ادب اردو میں کون ہے جو ان کی شاعری کا معترف نہیں اور کون ہے جو ان کے سارے کلام کا معترف نہ ہو۔ مولانا کے کلام نے جہاں اردو شاعری کو حدِ نظر تک پھیلتی ہوئی وسعتیں اور فلک بوس بلندیاں عطا کی ہیں وہاں وقتی سیاست کی بدولت اس میں ایسی غلط اندیشیاں بھی راہ پا گئی ہیں جن کا متحمل کسی زبان کا ادب العالیہ نہیں ہو سکتا۔"[2]

اس کے بعد آزاد چند مزید شاعروں کا ذکر کرتے ہیں۔ ان شاعروں میں جو نئے نام ہیں وہ یہ ہیں، جوش ملسیانی، سیماب اکبر آبادی، محروم، اسد ملتانی، اثر صہبائی، نخشب جارجوی، احسان دانش اور شکیل بدایونی وغیرہ ہیں۔

سوانح نگار ایک مورخ بھی ہوتا ہے۔ اچھے سوانح نگار سے ہم یہ توقع کر سکتے ہیں کہ وہ اپنی خود نوشت سوانح حیات لکھ رہا ہو یا کسی اور کی سوانح، تاریخ کو ضرور ملحوظ رکھے گا۔ اس اعتبار سے جب ہم آزاد کی سوانح حیات کا جائزہ لیتے ہیں تو ان کی تمام سوانح میں یہ خوبی نظر آتی ہے۔ "حیاتِ محروم" میں آزاد نے تقسیم اور مابعد

---

[1] جگن ناتھ آزاد۔ بہ سلسلہ روز و شب، ص ۲۲۔ [2] ایضاً، ۳۶۔

تقسیم کے حالات بھی ہمارے سامنے جوں کے توں بیان کیے ہیں۔ یہی حال خودنوشت سوانح حیات کا بھی ہے۔ البتہ اقبال کی سوانح چونکہ مختصر اور بچوں کے لیے ہے اس لیے اس میں اس قسم کا اہتمام نہیں ملتا۔

سوانح نگار کا دوسرا فرض یہ ہے کہ وہ اپنے ہیرو کے عیوب و خوبیوں کی نشاندہی کرے۔ والد محترم کے عیوب گنانے کی توقع آزاد سے بے جا ہے۔ البتہ آزاد نے اپنے والد کے اخلاق، عادات و اطوار کو انتہائی معتدل اور محتاط انداز میں پیش کیا ہے۔ دوسری خودنوشت سوانح میں مشاعروں کا ذکر کثرت سے ہے اس لیے اس میں آزاد کے حالات بہت کم ہیں۔ ایک جگہ وہ خود لکھتے ہیں:

"مشاعروں کا ذکر اس کتاب میں اتنا زیادہ آیا ہے کہ مجھے اس ذکر پر کچھ جھینپ سی محسوس ہونے لگی ہے۔ نہ جانے ہماری نئی نسل میری یہ داستان پڑھے گی تو کیا سوچے گی کیونکہ نئی نسل نے مشاعرے کو جس عالم میں دیکھا ہے وہ کچھ بہت قابلِ تعریف نہیں"۔[۱]

اس میں شک نہیں کہ اس خودنوشت سوانح میں مشاعروں کا ذکر کثرت سے ہے۔ مگر مشاعروں کے ذکر کے ساتھ شاعروں کی زندگی اور ان کی شاعری پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے جن سے موجودہ نسل کو ضرور فائدہ پہنچے گا۔ آزاد نے جوش ملیح آبادی کے ساتھ دس برس زندگی گزاری۔ اس لیے وہ ان کے عادات و اطوار سے اچھی طرح واقف ہیں۔ خودنوشت سوانح کا وہ حصّہ جو تقریباً کئی صفحات پر مشتمل ہے، بہت ہی کارآمد اور مفید ثابت ہوگا۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جس طرح مضامین و مقالات میں آزاد اقبال کا نام لیے بغیر آگے نہیں بڑھتے۔ اسی طرح مشاعروں کے ذکر میں جوش ملیح آبادی کا نام وہ ضرور لیتے ہیں۔ جوش کی شاعری کے لیے بھی آزاد نے اپنی سوانح میں کئی صفحات مختص کیے ہیں۔ اسی طرح عبدالعزیز فطرت، عبدالحمید عدم، مولانا ظفر

۱۔ جگن ناتھ آزاد۔ بہ سلسلہ روز و شب (غیر مطبوعہ)، ص ۱۳۳۔

علی خاں مرحوم وغیرہ کے علاوہ اختر شیرانی، جگر مرادآبادی، حفیظ، چراغ حسن حسرت، ہری چند اختر، احسان دانش، ساحر لدھیانوی، یوسف ظفر، مجاز، قتیل اور عرش ملسیانی ان گنت شعراء حضرات ان مشاعروں میں نہ صرف شرکت کرتے ہیں بلکہ ان کے خاکے بھی موجود ہیں۔

جہاں تک آزاد کی خود نوشت سوانح حیات میں اپنی حیات کے احاطے اور تنقید کا سوال ہے، آزاد نے اپنے آپ کو اپنی زندگی تک محدود کر دیا ہے۔ انھوں نے اپنی شادی، بیوی بچے، معاشی حالات اور گھریلو زندگی کے بارے میں کچھ نہیں لکھا۔ نہ ہی اپنے آپ کو ہیرو بنا کر پیش کرتے ہیں۔ اپنی شاعری اور مضامین کے بارے میں ایک دو موقعوں پر صرف سرسری سا ذکر کیا گیا ہے۔

"آنکھیں ترستیاں ہیں" بقول محمد یوسف ٹینگ ان کی "داستانِ حیات" ہے۔ یہ کتاب گرچہ کہ فنِ سوانح نگاری کے ضمن میں نہیں آتی، مگر اس کتاب کے کئی مضامین سے آزاد کی شخصیت کے بہت سے پہلو اُجاگر ہوتے ہیں جو عام طور پر پوشیدہ ہیں یا پھر انھوں نے ان باتوں کو اپنی سوانح عمری میں جگہ نہیں دی ہے۔ مولانا تاجور نجیب آبادی کا کرتے ہوئے اپنے بارے میں لکھتے ہیں استادی اور شاگردی کا سلسلہ ۱۹۳۷ء سے شروع ہوا۔ ایم۔ اے میں داخلہ نہ ملنے کی وجہ سے چند ایام شعر و ادب کی گلی کوچوں میں آوارہ گردی کرنے کا موقع ملا۔ آزاد کا "ترانۂ پاکستان" ۱۴؍اگست بارہ بجے رات کو ریڈیو پاکستان سے نشر ہوا۔ یہ پاکستان کا پہلا ترانہ تھا۔ ان تمام باتوں کا ذکر "آنکھیں ترستیاں ہیں" میں موجود ہے۔

انھیں مضامین میں آزاد نے اپنا گھر لٹنے اور اجڑنے کی داستان بھی سنائی ہے۔ ہندوستان و پاکستان کی قتل و غارت گری کی داستان بھی موجود ہے۔ صوفی غلام مصطفی تبسم آزاد کے اساتذہ میں ہیں۔ آزاد ان کا ذکر کرتے ہوئے اپنی فارسی شاعری کی روداد بھی سنا دیتے ہیں۔ آزاد نے اپنے استاد کے کہنے پر نظیری کی غزل کے ایک مصرعے پر دو غزلیں کہیں۔

آزاد نے نہ صرف اس مشکل زمین میں غزل کہی بلکہ اپنے دوسرے ساتھی کو ایک

مہمل غزل فارسی ہی میں لکھ کر دی۔ اس سے آزاد کی فارسی زبان پر جو دسترس حاصل ہے اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

آزاد نے اپنی ملازمت کی کوششوں کے بھی بہت سے قصے بیان کیے ہیں۔ آزاد کو مولوی عبدالحق، پنڈت جواہر لعل نہرو، مولانا ابوالکلام آزاد اور رفیع احمد قدوائی جیسی برگزیدہ شخصیتوں سے ملنے کا انھیں شرف حاصل ہوا تھا بلکہ رفیع احمد قدوائی کے مکان (مسولی) میں انھی کے کمرے میں ٹھہرنے کا بھی اتفاق ہوا۔ بقول آزاد کراچی میں انجمن ترقی اردو کے دفتر میں جس کمرے میں ان کا قیام تھا وہ کمرہ گاندھی جی کا پرار تھنا کا کمرہ تھا۔ عبدالقادر سروری کا ذکر کرتے ہوئے آزاد لکھتے ہیں :

"۱۹۶۹ء میں میں لیہہ جا رہا تھا کہ راستے میں میری گاڑی کو حادثہ پیش آگیا اور میری آٹھ پسلیاں ٹوٹ گئیں"۔ [1]

آزاد کا اسلوب سیدھا سادا ہے۔ "حیاتِ محروم" سے لے کر خودنوشت سوانح تک میں آزاد نے کئی موقعوں پر تحقیق و تنقید سے کام لیا ہے۔ فنِ سوانح نگاری میں آزاد کی سوانح انتہائی اہمیت کی حامل ہے۔

---

[1] جگن ناتھ آزاد — "آنکھیں ترستیاں ہیں" ص ۱۰۴۔

جگن ناتھ آزاد کے سفر نامے

سفر نامہ قدیم ترین صنف ہے۔ مصنفین، مبلغین، ادیب اور سیاح یا پھر وید اس طرح کے لوگوں نے جب مختلف ممالک کا دورہ کیا تو وہاں کی نئی نئی باتوں اور اپنے تجربات کو قلم بند کرنا ضروری محسوس کیا چنانچہ ہندوستان میں سولھویں صدی میں بالعموم سفر نامے اور سفری یادداشتیں ترتیب دی جانے لگی تھیں۔ ہندوستانی قدیم سفر ناموں میں جو سفر نامے بہت زیادہ مشہور ہوئے ان میں گری نایوس کا سفر نامہ "نیا کرہ" اور راموسیو اور رچرڈ ہیکلیوٹ کی تحریریں ہیں۔ بعد میں جن سفر ناموں کو مقبولیت اور شہرت حاصل ہوئی وہ سیاحوں کے سفر نامے تھے۔[1]

مسلمان سیاحوں کے سفر ناموں میں البیرونی کی "کتاب الہند"، ابن بطوطہ کا "عجائب الاسفار" محمد دین امیر ولی کا "بحر الاسرار" خواجہ عبد الکریم کا سفر نامہ "بیان واقع" ہندوستان کی تہذیب و تمدن اور تاریخ سیاست کے احوال و واقعات پر مشتمل ہیں۔

انیسویں صدی کے اوائل میں ایسے سفر نامے تحریر کیے گئے جو دلچسپ اور بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ ان سفر ناموں میں منشی برج باسی لال کا "سیر دکن"، علی بخش کا "سفر دکن"، صغرا ہمایوں مرزا کا "سیاحت جنوبی ہند" وغیرہ کے نام ممتاز ہیں۔ اس وقت سفر نامہ نگاری کی روایت مستحکم نہیں تھی۔ زیادہ تر سفر نامے انگلستان، یورپ

---

[1] ڈاکٹر معین الدین عقیل، مقدمہ (مشمولہ) ایک نادر سفر نامہ از عبد الغفار خاں۔

اور بلاد اسلامیہ و حجاز سے تعلق رکھتے تھے۔ پُر فضا مقامات کے سفرنامے بیسویں صدی کے اوائل تک بھی بہت کم تعداد میں تصنیف ہوئے۔

گزشتہ چالیس پچاس برسوں میں اس صنف نے خاصی ترقی حاصل کی ہے بلکہ اس نے مزید وسعت حاصل کرتے ہوئے ڈائریاں، رسالے اور یادداشتوں کو بھی جنم دیا ہے۔ جدید سفرناموں میں سید سلیمان ندوی اور شبلی نعمانی کے سفرنامے خاصی مقبول ہیں۔ رام لعل کا سفرنامہ پاکستان "زرد پتوں کی بہار" اور گوپی چند نارنگ کا سفرنامہ "سفر آشنا" بھی قابلِ ذکر ہیں۔ موجودہ دور میں بہت سے ادیبوں اور شاعروں نے سفرنامے لکھنے شروع کر دیے ہیں۔ گویا سفرنامہ لکھنے کی ایک روایت چل پڑی ہے۔

سفرناموں میں عام طور پر جھوٹ اور مبالغے سے کام لیا جاتا ہے۔ مگر جب ہم جگن ناتھ آزاد کے سفرنامے پڑھتے ہیں تو کہیں بھی جھوٹ کا شُبہ نہیں دکھائی دیتا۔ جگن ناتھ آزاد خود ہیرو بنا کر پیش نہیں کرتے۔ اب تک انھوں نے جو بھی سفرنامے لکھے وہ کسی نہ کسی مقصد کے تحت قلم بند کیے گئے ہیں۔

آزاد کا زیادہ تر وقت سفر میں گزر رہا ہے۔ خط و کتابت میں تاخیر کی وجہ یہی ہوتی ہے کہ وہ سفر میں ہوتے ہیں۔ دورانِ سفر راقم الحروف سے کئی مرتبہ حیدر آباد میں ملاقات ہوئی۔ ان کے پاس خطوط کے جوابات کے لیے ایک فائل ہے۔ وہ ہوائی جہاز سے سفر کریں یا ریل سے، خطوط کے جوابات عام طور پر سفر کے دوران ہی لکھتے ہیں۔ یوں تو انھوں نے اندرونِ ملک و بیرونِ ملک بہت سارے سفر کیے ہیں، بہت سارے ممالک کی سیر کی ہے۔ مگر کتابی صورت میں ان کے تین سفرنامے شائع ہو چکے ہیں۔ دو ابھی تک غیر مطبوعہ ہیں۔ ان کا پہلا سفرنامہ "جنوبی ہند میں دو ہفتے" ۱۹۵۰ء میں لکھا گیا تھا۔ دوسرا سفرنامہ "پشکن کے دیس میں" روس کے متعلق ہے۔ تیسرا سفرنامہ "کولمبس کے دیس میں" امریکہ اور کینیڈا کے متعلق ہے۔ ان کے علاوہ کئی اور سفرنامے ہیں جو نامکمل اور غیر مطبوعہ ہیں۔ بعض جزوی طور پر شائع بھی ہوئے ہیں۔[۱]

---

[۱] بقول جگن ناتھ آزاد تقریباً چودہ پندرہ سفرنامے نامکمل ہیں دیکھیے "کولمبس کے دیس میں" حرفِ اول، ص ،۔

"جنوبی ہند میں دو ہفتے" یہ سفرنامہ اسّی صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کے آخر میں ۱۵ر نومبر ۱۹۵۰ء درج ہے۔ اس سفرنامے کو آزاد نے اردو ایسوسی ایشن گورنمنٹ آرٹس کالج مدراس کے نام معنون کیا ہے۔ یہ ایک سفرنامہ ہی نہیں بلکہ ایک تاریخی داستان ہے جو گورنمنٹ آرٹس مدراس ایسوسی ایشن کی دعوت سے شروع ہوتی ہے اور اس شعر پر ختم ہوتی ہے ؎

سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے
ہزار ہا شجر سایہ دار راہ میں ہے

۲۹ر اکتوبر ۱۹۵۰ء کو آزاد دہلی سے جنوبی ہند کے لیے روانہ ہوئے۔ ٹرین میں سفر کے دوران اردو کے متعلق آزاد طرح طرح کے خیالات لاتے ہیں۔ آزاد کو ہمیشہ سے ہی اردو سے محبّت رہی ہے۔ ہمیشہ اردو کی بقا کے لیے متفکر رہے چنانچہ اردو سے محبّت کی جھلک اس سفرنامے میں بھی موجود ہے۔ بھوپال اسٹیشن پر جب وی نارائن راؤ سے ملاقات ہوتی ہے اور ان کے پاس اردو کی دو کتابیں دیکھتے ہیں تو انھیں بہت خوشی ہوتی ہے۔ لکھتے ہیں:

"اہلِ مہاراشٹر کے متعلق میرا خیال تھا کہ یہ لوگ اردو نہیں جانتے ہوں گے لیکن نارائن راؤ کی ملاقات نے اس خیال کو غلط ثابت کردیا تھا۔ نارائن راؤ نے ساری بات چیت اردو میں کی تھی اور اپنا مافی الضمیر پوری طرح مجھ پر واضح کردیا تھا۔"[1]

آزاد کی اردو دوستی کی داستان ہر صفحے میں نمایاں طور پر موجود ہے۔ ٹرین میں سفر کے دوران اردو کے مستقبل کے بارے میں فکرمند ہیں۔ وہ اردو کے عروج و زوال کے بارے میں سوچتے ہیں۔ پھر خود سے سوال کرتے ہیں "کیا اردو زبان اور ادب ہندوستان کی تہذیب و تمدن کا جزو نہیں ہے؟ کیا اس پودے کو ہندو اور مسلمان

---

[1] جگن ناتھ آزاد۔ "جنوبی ہند میں دو ہفتے" ص ۹، ۱۰۔

دونوں نے مل کر اپنے خونِ جگر سے نہیں سینچا؟ کیا یہ اس وقت بھی ہندوستان کے متعدد صوبوں کی عام بول چال کی زبان نہیں ہے؟ غرض اس طرح کے سوالات کے ذریعے سے آزاد سارے ہندوستانیوں کے ضمیروں کو جھنجھوڑتے ہیں اور پوچھتے ہیں کہ کیا اس اردو کی بقا کے لیے ہمارے اوپر کچھ ذمہ داریاں عائد نہیں ہوتیں۔

آزاد نے اپنے اس سفرنامے میں جہاں کئی مشاعروں کا تذکرہ کیا ہے وہیں ادبی، سیاسی، سماجی اور اقتصادی معاملات کو بھی اپنا موضوعِ بحث بنایا ہے۔ نارائن راؤ سے گفتگو کرتے ہوئے وہ نیپال کے اقتصادی حالات کا مکمل جائزہ لیتے ہیں۔ وہاں کی کاشتکاری، جاگیرداری، زرعی جمود، بے روزگاری، صنعت و حرفت، بیرونِ دنیا سے تعلقات اور آمد و رفت کی مشکلات، غرض ہر طرح کے مسائل مباحث میں آئے ہیں۔ اسی طرح جب وہ "بلدیو راج کی شاعری" کا ذکر کرتے ہیں تو یہ تاثرات تنقیدی رُخ اختیار کر لیتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

"۱۹۴۴ء کے لگ بھگ راج بلدیو راج کا نام لاہور کے ادبی حلقوں میں جس تیزی سے چمکا تھا اسی تیزی سے تقسیم ہند کے چند برس دنیائے ادب سے محو ہو گیا۔ میں نے اس کتاب (ناقوس) کے ورق الٹے اور اس کے اکثر حصوں میں تازگی اور حرارت نظر آئی جو آج سے پانچ سات برس پہلے اس شاعر کے کلام میں محسوس ہوتی تھی۔ یہ مجموعۂ کلام کوئی ڈیڑھ سو صفحات پر مشتمل ہے اور اس میں بہت حسین و جمیل اشعار موجود ہیں۔"[1]

آزاد نے راج بلدیو راج کے منتخبہ اشعار بھی پیش کیے ہیں۔ آزاد کا یہ سفر بنیادی طور پر حیدرآباد اور مدراس ہی کے لیے تھا اس لیے اس سفرنامے میں عثمانیہ یونیورسٹی، عثمان ساگر، مدراس کی صبح کا منظر وغیرہ کا ذکر ہے۔ آزاد حیدرآباد کے عثمان ساگر اور

---

[1] جگن ناتھ آزاد۔ جنوبی ہند میں دو ہفتے، ص ۱۳۔

گولکنڈہ کے مقبروں سے اس قدر متاثر ہوئے کہ "عثمان ساگر" اور گولکنڈہ پر دو الگ الگ نظمیں لکھی ہیں۔ گولکنڈہ کے مقبروں کے بارے میں آزاد لکھتے ہیں:

"گولکنڈہ — یہ کسی شہر کا نام نہیں۔ یہ کوئی مقام نہیں بلکہ روئے زمین پر بکھری ہوئی داستانِ عبرت کا نام ہے۔ گولکنڈہ محض کھنڈروں کی دنیا نہیں بلکہ تاریخِ ہند کا ایک ایسا باب ہے جسے ہر دور کے سیاح، مورخ، شاعر، ادیب اور فنکار پڑھتے جائیں گے اور آنسوؤں کی موتی نچھاور کرتے جائیں گے۔ اس سرزمین پر قطب شاہی خاندان کوئی دو سو برس تک ۱۵۱۸ء سے ۱۶۸۷ء تک حکمراں رہا اور یہ زمانہ دکن تو کیا سارے ہندوستان کی تاریخ میں ایک زرّیں عہد کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔"[1]

آزاد اپنے ان تاثرات کو نظم میں بھی پیش کرتے ہیں۔ "نوائے پریشاں" کی اس نظم کے دو اشعار بھی ملاحظہ ہوں ؎

نگاہیں پھر رہی ہیں گولکنڈے کے مناظر میں
نہ جانے کتنے ہنگامے ہیں خوابیدہ مقابر میں

کہاں ممکن کہ میں چپ چاپ ہی ان سے گزر جاؤں
کہاں ممکن کہ ان کو لباسِ شعر پہناؤں[2]

(ایک لمحہ گولکنڈہ کے مقبرے میں)

آزاد اس سفر سے بے حد متاثر ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں حسن و عشق کے قصّوں کے ساتھ ساتھ دکن اور حیدرآباد کا ذکر کثرت سے موجود ہے۔ عثمانیہ یونیورسٹی گرلز کالج کے مشاعرے کا ذکر تفصیل کے ساتھ موجود ہے۔ حیدرآباد میں آزاد نے چار روز قیام فرمایا۔ لکھتے ہیں: "یہ چار دن عمر کے چار دن کے برابر ہو گئے"۔

۱۔ جگن ناتھ آزاد۔ جنوبی ہند میں دو ہفتے، ص ۴۶۔ ۲۔ جگن ناتھ آزاد۔ نوائے پریشاں، ص ۸۷، ۹۰۔

آزاد کا یہ سفر نامہ خاصی دلچسپ بھی ہے۔ آزاد نے جگہ جگہ عمدہ منظر نگاری کی ہے۔ آزاد چونکہ شاعر بھی ہیں اس لیے ان کی نثر میں شاعری کی جھلک موجود ہے۔ "عثمان ساگر" کے مناظر کی عکاسی کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"عثمان ساگر کا منظر حقیقی طور پر ایک طلسماتی منظر تھا۔ اس کا ذکر اب یہاں لاحاصل ہے کیوں کہ اس کے متعلق مجھے جو کچھ کہنا تھا وہ اپنی نظم "عثمان ساگر" میں کہہ چکا ہوں"۔

مدراس کے مرنیا بیچ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"وہاں تھوڑی دیر بیٹھنے کے بعد ہم ساحلِ بحر کی سیر کو نکلے۔ دامنِ ساحل میں موجوں کا رقص ایک عجیب سماں پیدا کر رہا تھا۔ بعض مقامات پر تو لہریں اتنے زور سے اور اس قدر بلند اُٹھ رہی تھیں کہ اس طوفانی کیفیت کو دیکھ کر خوف آتا تھا"۔ [۱]

مدراس کی طلوعِ صبح کی منظر کشی بھی ملاحظہ کیجیے:

"راستے میں مختلف مناظر سے لطف اندوز ہوتے ہوئے ہم طلوع سے پہلے ساحلِ بحر پر جا پہنچے۔ تھوڑی دیر میں افق کے دامن میں بقول حفیظ

کرنوں نے رنگ ڈالا بادل کی دھاریوں کو

دیکھتے ہی دیکھتے نور کا ایک سیلاب، ایک آتشیں گولے کو اپنے دامن میں لیے پانی کی سطح پر نمودار ہوا"۔

آزاد کے اس سفر نامے میں بیان کی سادگی ہر جگہ موجود ہے۔ بہت آسان اور سلیس زبان میں خوبصورت منظر کشی کی گئی ہے۔ سفر نامے میں تاریخی معلومات کے علاوہ کئی اہم شخصیتوں کا تعارف بھی موجود ہے۔ آزاد کے اس سفر نامے کو پڑھنے کے

---

[۱] جگن ناتھ آزاد۔ جنوبی ہند میں دو ہفتے، ص ۶۲، ۶۳۔

بعد سیر و تفریح کا لطف بھی حاصل ہوتا ہے۔

آزاد کا دوسرا سفرنامہ "پشکن کے دیس میں" ہے۔ یہ سفرنامہ روس کے متعلق ہے۔ سوویت رائٹرس یونین کی دعوت پر ستمبر ۱۹۷۸ء میں آزاد روس تشریف لے گئے تھے۔ ۳ ستمبر تا ۲۴ ستمبر یعنی یہ سفر صرف ۲۱ دن کا تھا۔

آزاد اس سفر سے پہلے پریم چند، ٹیگور، جواہر لعل نہرو کے نگارشات کے ذریعے سے روس کے بارے میں بہت کچھ جان چکے تھے۔ علامہ اقبال کے کلام میں بھی اس کی جھلک دیکھی تھی۔ اس سفر کے دوران وہ ان چیزوں سے زیادہ متاثر ہوتے ہیں جن سے انھیں لگاؤ ہے۔ اپنے اس سفرنامے کی غرض و غایت کے بارے میں لکھتے ہیں :

> "میرا یہ سفرنامہ چونکہ سیاست یا صنعت و حرفت سے متعلق نہیں ہے اس لیے اس میں اس طرح کی تفصیل کی گنجائش نہیں ہے کہ روس میں میں نے ہندوستان اور پاکستان کے درمیان دوستی کے لیے ایک مستحکم بنیاد قائم کرنے کے لیے کتنے خلوص سے کام لیا ہے یا ہندوستان صنعتی ڈھانچے کو پختگی اور پائندگی دینے کے لیے کیا کچھ کیا ہے یہ ایک شاعر کا سفرنامہ ہے اور بڑی حد تک "نظارے خوش گزرے" کی ایک تفسیر ہے جس میں زیادہ تر ذکر شعر و ادب یا یونیورسٹیوں کی فضا کا نظر آئے گا۔ یہ ذکر بھی اتنا مفصل نہیں ہے کہ اس پر کسی ادبی، علمی یا تعلیمی دستاویز کا گمان ہو میں تو ایک طرح سے بس ع
>
> گزرا چلا گیا ہوں دیارِ حبیب سے"[1]

سفرنامہ گرچہ مختصر ہے مگر جن اہم نکات کا موٹے طور پر احاطہ کیا گیا ہے انھیں

---

[1] جگن ناتھ آزاد۔ پشکن کے دیس میں، ص ۷، ۸۔

ہم بقول ڈاکٹر ظہور الدین اس طرح پیش کر سکتے ہیں :

(۱) سوویت ہند دوستی

(۲) روس میں قانون کی بالادستی

(۳) مذہبی اور انفرادی آزادی

(۴) احساسِ ذمہ داری اور محنت کا وقار

(۵) روس میں ایک ادیب کا مقام اور مرتبہ

(۶) روس میں اردو زبان کی مقبولیت

(۷) اقبالیات کا مطالعہ اور

(۸) حسن فطرت [۱]

"لیٹویا اور ہندوستان" کی بحث میں آزاد نے سوویت روس اور ہندوستان کے تاریخی رشتوں کا احاطہ کیا ہے۔ ہندوستان ہی کی طرح وہاں سیاسی، سماجی و تمدنی یکسانیت پائی جاتی ہے۔ آزاد کے مطابق لیٹویا اور ہندوستان کے ساتھ ایک روحانی اور مذہبی تعلق رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہاں کے رسم و رواج، مذہب، دیوی دیوتا اور عبادت کے طریقوں میں وہ خاص مماثلت پاتے ہیں۔ لیٹویا میں سِگما کی باتوں سے آزاد بے حد متاثر ہوتے ہیں۔

روس میں قانون کی بالادستی۔ وہاں کسی کو قانون توڑنے یا ہاتھ میں لینے کی اجازت نہیں۔ چاہے وہ شخص کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو۔ روس میں مذہبی آزادی حاصل ہے مگر مذہب کی تبلیغ پر پابندی عائد ہے۔ آہستہ آہستہ وہ بھی ختم ہو رہا ہے۔ روس میں انفرادی آزادی بھی ہے۔ حکومت کے خلاف لوگ بیانات دیتے ہیں، اپنے خیالات کا اظہار بلا تامّل کرتے ہیں وہاں ہر شخص کو یکساں اور برابری کا درجہ حاصل ہے۔ کام کی بنیاد پر کسی کو مرتبہ نہیں ملتا۔ ہر شخص کو مراعات برابر برابر حاصل ہیں۔ چاہے وہ کسان مزدور ہو یا پھر کوئی دفتر کے کام میں۔

---

[۱] ڈاکٹر ظہور الدین "پشکن کے دیس میں"، (مشمولہ) ارمغانِ آزاد مرتبہ ڈاکٹر ظہور الدین، ص ۱۸۴۔

روس کے لوگوں میں احساسِ ذمہ داری بہت زیادہ ہے۔ وہ کام کے وقت میں بات کرنا تک پسند نہیں کرتے۔ وہاں کے لوگ اپنے فرائض اور ذمہ داری کا یہ خوبی احساس رکھتے ہیں اور اسے پوری طرح نبھاتے ہیں۔ روس میں ادیبوں کو اچھا مقام حاصل ہے۔ کئی یونیورسٹیوں میں اردو پڑھائی جاتی ہے۔ باقاعدہ شعبہ قائم ہے۔ اردو کے طالب علم اور بہت سے روسی ادیب اقبالیات کا مطالعہ کرتے ہیں۔ اقبال پر پی۔ ایچ۔ ڈی کی سطح پر کام ہو رہا ہے۔

روس کے خوبصورت مقامات کا آزاد نے اچھے انداز میں عکاسی کی ہے۔ لینن میوزیم کا ذکر کرتے ہوئے آزاد جزئیات تک کو بیان کر دیتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

> "یہ میوزیم کیا تھا تاریخ کا ایک بڑا اہم باب تھا جس کے صفحے لمحہ بہ لمحہ میرے سامنے کھلتے جا رہے تھے اور یقیں محکم، عمل پیہم کا مفہوم مجھ پر واضح کرتے چلے جا رہے تھے۔ نہ جانے یہ شخص فولاد کا بنا ہوا تھا یا کیا تھا۔ اس کو کیا طلسماتی قوت عطا ہوئی تھی کہ اس نے غلاموں کے اندر بغاوت کا جذبہ بیدار کر کے زارشاہی کو تہس نہس کر کے رکھ دیا"۔[1]

آزاد کے اس سفرنامے کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ جہاں انھوں نے کسی تاریخی مقام، عمارت یا شخصیت کا ذکر کیا ہے وہیں ان کی مختصر سی تاریخ بھی بیان کر دی ہے جس سے قاری کو اس مقام کے سمجھنے میں بالکل دشواری نہیں ہوتی۔ چنانچہ "کریملن" کا ذکر کرتے ہوئے ایک جگہ لکھتے ہیں:

> "کریملن زارشاہی کے زمانے کی یادگار ہے جس میں لینن ایک فاتح کے طور پر ۱۲ مارچ ۱۹۱۸ء کو دن کے ۱۲ بجے مکمل شان کے ساتھ داخل ہوا۔ آج کریملن روسی کمیونسٹ پارٹی اور حکومت کے اہم ترین دفاتر سے آباد ہے۔ ماسکو اگر سارے روس کا دل ہے تو کریملن ماسکو کا دل ہے"۔[2]

---

[1] جگن ناتھ آزاد۔ پشکن کے دیس میں، ص ۲۰۔ [2] ایضاً، ص ۳۸۔

یہ خوبی ایک مقام پر نہیں بلکہ ہر جگہ نظر آئے گی "لینن گراڈ" کے متعلق ایک جگہ لکھتے ہیں:

"یہ قبرستان دوسری جنگِ عظیم کی یادگار ہے۔ ۱۹۴۲ء اور ۱۹۴۳ء میں لینن گراڈ کے پانچ لاکھ افراد نازی فوج کے حملوں سے اور پانچ لاکھ بھوک پیاس سے تڑپ تڑپ کے ہلاک ہو گئے تھے۔ یہ قبرستان تاریخِ روس کے اسی واقعے کی یادگار ہے اور ایک قبر میں متعدد لاشیں دفن ہیں۔ مرنے والوں میں فوجی سپاہی، افسر اور جرنیل بھی ہیں اور عام لوگ بھی۔ ہر قبر کے آگے پتھر نصب ہے جس پر ۱۹۴۲ء یا ۱۹۴۳ء لکھا ہوا ہے۔ اگر مرنے والے فوجی ہیں تو پتھر پر ستارہ بنا ہوا ہے اور اگر شہری ہیں تو پتھر پر درانتی اور ہتھوڑے کا نشان ہے۔" [۱]

اسی طرح جب آزاد "پشکن ہاؤس" کا ذکر کرتے ہیں تو اپنے بھرپور تاثرات کا اظہار کرتے ہیں:

"اس سفر میں وہ مکان بھی دیکھا جو "پشکن ہاؤس" کے نام سے مشہور ہے لیکن یہ دراصل پشکن کا گھر نہیں ہے۔ یہ ایک علمی عجائب خانہ ہے جس میں پشکن، گورکی، ٹالستوئی اور دوسرے ادیبوں اور شاعروں کے ہاتھ کے لکھے ہوئے مسودات رکھے ہیں اس کے قریب ہی لینن گراڈ یونیورسٹی ہے۔ لینن نے اس یونیورسٹی سے لا (LAW) کا امتحان پاس کیا تھا۔" [۲]

جگن ناتھ آزاد کو فطرت سے بے حد لگاؤ ہے۔ اس سفرنامے میں بھی جگہ جگہ اس کا ثبوت موجود ہے۔ آزاد نے اپنی زبان و بیان سے ان مناظر میں اور زیادہ دل کشی پیدا کی ہے۔ ایک مقام پر لکھتے ہیں:

"تھوڑی ہی دیر میں لق و دق پہاڑوں کی جگہ ہری بھری زمین نظر آنے لگی۔ اشجار، گھاس، سبزہ، ہریالی، پانی بالکل کشمیر کا سا

---

[۱] جگن ناتھ آزاد۔ پشکن کے دیس میں، ص ۷۱، ۷۲۔ [۲] ایضاً، ص ۷۰، ۷۱۔

نظارہ تھا اور میں یہ بھول ہی گیا کہ میں ماسکو جارہا ہوں۔ کشمیر اور اس کے مناظر کے تصور میں کھو گیا"۔ [1]

ایک اور مقام پر لکھتے ہیں:

"دن بھر موسم بہت عمدہ تھا۔ دھوپ چمکتی رہی اور دھوپ میں ماسکو موتی کی طرح دمکتا دکھائی دیتا رہا۔ لیکن شام کو ہلکی سی بارش ہو گئی اور خنکی بڑھ گئی موسم یہاں کا بالکل کشمیر کی طرح کا ہے۔ ذرا بادل آجائیں تو خنکی شدید ہو جاتی ہے اور بادل ہٹ جائیں تو دھوپ نکل آئے تو موسم بہت خوشگوار ہو جاتا ہے"۔ [2]

سفر نامہ "پشکن کے دیس میں" اردو کے ادبی خزانے میں خصوصاً اردو سفر ناموں کے سرمائے میں ایک اہم اضافہ ہے جہاں آزاؔد نے اپنی شیریں بیانی اور خوبصورت منظر کشی کے ذریعے سے اہم تاریخی مقامات کی سیر کروائی ہے وہیں شگفتہ بیانی اور شاعرانہ مزاج نے اس سفر نامے کو چار چاند لگا دیے ہیں۔ سگما، پرسگا، آرینا نتاشا، لڈمیلا ویسی لیوا وغیرہ کے حسن صورت و سیرت کا بھی بے باکانہ اظہارِ خیال کیا گیا ہے۔ ایک اقتباس ملاحظہ کیجیے:

"میں دل ہی دل میں حیران ہو رہا تھا کہ قدرت بھی بعض دفعہ فیاضی کی کتنی انتہا کر دیتی ہے۔ اس لڑکی کو خدا نے جس طرح حسنِ صورت، حسنِ سیرت اور کمال علم کی دولت سے مالامال کیا ہے اس کی مثالیں کم ملیں گی"۔ [3]

آزاد کے اس سفر نامے سے ان کی دلچسپی، ذوقِ طبیعت حتیٰ کہ مذہب کے بارے میں بھی اظہارِ خیال ملتا ہے۔ چنانچہ لینن گراڈ یعنی تیرھویں باب میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

"رات کے کھانے میں ایک بہت ہی عمدہ چیز مل گئی اور وہ بھی محض میری غلطی سے۔ یہ لسی تھی۔ میں نے دہی مانگا۔ بند ڈبا ملا۔ کھولا تو دہی

---

[1] جگن ناتھ آزاد۔ پشکن کے دیس میں، ص ۱۲۔ [2] ایضاً، ص ۱۷۔ [3] ایضاً، ص ۵۶۔

کی جگہ لسّی نکلی۔ ماسکو میں جب میں دہی مانگتا تھا تو دہی ملتا تھا
آج دہی کے نام پر لسّی پینے کو مل گئی اور وہ بھی روس میں"۔[1]

علم و ادب کا ذوق تو پورے سفرنامے میں موجود ہے۔ اقبالؔ اور اقبالیات آزادؔ کی کمزوری ہے۔ چنانچہ اقبالیات کا ذکر کئی جگہوں پر موجود ہے۔ بہت سے طلبہ کے تھیسس اور ان کے عنوانات کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ اقبالؔ پر کام کرنے والوں کے کارنامے بتلائے گئے ہیں۔ مذہب کے بارے میں سگما کے سوال کا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

"سگما نے پوچھا آپ ہندو ہیں یا مسلمان؟ میں نے کہا یہ تم نے بہت مشکل سوال کیا ہے۔ ہمارے یہاں ہندوستان میں ہندو یا مسلمان ہونے کے معنی یہ ہیں کہ انسان ہندو دھرم یا اسلام کے اصولوں پر عمل کرتا ہو۔ محض ہندو گھرانے میں پیدا ہونے سے ہندو ہونے کا دعویٰ کیا جا سکتا ہے نہ مسلمان ہونے کا۔ ویسے جو ہندوؤں کے گھر میں پیدا ہوتا ہے وہ ہندو کہلاتا ہے اور جو مسلمانوں کے گھر میں پیدا ہوتا ہے وہ مسلمان کہلاتا ہے۔ عمل کے اعتبار سے تمھیں ہندوستان میں بہت کم ہندو اور بہت کم مسلمان ملیں گے۔ اپنے اپنے مذہب کی تعلیم پر عمل کرنے کے علاوہ مذہب سے نزدیک ہونے کی ایک اور بھی صورت ہے اور وہ یہ ہے کہ کسی مذہب کے متعلق اپنے کتابی علم میں اضافہ کیا جائے اور اس معیار کو اگر سامنے رکھا جائے تو ہندو دھرم کے مقابلے میں میرا مطالعہ اسلام کے متعلق کہیں زیادہ ہے"۔[2]

مظہر امام جگن ناتھ آزادؔ کے اس سفرنامے کے متعلق لکھتے ہیں:

"تعجب ہوتا ہے کہ اس سارے سفر میں جگن ناتھ آزادؔ کو کوئی تلخ تجربہ

---

[1] جگن ناتھ آزاد۔ پشکن کے دیس میں، ص ۶۸۔ [2] ایضاً، ص ۵۵۔

نہیں ہوا اور کوئی ایسی بات نہیں ہوئی جو ناگواریِ طبع کا باعث بنتی یا پھر انھوں نے قصداً ایسی بات کے اظہار سے اجتناب کیا ہے۔" [1]

یہاں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ جو لوگ عظیم مقصد کے تحت دنیا میں زندگی گزارتے ہیں وہ چھوٹی چھوٹی باتوں کی طرف دھیان نہیں دیتے۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ دنیا کے ہر کونے میں بُرائی بھی موجود ہوتی ہے۔ خلافِ طبع واقعات رونما ہوتے ہیں۔ آزاد ہندوستان میں بھی اسی طرح کی طبیعت کے ساتھ زندگی گزار رہے ہیں۔ وہ ہمیشہ تلخ تجربات اور تلخیوں کو فراموش کر کے خوشگوار زندگی گزارنے کے خواہاں رہتے ہیں۔

انور سدید آزاد کے اس سفرنامے کے متعلق لکھتے ہیں:

"آزاد صاحب نے اس سفرنامے میں خود کو ہیرو بنانے کی یا مرکزِ نگاہ ثابت کرنے کی کوشش نہیں کی بلکہ وہ ان چیزوں کو تلاش کرتے رہے جن سے ایک مصنف کی حیرت جاگتی ہے اور مصنفین عالم میں اسے اپنے مرتبے کا ادراک ہوتا ہے۔ حسد اور رقابت کا جذبہ مرجاتا ہے اور رشک کی لہریں جسم میں دوڑ کر تخلیقی اور ادبی فعالیت کو بیدار کر دیتی ہیں۔ اس سفرنامے کی ایک منفرد خوبی یہ ہے کہ اس میں جگن ناتھ آزاد نے اشیا، مظاہر اور مناظر کو تو معمولی سی حیثیت دی ہے لیکن جہاں ادیبوں اور کتابوں کا ذکر آتا ہے تو گویا دبستان کھل جاتا ہے"۔ [2]

"کولمبس کے دیس میں" آزاد کا تیسرا سفرنامہ ہے۔ یہ سفر ۱۹۸۱ء میں پیش آیا۔ آزاد کے دوسرے دو سفرناموں میں اس سفرنامے کی اہمیت زیادہ ہے۔ اس اعتبار سے

---

[1] مظہر امام۔ آفتاب تازہ اور جگن ناتھ آزاد (مشمولہ) کتاب نما کا خصوصی شمارہ۔ ص ۴۴، مرتبہ ایم۔ حبیب خاں۔ اپریل ۱۹۹۴ء۔

[2] انور سدید۔ پشکن کے دیس میں، (مشمولہ) "جگن ناتھ آزاد۔ حیات اور ادبی خدمات" مرتبہ خلیق انجم، ص ۲۰۴۔

نہیں کہ یہ امریکہ اور کینیڈا کا سفرنامہ ہے بلکہ اس اعتبار سے کہ اس سفرنامے میں اہم اور معلوماتی باتیں زیادہ ہیں۔ سفرنامہ پڑھتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ گائیڈ ہمارے ساتھ موجود ہے اور ہر ایک چیز کا نقشہ نہ صرف تاریخی اعتبار سے بیان کر رہا ہے بلکہ شعروشاعری کے ذریعے سے محفل کو سجائے ہوئے ہے۔ ہم خود اپنی آنکھوں سے ان تمام چیزوں کو دیکھ رہے ہیں جنھیں آزاد نے دیکھا، سُنا اور محسوس کیا ہے۔ شاعرانہ حُسنِ بیان نے اس سفرنامے کو پھلجھڑیوں کی طرح منور کر رکھا ہے۔

آزاد نے اس سفرنامے کو چار ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا باب امریکہ کے متعلق ہے۔ دوسرا باب ٹورنٹو کے متعلق اور تیسرا باب امریکہ میں دوبارہ واپسی واشنگٹن میں قیام۔ مشاعروں کا ذکر اور چوتھے باب میں امریکہ سے روانگی۔ انٹرویوز اور ہندوستان کی واپسی پر سفرنامہ ختم ہوتا ہے۔ دوسرے دونوں سفرناموں کے برخلاف اس سفرنامے میں آزاد نے شاعرانہ عنوانات درج کیے ہیں، چند شاعرانہ عنوانات ملاحظہ کیجیے:

چلی بھی جا جرس غنچہ کی صدا پہ نسیم

اے گل بہ تو خرسندم

کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

در سے گزر گیا ہے کوئی بن صدا کیے وغیرہ۔

آزاد کا مغرب کی طرف چھٹا اور امریکہ جانے کا پہلا موقع تھا۔ ایسٹ ویسٹ یونیورسٹی شکاگو کے چانسلر ڈاکٹر وصی اللہ خاں کی دعوت پر آزاد بذریعۂ ٹرین ۱۶ اگست ۱۹۸۱ء کو جموں سے دہلی کے لیے روانہ ہوتے ہیں۔ ۱۷ اگست کی دوپہر دہلی پہنچے۔ ۱۹ اگست کی صبح کے پانچ بجے پالم ایرپورٹ سے بذریعۂ طیارہ روانہ ہوئے۔

آزاد جہاز کے سفر کے متعلق لکھتے ہیں:

"تھوڑی دیر میں آنکھ لگ گئی۔ آنکھ کھلی تو طیارے کا رُخ دیارِ محبوب یعنی پاکستان کی جانب تھا۔ بہت جی چاہا کہ کھڑکی میں سے جھانکوں اور جو کچھ بھی نظر آئے اُسے غنیمت جانوں لیکن رات بھر

جاگنے کے باعث بدن ٹوٹ رہا تھا اور اتنی سکت نہیں تھی کہ کھڑکی
پر نظر جما کے بیٹھوں"۔[۱]

اس کے بعد طیارہ کویت میں آدھے گھنٹے کے لیے رُکا۔ وہاں آزاد جہاز میں بیٹھے بیٹھے کویت کے نظارے سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ لندن میں طیارہ ساڑھے تین گھنٹے کے لیے رُک گیا۔ یہ سفر قریب تیس ۳۰ گھنٹوں کا تھا۔

آزاد امریکہ کی ترقی سے بے حد متاثر ہوئے ہیں۔ اس کو عصرِ حاضر کی جنتِ ارضی کہتے ہیں۔ وہاں کا قانون، لوگوں کا برتاؤ، سکون اور ترقیاتی اشیاء وغیرہ سے آزاد بے حد متاثر ہوئے۔ چند اقتباسات ملاحظہ کیجیے:

"امریکہ میں آکے میں روزِ اوّل ہی سے ٹکنالوجی کے کرشمے دیکھ کر حیران ہو رہا تھا۔ ڈاکٹر خورشید ملک جب مجھے گاڑی میں بٹھا کے باہر جانے لگے تو انھوں نے گاڑی میں رکھے ہوئے ایک بٹن کو دبایا۔ گراج کا دروازہ خود بخود کھل گیا۔ اسی طرح ہم ہسپتالوں کے دروازے پر پہنچے تھے تو وہ اپنی گاڑی میں رکھے ہوئے کسی ایک بٹن کو دبا دیتے تھے۔ ہسپتال کا دروازہ "کھل جا سم سم" کی طرح کھل جاتا تھا"۔[۲]

آزاد میوزیم اور کار کا نقشہ کچھ اس طرح کھینچتے ہیں:

"یونیورسٹی سے چند قدم پر میوزیم تھا۔ یہ میوزیم جو ایک قلعہ نما عمارت میں ہے۔ امریکہ کی سائنسی اور صنعتی ترقی کی منہ بولتی تصویر ہے۔ سائنسی اور صنعتی دنیا میں آج امریکہ کا مقام بہت اونچا ہے اور یہ عجائب خانہ اس بلند مقامی کی ایک علامت ہے"۔

"یہاں ایک عجیب و غریب کار کا ماڈل دیکھا اس کا نام ہے SPIRIT OF AMERICA اور اس کی رفتار ہے چھ سو میل

---

[۱] جگن ناتھ آزاد۔ کولمبس کے دیس میں، ص ۱۹۔ [۲] ایضاً، ص ۲۹۔

فی گھنٹہ۔ یہ کار سڑک پر چھ سو آٹھ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چل چکی ہے اور اس کو سڑک پر اسی رفتار سے چلتا ہوا وہاں کے ٹیلی ویژن پر دکھایا جا رہا تھا۔"

"اسی طرح سے ہوائی جہازوں اور سمندری جہازوں کی سال بہ سال ترقی کی تصویریں اور ماڈل وہاں موجود تھے۔ ہر شعبے میں متعدد ٹیلی فون رکھے تھے۔ آپ کسی ٹیلی فون کو اٹھا کر کان سے لگائیں ریکارڈ آپ کو اس شعبے سے وابستہ موضوع کے متعلق ترقی کی ساری داستان سُنانا شروع کر دے گا۔" [۱]

میوزیم، کار، ہوائی جہازوں کے ذکر کے علاوہ اپالو کے کیپسول کا بھی ذکر ہے جو چاند سے ہو کر زمین پر واپس آیا تھا۔ "آرٹ انسٹیٹیوٹ آف شکاگو" میں جارج سیگال کا بنایا ہوا ایک خوبصورت مجسّمہ ہے۔ آزاد کے خیال میں اس طرح کے آرٹ گیلری دیکھنے کو کم ملتے ہیں۔ روزمرّہ کے معمولات کا ذکر کرتے ہوئے آزاد ایک جگہ لکھتے ہیں:

"ایک روز میں ڈاکٹر خورشید ملک کے ساتھ گاڑی میں جا رہا تھا دیکھا کہ ایک مکان کی بنیاد کھود رہے ہیں پتا چلا کہ اس مکان کو ٹرک پر رکھ کر کہیں اور جگہ لے جائیں گے۔ جہاں یہ اسی طرح ٹرک سے اُتار کر رکھ دیا جائے گا۔" [۲]

شکاگو شہر کا بجٹ سارے ہندوستان کے بجٹ سے زیادہ ہے۔ آزاد اس سلسلے میں بتاتے ہیں کہ ۱۹۷۷ء میں ہندوستان کی آمدنی ۸۶ ملین ڈالر تھی اور ۱۹۸۰ء میں شکاگو شہر کی آمدنی ۹۷ ملین ڈالر تھی۔

اس سفرنامے میں شعر و ادب کی محفلوں کے ذکر کے علاوہ امریکی ادیب و شعراء کا تعارف اور خاکے بھی موجود ہیں۔ مصنف کہیں کہیں سرسری سا ذکر کر کے آگے بڑھ گئے

---

[۱] جگن ناتھ آزاد۔ کولمبس کے دیس میں، ص ۳۷۔ [۲] ایضاً، ص ۵۹۔

ہیں۔ کئی معروف و مقبول ہستیوں سے متعارف کروایا گیا ہے۔ آزاد ڈاکٹر کلیم عاجز سے بہت محبت کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب ڈاکٹر کلیم عاجز امریکہ کے سفر میں امیگریشن کے تعلق سے کچھ وقت کے لیے CUSTODY میں رکھے گئے تو آزاد لکھتے ہیں کہ مجھے رات بھر نیند نہیں آئی۔ بے چینی کے عالم میں تھا۔

سفر نامے میں ڈاکٹر وصی اللہ خاں وائس چانسلر آف ایسٹ ویسٹ یونیورسٹی شکاگو کا بھی ایک مختصر تعارف اور خاکہ موجود ہے۔ ڈاکٹر خورشید ملک، اعجاز نسرین، افتخار نسیم وغیرہ خاص طور پر اہم نام ہیں۔ جن کا ذکر آزاد نے مفصّل طور پر کیا ہے۔ بیوی بچے، گھر کا ماحول اور رہن سہن تک کا نقشہ کھینچا ہے۔ اس سفر نامے میں شعراء وادبا کی تعداد بھی بہت زیادہ ہے۔ بہر حال ان میں چند اہم نام یہ ہیں:

پروفیسر اسد حسین جنھوں نے آزاد کو نارتھ ایسٹ الی نائے یونیورسٹی میں لکچر کرنے کا دعوت نامہ بھیجا۔ اسد حسین کے دوست سیّد سلمان (سیّد سلیمان ندوی مرحوم کے فرزند) ڈاکٹر ٹامس بیلنٹائن ارونگ اور ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی، ان تینوں دوستوں میں نجات اللہ صدیقی اور سیّد سلمان ندوی کا مختصر سا تعارف بھی اس سفر نامے میں موجود ہے۔

ڈاکٹر عبد الوحید قمری، مہر رضوی، ڈاکٹر حیدر امام، ان کی بیگم ثمینہ حیدر امام، پروفیسر عبد الباسط، پروفیسر عبد الوحید فخری، عابد اللہ غازی احمد خاں، قتیل شفائی، جمیل الدین عالی، حمایت علی شاعر، پروین فنا اور سیّد صہبا اختر وغیرہ۔ ان میں بعض حضرات ایسے ہیں جو ہندوستان و پاکستان سے مشاعرے میں شرکت کی غرض سے امریکہ گئے تھے اور بعض حضرات وہیں مقیم ہیں۔ امریکہ، لندن، ٹورنٹو اور واشنگٹن ان مقامات میں رہنے والے دوست احباب کے نام بھی بہت زیادہ ہیں جنھوں نے آزاد کی خاطر تواضع کی اور انھیں عزت سے نوازا۔

آزاد نے جن عمارتوں کا ذکر کیا ہے ان میں واشنگٹن، نیویارک، شکاگو اور ٹورنٹو کی عمارتیں بھی ہیں۔ انھوں نے کویت کی فلک بوس عمارتوں کا بھی ذکر کیا ہے۔ بہائی ٹیمپل کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"بہائی ٹیمپل کی عمارت آسمان سے باتیں کرتی نظر آئی۔ یہ ٹیمپل ۱۹۵۲ء
میں تعمیر ہوا تھا۔ اس وقت دنیا کے مختلف حصّوں سے لاکھوں سیاح
اسے دیکھ چکے ہیں۔"[1]

دنیا کی سب سے اونچی عمارت سیرز ٹاور SEARSTOWER کا ذکر بھی آزاد نے بڑے
دلکش انداز میں پیش کیا ہے۔ لکھتے ہیں :

"دنیا کی سب سے اونچی عمارت ہے جس میں ایک سو دس منزلیں ہیں
اس کی پہلی منزل ایک فرلانگ لمبی اور ایک فرلانگ چوڑی ہے۔ جوں
جوں اوپر جاتے ہیں ہر منزل کا رقبہ کچھ کم ہو جاتا ہے۔ لفٹ ہمیں
ایک منٹ سے کم وقفے میں ایک سو تیسری منزل پر لے گئی جو زمین
سے ۱۳۵۳ فٹ کی بلندی پر ہے۔ وہاں میلہ لگا تھا۔ اس کے
باوجود اتنی جگہ تھی کہ ہم آسانی سے گھوم پھر سکتے تھے۔ اس منزل سے
سارا شکاگو نظر آرہا تھا۔"[2]

آزاد اپنے سفر کے دوران ہر چیز کا مکمل جائزہ لیتے ہیں۔ عمارتوں کی لمبائی چوڑائی اور
بنانے والے تک کا نام نوٹ کرتے ہیں۔

آزاد کے اس سفرنامے میں حسین دوشیزاؤں کا ذکر بھی بے باکانہ طور پر کیا گیا
ہے۔ جھیل کے کنارے، نیم عریاں لڑکیوں کا ذکر (جو غسل کر رہی ہیں) ایرپورٹ و دیگر
مقامات کے حسیناؤں کا ذکر بھی بڑے دلکش انداز میں پیش کیا گیا ہے ایک اقتباس
ملاحظہ کیجیے :

"جھیل کا پانی تو ساکن تھا لیکن اس کے کنارے کنارے بیچ
BEACH پر انسانی اور بالخصوص نسوانی حُسن کا سمندر ٹھاٹھیں مار
رہا تھا۔ یہ سمندر کئی میل تک چلا گیا تھا۔ ہر رنگ و نسل کی نیم عریاں

---

[1] جگن ناتھ آزاد۔ کولمبس کے دیس میں، ص ۴۲۔ [2] ایضاً، ص ۴۸، ۴۹۔

سے بھی زیادہ عریاں زیادہ تر غسل ہی کے لباس میں لڑکیاں اور عورتیں
جنت نگاہ تھیں۔ بوس و کنار کے مناظر بھی دیکھنے میں آئے۔ غالبؔ
کلکتے ہی تک پہنچے تھے اور نازنینِ بتانِ خود آرا کو دیکھ کر انھوں نے
دو چار شعر ایسے کہہ دیے تھے جو آج تک اردو شاعری میں شاہکار
کی حیثیت رکھتے ہیں اگر وہ یہ منظر دیکھتے تو نہ جانے ان کے قلم
سے کیا کیا گوہرِ آبدار نکلتے۔" [۱]

طیارے میں حسیناؤں کو دیکھنے کے بعد کہتے ہیں: "ایک ہجوم کے ساتھ جس میں پری وشوں
کی کمی نہیں تھی طیارے میں جا کے اپنی جگہ سنبھالیں۔" [۲]

آزاد نے امریکہ کے لیک شیگن کے کنارے بھی اسی طرح کے نیم عریاں جسمانی
منظر دیکھے۔ ہندوستان ٹائمز کے برطانیہ میں دفتر کے انچارج نامور جرنلسٹ رکھشت پوری
کی سکریٹری سے بھی آزاد بے حد متاثر ہوئے۔ آزاد لکھتے ہیں:

"یہاں بہت دیر رکھشت پوری سے باتیں رہیں۔ انھوں نے
اپنی نئی سکریٹری سے ملوایا اور بتایا کہ آج ہی انھوں نے یہاں کام
شروع کیا ہے۔ مزید تعارف کراتے ہوئے انھوں نے کہا کہ ان کا
ان کا تعلق اسپین سے ہے اور یہ بات ان کی غزالی آنکھوں سے
ظاہر تھی ؎

آج بھی اس دیس میں عام ہے چشم غزال
اور نگاہوں کے تیر آج بھی ہیں دل نشیں

نام ان کا یاد نہیں رہا۔ خوبصورت چہرہ اور خدوخال نظر کے سامنے ہیں۔"

اس سفر نامے میں مشاعروں کا ذکر کثرت سے ہے۔ مشاعروں کا ذکر کرتے ہوئے
آزاد کہتے ہیں "کبھی کبھی مجھے گمان ہوتا تھا کہ میں ہندوستان یا پاکستان میں اپنا کلام سُنا

---

[۱] جگن ناتھ آزاد۔ کولمبس کے دیس میں، ص ۵۱۔ [۲] ایضاً، ص ۷۳۔

رہا ہوں۔ ان مشاعروں میں ہندوپاک کے شعرا کے علاوہ مقامی شعرا و ادبا کا ذکر خاصی دلچسپ انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ بہت سے یونیورسٹیوں کے احوال و کوائف ہیں بلکہ بعض یونیورسٹیوں کے آزاد نے کورس تک گنائے ہیں۔ ان یونیورسٹیوں میں ایسٹ ویسٹ یونیورسٹی شکاگو امریکہ کی جدید ترین یونیورسٹیوں میں ہے۔ درس و تدریس کے مضامین کی بھی آزاد نے نشاندہی کی ہے۔ اسی طرح اسلامک سنٹر آف شکاگو کا ذکر وہاں کے اساتذہ، طالبِ علموں کا ذکر، شکاگو یونیورسٹی لائبریری، نارتھ ایسٹرن یونیورسٹی کا ذکر موجود ہے۔

آزاد نے تقریباً پانچ صفحوں میں شکاگو یونیورسٹی لائبریری، نارتھ ایسٹرن الی نائے یونیورسٹی کی عمارتوں، لائبریریز، اساتذہ، طلبہ اور کتابوں سے دلچسپی کے متعلق مواد فراہم کیے ہیں۔

اس سفر کے دوران آزاد نے تین چار انٹرویوز دیے ہیں جو انتہائی اہمیت کے حامل ہیں۔ مہر رضوی نے ریڈیو کے لیے انٹرویو، یہ انٹرویو پندرہ منٹ کا تھا۔ موضوع تھا "اقبال عالمی کانگریس منعقدہ سیالکوٹ"۔ اس کے بعد اور دو انٹرویوز دیے۔ WTAQ ریڈیو اور WEEF ریڈیو کے ذریعے آزاد کے دو انٹرویوز نشر ہوئے۔ پہلا انٹرویو امریکہ کے بارے میں تھا اور دوسرا مشاعروں کے آغاز و ارتقا کے متعلق۔ ان انٹرویوز کے علاوہ پروفیسر عابد اللہ خاں غازی اور افتخار نسیم، احمد رضا خاں نے بھی دو انٹرویوز دیے۔ یہ دونوں انٹرویوز دو گھنٹے کے تھے۔ ایک کا موضوع تھا "آزاد کی شعری تخلیقات" اور دوسرے کا "نثری تخلیقات"۔ اس کے بعد آزاد کے دو اہم انٹرویوز ہیں۔ ایک انٹرویو بی بی سی (ریڈیو) کے لیے اور دوسرا برمنگھم ٹیلی ویژن کے لیے۔ بی بی سی کا انٹرویو وقار صاحب نے لیا جو پندرہ منٹ کا تھا۔ برمنگھم ٹیلی ویژن میں آزاد نے اردو ہندی کے ایک دوسرے پر اثرات کے بارے میں جوابات دیے۔ ان میں بعض انٹرویوز مختلف رسالوں میں شائع بھی ہو چکے ہیں۔

اس سفرنامے میں آزاد نے اپنے دوست احباب کا تفصیلی ذکر کیا ہے۔ ان کے

بچوں کے ساتھ محبت، برتاؤ، غرض خوشیوں کی محفل ہے۔ بعض دوست احباب کے بچے بچیوں کے نام ان کے عادات و اطوار کا ذکر بھی موجود ہے۔ چنانچہ خورشید ملک کے بچوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"تینوں بچے بہت خوش تمیز، مؤدب اور فرمانبردار ہیں۔ تینوں اپنے والدین کی طرح صاف اور شستہ اردو میں بات کرتے ہیں۔ ان کی پرورش خالص ہندوستانی کلچر اور اسلامی کلچر میں ہو رہی ہے۔ ڈاکٹر خورشید ملک نماز روزے کے پابند ایک ثقہ انسان ہیں۔" [۱]

آزاد نے دوسرے دو سفرناموں کی طرح اس سفرنامے میں بھی جگہ جگہ مناظر کی عکاسی کی ہے۔ کویت کے ہوائی اڈے سے ہی بلکہ ہوائی جہاز میں بیٹھے ہوئے۔ وہاں کی رنگینیاں، ریگستانی زمین اور عمارتوں کا ذکر کرتے ہوئے خوب صورت اور دل کش منظر کشی کرتے ہیں۔ دو اقتباسات ملاحظہ کیجیے۔ انڈیانا کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"شکاگو کی طرح یہاں بھی جھیل کے کنارے حسن و رنگ کی ایک کائنات آباد تھی۔ حسن، صنفِ نازک کا، غسل کے لباس میں جھیل کے اندر بھی اور کنارے پر بھی جنت نگاہ بنا ہوا تھا۔ مشگیں جھیل تو پُر سکون تھی لیکن جھیل کے کنارے نیم عریاں حسین جسموں کے سمندر نے ایک تموج کی کیفیت پیدا کر رکھی تھی۔" [۲]

آزاد کئی مناظر سے لطف اندوز ہوتے ہوئے کشمیر کو یاد کرنے لگتے ہیں۔ اشجار، پہاڑ اور جھیل کے مناظر میں وہ کشمیر کی سی کیفیت محسوس کرتے ہیں۔ ایک مقام پر لکھتے ہیں:

"کئی موقعوں پر سرو کے اونچے اونچے اشجار دیکھ کر کشمیر یاد آگیا

۱۔ جگن ناتھ آزاد۔ کولمبس کے دیس میں، ص ۵۴۔ ۲۔ ایضاً، ص ۶۶، ۶۷۔

اور کشمیر تو اس سفر میں کئی بار یاد آیا تھا۔ اگر مناظر کو دیکھیں تو کشمیر
اسی سرزمین کا حصّہ معلوم ہوتا ہے۔ انتہائی خوبصورت حصّہ۔
اس جنگل میں کئی سڑکیں ایسی تھیں جو اونچے اونچے پہاڑوں سے
گزر کے جھیل کے کنارے جا پہنچتی تھیں۔ دریائے وباش اپنے
خوبصورت ہرے بھرے کناروں کے درمیان بہتا ہوا کئی بار ہمارے
قریب سے گزرا اور دو ایک بار ہم بھی اس کے اوپر سے گزرے
اس طرح سرسبز و شاداب ماحول میں کوئی گھنٹے گزر گئے اور
جب ہم اس سے باہر نکلے تو "مٹیگن سٹی" ہمارے سامنے تھا۔[1]

اس سفرنامے میں تقریباً ہر مقام پر مناظر کی عکاسی کی گئی ہے چونکہ شاعر کی زبان سے یہ منظر ادا ہوئے ہیں اس لیے ماحول اور مناظر میں زیادہ جان پڑ گئی ہے۔

آزاد نے اگرچہ یورپ، امریکہ، روس اور کنیڈا غرض بہت سارے ممالک اور شہروں کا دورہ کیا ہے، ان کو قریب سے دیکھا ہے مگر وہ صرف اپنے وطن سے پیار کرتے ہیں۔ یہاں کی تہذیب و تمدّن کو کسی بھی قیمت پر گنوانا پسند نہیں کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ یوروپ میں اپنے بچوں کو دیکھ کر مستقبل کی فکر میں لگ جاتے ہیں۔ ان کے نزدیک مقصدِ حیات روپیہ کمانا نہیں بلکہ اپنی زبان، کلچر اور تمدّن کی حفاظت ہے۔ اپنے مذہب کی پیروی کرنا اور ہمیشہ اس پر عمل کرنا ہی ہمارا مقصدِ حیات ہے۔ اگر آج وہ کسی وجہ سے ان پر عمل کر رہے ہیں تو ویسے ملکوں میں آنے والی نسل کے لیے کوئی ضمانت نہیں بلکہ موجودہ نسل بھی بے راہ روی کا شکار ہو رہی ہے۔ اپنے اجداد کی وراثت کو کھو رہی ہے۔ آزاد اپنے بچوں کے بارے میں یہ سب سوچتے ہوئے مایوس ہو جاتے ہیں۔ اپنی بیٹی پر ملا، داماد، نواسے اور نواسی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں؛

---

[1] جگن ناتھ آزاد۔ کولمبس کے دیس میں، ص ۶۷۔

"پرملا کا معاملہ تو خیر یہ ہے کہ وہ ایک ایسے ماحول میں ہے
جہاں اردو، ہندی اور پنجابی میں بات کرنے کا سوال ہی نہیں
ہے میں یہ سوچتا ہوں کہ امریکہ، کینڈا، یورپ اور انگلستان
کے ان علاقوں میں جہاں ہندوستانی اور پاکستانی خاصی
تعداد میں آباد ہیں اور اپنے اپنے کلچر، زبان اور روایات کے
تحفّظ کے لیے کوشاں ہیں۔ آنے والی نسلوں کے مستقبل کی
کیا ضمانت ہے؟ اپنے ملک کو چھوڑ کر باہر جانے میں تو کوئی
قباحت نہیں۔ اور "کریں گے اہلِ نظر تازہ بستیاں آباد" بھی
ایک حقیقت ہے لیکن سوال یہ ہے کہ کیا مستقبل میں ان
بستیوں کے تشخص کی پہچان باقی رہ سکے گی؟ اور اگر نہ رہ سکی
تو مقصدِ حیات ان ملکوں میں آکر روپیہ کمانے کے سوا اور
کیا رہ جائے گا"۔[1]

"نشانِ منزل" میں شامل ایک ریڈیائی تقریر "کچھ یادیں دوسرے ملکوں کی" کئی ممالک کی سیر کے تأثرات ہیں۔ آزاد کی اس تقریر میں بھی اردو دوستی کا ثبوت موجود ہے۔ آزاد کے مطابق دنیا کا شاید ہی کوئی ملک ہوگا جہاں اردو بولنے والے اور اردو سے محبّت رکھنے والے لوگ نہ ملیں۔ بعض ملکوں میں لوگ اردو نہیں جانتے مگر اقبال، غالب، پریم چند، جوش اور فیض وغیرہ کے بارے میں جاننا چاہتے ہیں۔ آزاد کی اس تقریر میں فرانس، جرمن، اٹلی، بلجیم، اسپین، سوئٹزرلینڈ، مصر، سوویت روس، بنگلہ دیش، عدن، نیپال اور پاکستان وغیرہ کا تذکرہ موجود ہے۔

آزاد نے اپنی اس تقریر میں "مسجد قرطبہ" کی زیارت کے واقعے کو تفصیل سے

---

[1] جگن ناتھ آزاد۔ کولمبس کے دیس میں، ص ۱۲۷۔

پیش کیا ہے۔ اقبالؔ کی نظم "مسجد قرطبہ" پڑھنے کے بعد سے ہی آزادؔ کی یہ خواہش تھی کہ اس کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کریں گے۔ آخر کار یہ آرزو پوری ہوئی۔ "مسجد قرطبہ" کی زیارت کا شوق ایک عاشق جیسا محسوس ہوتا ہے۔ لکھتے ہیں:

"میں نے نہ جانے کس کس طرح مسجد قرطبہ کے بارے میں لوگوں سے پوچھا، انکوائری آفس میں، ہوٹلوں میں، راہ چلتے لوگوں سے، چوراہے پر کھڑے سپاہیوں سے، لیکن میری بات سمجھ نہ سکا۔ میں نے متعدد الفاظ استعمال کیے مگر سب بے کار"۔[1]

آخر کتابوں کی ایک دکان میں اسپین کے متعلق ہسپانوی زبان میں ایک کتاب موجود تھی جس میں مسجد قرطبہ کی تصویر تھی۔ اس تصویر کے ذریعے سے آزادؔ مسجد قرطبہ پہنچے۔ مسجد کی ہر ایک چیز کا بغور مشاہدہ کیا۔ آزادؔ لکھتے ہیں کہ "اس وقت مجھ پر مسرت اور کامرانی کی ایک ایسی کیفیت طاری تھی کہ میرا دل دھڑک رہا تھا"۔

روس کے متعلق جو واقعات ہیں وہ اب آزادؔ کی کتاب "پشکن کے دیس میں" میں تمام واقعات شامل ہو چکے ہیں۔ یہاں روس کے متعدد شہروں اور قصبوں میں اردو جاننے والوں کا ذکر موجود ہے۔ نیپال اور رنگون کے تاثرات بھی کچھ اسی طرح کے ہیں۔ رنگون میں بہادر شاہ ظفر کو یاد کر کے آزادؔ جذباتی ہو جاتے ہیں۔

آزادؔ کے اب تک تین سفرنامے شائع ہو چکے ہیں۔ امریکہ اور کینیڈا کا ایک اور سفرنامہ مکمل ہو جانے کے باوجود ابھی تک غیر مطبوعہ ہے۔ متعدد سفرنامے ادھورے اور نامکمل ہیں۔ ان سب سفرناموں سے آزادؔ کی ذہانت، ادبی صلاحیت، ذوقِ طبیعت اور متعدد صلاحیتوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ ان کے تمام سفرناموں میں دل کشی ہر جگہ موجود ہے۔ سفرناموں کی زبان سلیس اور سادہ ہے۔ اسلوب اور اندازِ بیان بہت ہی دلچسپ ہے۔ آزادؔ نے جس انداز میں سفرنامے لکھے ہیں اس سے قاری کی دلچسپی

---

[1] جگن ناتھ آزاد۔ نشانِ منزل، ص ۲۴۴۔

اور شوق میں اضافہ ہوتا ہے۔ آزآد نے اپنے سفرناموں میں قاری کو جہاں اہم
ادبی شخصیتوں سے متعارف کرایا ہے وہاں تاریخی مقامات کی سیر بھی کرائی ہے۔ ان
سفرناموں میں جستجو اور شوق کا جذبہ کہیں ختم نہیں ہوتا۔ بہر حال یہ سفرنامے ایک
طرف آزآد کی خودنوشت سوانح ہیں تو دوسری طرف دلچسپ اور کارآمد واقعات
سے لبریز سفرنامے ہیں۔

کتابیات

۱۔ طبل و علم (مجموعۂ کلام) جگن ناتھ آزاد (۱۹۴۸ء) کشمیر بیورو آف انفارمیشن، نئی دہلی۔
۲۔ بیکراں (مجموعۂ کلام) جگن ناتھ آزاد (۱۹۵۶ء) مکتبہ شاہراہ، اردو بازار، دہلی
۳۔ " " " " (۱۹۹۲ء) محروم میموریل لٹریری سوسائٹی، نئی دہلی
۴۔ ستاروں سے ذرّوں تک (مجموعۂ کلام) جگن ناتھ آزاد (۱۹۵۳ء) مکتبہ شاہراہ، دہلی
۵۔ وطن میں اجنبی (مجموعۂ کلام) جگن ناتھ آزاد (۱۹۶۴ء) مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی
۶۔ نوائے پریشاں " " " (۱۹۶۱ء) ادارہ انیس اردو ۴۴ چوک الہ آباد
۷۔ " " " " (۱۹۷۳ء) مکتبہ علم و دانش، لاہور
۸۔ بچوں کی نظمیں " " " (۱۹۸۰ء) ترقی اردو بورڈ ۸ ویسٹ بلاک، آر کے پورم، نئی دہلی
۹۔ بوئے رمیدہ (مجموعۂ کلام) جگن ناتھ آزاد (۱۹۹۰ء) مونومینٹل پبلشرز، نئی دہلی
۱۰۔ گہوارۂ علم و ہنر " " " (۱۹۸۸ء) ساغر نظامی میموریل کمیٹی، نئی دہلی
۱۱۔ اردو (طویل نظم) " " (۱۹۵۲ء) مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی
۱۲۔ ماتم نہرو " " " (۱۹۶۵ء)
۱۳۔ ابوالکلام آزاد " " (۱۹۵۸ء) ادارہ فروغِ اردو، لکھنؤ
۱۴۔ اجنتا " " (۱۹۶۶ء) مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی
۱۵۔ شاعر کی آواز، مترجم جگن ناتھ آزاد (۱۹۶۶ء) مکتبہ قصرِ اردو، اردو بازار، دہلی

۱۶۔ دہلی کی جامع مسجد۔ جگن ناتھ آزاد (۱۹۶۶ء) ادارہ تعمیرِ ادب، کراچی، پاکستان
۱۷۔ ماتم سالک " " (۱۹۸۱ء) ماڈرن پبلشنگ ہاؤس دریا گنج نئی دہلی
۱۸۔ حیاتِ محروم " " (۱۹۸۷ء) انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی
۱۹۔ جنوبی ہند میں دو ہفتے " " (۱۹۵۱ء) دہلی کتاب گھر، دہلی
۲۰۔ اقبال اور اس کا عہد " " (۱۹۷۳ء) ادارہ انیس اردو، الہ آباد
۲۱۔ " " " " (۱۹۸۹ء) قوسین خاں چیمبرز مولچند اسٹریٹ انار کلی لاہور
۲۲۔ اقبال اور مغربی مفکرین " " (۱۹۷۶ء) مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی
۲۳۔ اقبال اور کشمیر " " (۱۹۷۷ء) علی محمد اینڈ سنز، لال چوک سری نگر
۲۴۔ اقبال کی کہانی " " (۱۹۸۸ء) ترقی اردو بورڈ، ۸ ویسٹ بلاک آر کے پورم نئی دہلی
۲۵۔ اقبال: زندگی، شخصیت اور شاعری۔ جگن ناتھ آزاد (۱۹۷۷ء) این سی ای آر ٹی نئی دہلی
۲۶۔ محمد اقبال ایک ادبی سوانح حیات۔ جگن ناتھ آزاد (۱۹۸۵ء) ماڈرن پبلشنگ ہاؤس دریا گنج نئی دہلی
۲۷۔ مرقع اقبال ۔ جگن ناتھ آزاد (۱۹۷۷ء) پبلی کیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی
۲۸۔ فکرِ اقبال کے بعض اہم پہلو (مرتب) جگن ناتھ آزاد (۱۹۸۲ء) شیخ غلام محمد اینڈ سنز، سری نگر
۲۹۔ ہندوستان میں اقبالیات آزادی کے بعد اور دوسرے توسیعی لکچر۔ جگن ناتھ آزاد (۱۹۹۱ء) مکتبہ علم و دانش، مزنگ لاہور
۳۰۔ اردو ریڈ یو فیچر۔ جگن ناتھ آزاد (۱۹۷۷ء) مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی
۳۱۔ میرے گزشتہ روز و شب خود نوشت سوانح حیات۔ جگن ناتھ آزاد (۱۹۶۵ء) مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی
۳۲۔ بہ سلسلہ روز و شب (غیر مطبوعہ) جگن ناتھ آزاد، صفحات ۱۶۱۔
۳۳۔ آنکھیں ترستیاں ہیں۔ جگن ناتھ آزاد (۱۹۸۱ء) ماڈرن پبلشنگ ہاؤس، دہلی
۳۴۔ نشانِ منزل " " " (۱۹۸۲ء)
۳۵۔ پشکن کے دیس میں " (۱۹۸۶ء) مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی

۳۶۔ کولمبس کے دیس میں، جگن ناتھ آزاد (۱۹۸۷ء) مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی

۳۷۔ جگن ناتھ آزاد۔ حیات اور ادبی خدمات مرتبہ خلیق انجم (۱۹۹۳ء) محروم میموریل لٹریری سوسائٹی

۳۸۔ ارمغانِ آزاد مرتبہ ڈاکٹر ظہور الدین (") " " "

۳۹۔ جگن ناتھ آزاد۔ ایک مطالعہ، مرتبہ محمد ایوب واقف (۱۹۸۸ء) علمی مجلس، دہلی

۴۰۔ جگن ناتھ آزاد اور اس کی شاعری، مرتبہ حمیدہ سلطان احمد، (۱۹۹۱ء) موتومینٹل پبلشرز، نئی دہلی

۴۱۔ جگن ناتھ آزاد نمبر "پرواز ادب" پٹیالہ کا خاص نمبر، شمارہ ۶۵، مئی، جون ۱۹۸۸ء۔

۴۲۔ گوشۂ آزاد (۱۹۸۴ء) سہ ماہی "توازن" مالیگاؤں، مہاراشٹر

۴۳۔ جگن ناتھ آزاد نمبر (۱۹۸۶ء) ماہنامہ العطش، جموں۔ مدیر راجکمار چندن۔

۴۴۔ جگن ناتھ آزاد نمبر (بدایوں) مدیر حبیب سوز، ۱۹۸۸ء، سہ ماہی "لمحے لمحے" بدایوں

۴۵۔ ترقی پسند تحریک اور اردو نظم۔ ڈاکٹر یوسف تقی (۱۹۸۰ء) دیارِ فکر وفن، کلکتہ ۷۰۰۰۱۶

۴۶۔ تنقید و تجزیہ۔ ابو محمد سحر (۱۹۶۱ء) کتابستان ۱۷۔ کملا نہرو روڈ، الہ آباد

۴۷۔ بزمِ ماتم۔ باوا کرشن گوپال مغموم (۱۹۸۰ء) نامی پریس لکھنؤ

۴۸۔ رثائی ادب میں ہندوؤں کا حصہ، مرتبہ جعفر حسین (۱۹۸۳ء) اردو پبلشرز، نظیر آباد، لکھنؤ

۴۹۔ اردو غزل، مرتبہ ڈاکٹر کامل قریشی (۱۹۸۷ء) اردو اکادمی، دہلی

۵۰۔ اردو مرثیہ، مرتبہ ڈاکٹر شارب ردولوی (۱۹۹۱ء) " "

۵۱۔ جدید شاعری، ڈاکٹر عبادت بریلوی۔ ۱۹۸۳ء

۵۲۔ مختصر تاریخ ادب اردو (بعد ترمیم و اضافہ) ڈاکٹر سید اعجاز حسین، اردو کتاب گھر، نئی دہلی

۵۳۔ آزادی کے بعد دہلی میں اردو غزل۔ مرتبہ پروفیسر عنوان چشتی (۱۹۹۲ء) اردو اکادمی دہلی

۵۴۔ دکنی رباعیاں۔ پروفیسر سیدہ جعفر

۵۵۔ کلیاتِ اقبال (اردو) محمد اقبال (۱۹۸۱ء) اعتقاد پبلشنگ ہاؤس سوئی والان، دہلی

۵۶۔ اسرارِ خودی۔ محمد اقبال

۵۷ تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ (محمد اقبال) مترجم سید نذیر نیازی۔ اسلامک بک سنٹر، نئی دہلی

۵۸۔ فکرِ اقبال۔ خلیفہ عبدالحکیم (۱۹۷۷ء) ایجوکیشنل بک ہاؤس ایڈیشن
۵۹۔ اقبال پر ہمہ جہتی مذاکرہ (۱۲ تا ۲۳ اپریل) ۱۹۷۷ء۔ اقبال صدی میوزیم جواہر لال نہرو یونیورسٹی
۶۰۔ کلامِ اقبال میں قرآنی آیات واحادیث اور مذہبی اصطلاحات کا جائزہ (۱۹۹۵ء) راقم التحریر۔ انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی
۶۱۔ اردو میں طویل نظم نگاری کی روایت وارتقا۔ ڈاکٹر روشن اختر کاظمی (۱۹۸۴ء) موڈرن پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی
۶۲۔ اقبال کا فن۔ مرتبہ گوپی چند نارنگ (۱۹۸۳ء) ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی
۶۳۔ نقوش اقبال۔ مولانا سید ابوالحسن ندوی (۱۹۸۵ء) مجلس تحقیقات ونشریات، لکھنؤ
۶۴۔ اقبال۔ کچھ مضامین (۱۹۷۹ء) انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی
۶۵۔ اقبال اور کشمیر۔ سلیم خاں گمی (۱۹۷۷ء) یونیورسل بکس لاہور
۶۶۔ اقبال اور مغرب۔ مرتبہ آل احمد سرور (۱۹۸۱ء) اقبال انسٹی ٹیوٹ کشمیر یونیورسٹی سری نگر[۶]
۶۷۔ ڈاکٹر خلیق انجم۔ شخصیت اور ادبی خدمات۔ مرتبہ ایم۔ حبیب خاں، جون ۱۹۹۱ء، ماہنامہ کتاب نما، جامعہ نگر دہلی
۶۸۔ آزادی کے بعد غزل کا تنقیدی مطالعہ۔ ڈاکٹر بشیر بدر (۱۹۸۱ء) انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی
۶۹۔ اقبال اور انسان۔ اشفاق حسین (۱۹۷۴ء) آندھرا پردیش ساہتیہ اکادمی، اپریل ۱۹۷۴ء
۷۰۔ رباعیاتِ محروم۔ تلوک چند محروم (۱۹۵۴ء) رسالہ بیسویں صدی، نئی دہلی
۷۱۔ گنج معانی۔ تلوک چند محروم (۱۹۹۵ء) محروم میموریل لٹریری سوسائٹی، نئی دہلی
۷۲۔ افکارِ محروم۔ مرتبہ مالک رام (۱۹۹۳ء) " "
۷۳۔ ایک نادر سفرنامہ۔ عبدالغفار خاں (۱۹۸۲ء) مکتبہ اسلوب پوسٹ بکس نمبر ۲۱۱۹، کراچی ۱۸
۷۴۔ اردو رباعیات۔ ڈاکٹر سلام سندیلوی (۱۹۶۳ء) نسیم بک ڈپو
۷۵۔ اردو میں فنِ سوانح نگاری کا ارتقا (۱۹۷۴ء) اعتقاد پبلشنگ ہاؤس، دہلی

۷۶۔ ابتدائی کلامِ اقبال (بہ ترتیب مہ و سال) ڈاکٹر گیان چند جین (۱۹۸۸ء) اردو ریسرچ سنٹر، حیدر آباد

۷۷۔ مطالعۂ اقبال۔ اقبال سیمینار منعقدہ لکھنؤ (۱۹۷۸ء) اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ

۷۸۔ اقبال اور دتی۔ عبد القوی دسنوی (جون ۱۹۷۸ء) نئی آواز جامعہ نگر، نئی دہلی

۷۹۔ تجربہ و تجزیہ۔ ڈاکٹر سلام سندیلوی

۸۰۔ نعتیہ کلام "Homage A Mohomet"

ترجمہ فرانسیسی میں Edition through Zorve Rene Bolanger Paris 1990

"Ajanta"

۸۱۔ "اجنتا" ۱۹۹۱ء

Western Book Depot New Delhi

۸۲۔ Iqbal his poetry and Philosophy University fo Mysore

۸۳۔ Iqbhl Mind and Art ۱۹۸۸ - ۱۹۸۳ء

نیشنل بک ہاؤس اُردو بازار، لاہور، پاکستان

۸۴۔ دنیا میرا گاؤں (سفر نامے) خواجہ غلام السیدین۔ مرتبہ ڈاکٹر سید فرحت حسین، سیدین میموریل ٹرسٹ، جامعہ نگر، نئی دہلی

۸۵۔ جل تھل۔ محمد اجمل نیازی (۱۹۸۰ء) غالب پبلشرز، لاہور

۸۶۔ نقادانِ اقبال۔ ڈاکٹر سید محمد عبداللہ

۸۷۔ اردو شاعری میں ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے مرقعے" مقالہ نگار سید اختر (۸۴-۱۹۸۳ء) شعبۂ اردو یونیورسٹی آف حیدر آباد، اندرا گاندھی میموریل لائبریری

۸۸۔ حیدر آباد میں اردو مرثیہ آزادی کے بعد۔ مقالہ برائے ایم فل۔ سیدہ زہرہ بیگم ۱۹۸۹ء۔ شعبۂ اردو یونیورسٹی آف حیدر آباد۔ اندرا گاندھی میموریل لائبریری۔

رسائل واخبارات

۱۔ "شیرازہ" (شاعروں کا منتخب کلام) ۱۹۷۲ء۔ مرتبین: مخمور سعیدی، گوپال متل۔ پرتاپ اسٹریٹ، دریا گنج، نئی دہلی

۲۔ ماہنامہ "سب رس" (حیدر آباد) جون ۱۹۵۲ء

۳۔ ماہنامہ "شاعر" جلد ۴۵، شمارہ ۲۔ فروری ۱۹۷۴ء

۴۔ "نقوش" اقبال نمبر۔ شمارہ ۱۲۱، ستمبر ۱۹۷۷ء

۵۔ رسالہ "اقبالیات" لاہور۔ جولائی، ستمبر ۱۹۸۶ء

۶۔ "توازن" سہ ماہی مالیگاؤں، مرتبین: عتیق احمد، مناظر عاشق

۷۔ "آنند" (ڈائجسٹ) سالِ اوّل شمارہ ۳، نومبر ۱۹۹۳ء۔ گوبند مترا روڈ پٹنہ

۸۔ "شمع" ماہنامہ دہلی۔ فروری ۱۹۷۷ء

۹۔ "برہان" ماہنامہ دہلی۔ دسمبر ۱۹۶۶ء

۱۰۔ "آجکل" دہلی۔ مارچ ۱۹۷۵ء

۱۱۔ "جامعہ" دہلی۔ جولائی ۱۹۷۶ء

۱۲۔ "اقدام" لاہور۔ ستمبر ۱۹۵۴ء

۱۳۔ "آفاق" لاہور۔ ۱۲/ اپریل ۱۹۵۹ء

۱۴۔ "شاعر" بمبئی۔ جولائی ۱۹۷۱ء

۱۵۔ "صبح امید" بمبئی۔ ستمبر ۱۹۷۱ء

۱۶۔ "فروغِ اردو" لکھنؤ۔ جولائی۔ اگست ۱۹۷۲ء

۱۷۔ "شب خون" مئی ۱۹۷۱ء

۱۸۔ "شیرازہ" جلد ۲۰۔ اگست ستمبر ۱۹۸۱ء (اردو کانفرنس نمبر)

۱۹۔ "نگار" مارچ ۱۹۵۹ء

۲۰۔ "نگار" مارچ ۱۹۶۰ء

۲۱۔ "نگار" مئی، جون، جولائی ۱۹۵۰ء

۲۲۔ "نقوش" شخصیات نمبر، مرتّب محمد طفیل۔ اکتوبر ۱۹۵۶ء

۲۳۔ "نقوش" خاص نمبر خطوط، مرتّب محمد طفیل۔ مشاہیر کے خطوط بنام آزاد

۲۴۔ "شب خون" فروری، مارچ، اپریل ۱۹۸۷ء۔ جلد ۱۹، شمارہ ۴۵

۲۵۔ "تعمیر" ماہنامہ ہریانہ۔ ستمبر ۱۹۹۲ء، جلد ۱۹، شمارہ ۹

۲۶۔ " " فروری ۱۹۹۳ء۔ جلد ۲۰، شمارہ ۲

۲۷۔ "معارف" ۱۹۵۹ء

۲۸۔ ماہنامہ "آجکل" نئی دہلی۔ فروری ۱۹۹۲ء

۲۹۔ "داستان پاکستان" چودھری نذیر احمد خاں۔ ۱۹۷۶ء، لاہور

۳۰۔ "ہمایوں" ماہنامہ، جون ۱۹۴۰ء

۳۱۔ ماہنامہ "سہیل" گیا۔ شمارہ ۲، جلد ۵۰

۳۲۔ یادگار جوش ملسیانی۔ ماہنامہ "کتاب نما" مئی ۱۹۷۷ء۔ جلد ۱۸، شمارہ ۵

۳۳۔ "شب خون" جون ۱۹۸۰ء۔ جلد ۱۴، شمارہ ۱۱۴

۳۴۔ "تعمیر" ہریانہ۔ اگست ۱۹۸۳ء۔ جلد ۱۱، شمارہ ۸

۳۵۔ "سب رس" اپریل ۱۹۷۸ء

۳۶۔ "ہماری زبان" علی گڑھ۔ ۱۸ر مارچ ۱۹۶۵ء، ۱۸ر اگست ۱۹۷۳ء، ۸ر ستمبر ۱۹۶۴ء

۳۷۔ "شیرازہ" سری نگر۔ جنوری، فروری ۱۹۶۲ء

۳۸۔ "فروغِ اردو" لکھنؤ۔ جنوری ۱۹۷۰ء

۳۹۔ "ہماری زبان" ۸ر دسمبر ۱۹۷۴ء

۴۰۔ "عالمی اردو ادب" جلد ۶، ۱۹۹۱ء۔ مدیر، نند کشور وکرم

۴۱۔ مسلم لیگ اکسپریس پٹنہ۔ ۱۹ر دسمبر ۱۹۹۴ء

۴۲۔ "جسارت" کراچی۔ ۲۲ر مئی ۱۹۸۱ء۔ نامہ نگار احمد مدنی

۴۳۔ "ہماری زبان" دہلی۔ ۸؍جولائی ۱۹۷۷ء

۴۴۔ "شاہراہ" دہلی۔ اپریل ۱۹۵۹ء

۴۵۔ "گفتگو" ممبئی۔ جلد ۱، شمارہ ۱۔ ۱۹۶۷ء

۴۶۔ ماہنامہ "پاسبان" چنڈی گڑھ۔ دسمبر ۱۹۶۴ء

۴۷۔ نقش فرید (اقبال) دسمبر ۱۹۷۷ء۔ میسور ۱۰

۴۸۔ شام صحرا۔ ۱۹۸۳ء، مکتبہ کارواں کچہری روڈ، لاہور

۴۹۔ "قومی زبان" کراچی۔ مارچ ۱۹۸۹ء

۵۰۔ "جانِ غزل" مرتبہ شاہد علی خاں۔ جنوری ۱۹۶۳ء ادبی دنیا، اردو بازار دہلی

۵۱۔ ہفتہ وار "پیامِ مشرق" دہلی۔ ۲۱؍جنوری ۱۹۵۶ء

۵۲۔ روزنامہ "جنگ" راولپنڈی۔ ۲۲؍مئی ۱۹۸۰ء

۵۳۔ ماہنامہ "شاعر" آگرہ۔ نومبر ۱۹۵۰ء

۵۴۔ روزنامہ "مشرق" لاہور۔ ۲۰؍مئی ۱۹۸۰ء

۵۵۔ ہفتہ وار "سینک سماچار" (اردو) نئی دہلی۔ ۵؍مارچ ۱۹۸۹ء

۵۶۔ روزنامہ "سیاست جدید" کانپور۔ ۷؍مارچ ۱۹۶۳ء

۵۷۔ ماہنامہ "پاکیزہ آنچل" نئی دہلی۔ فروری ۱۹۹۱ء

۵۸۔ ہفتہ وار "ہماری زبان" نئی دہلی۔ ۱۵؍مارچ ۱۹۸۴ء

۵۹۔ روزنامہ "سیاست" حیدرآباد

۶۰۔ ہفتہ وار "پندار" پٹنہ۔ ۱۴؍اکتوبر ۱۹۷۸ء۔

60- The Kashmir Times Jammu,27, June, 1993.

61- Kashmir Times Jammu, 9,April, 1993.

62- Daily Excelsior Jammu,30, Dec , 1994

63- Kashmir Times Jammu,8, Nov , 1994

۶۵۔ مکتوبات بنام راقم الحروف ۱۹۹۲ء تا مارچ ۱۹۹۶ء